

ناصرزیدی

میری لائبریری

۱۹۶۸ء

کے

منتخب افسانے

میری لائبریری میں 4.00

مجلد سفید کاغذ 8.00

۱۹۶۸ء

کے

# منتخب افسانے

ناصر زیدی

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

جملہ حقوق بحق بشیر احمد چودھری محفوظ ہیں

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ : ۱۹۶۹ء

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر

مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع : پاکستان ٹائمز پریس لاہور

# ترتیب

۷	تاجریدی	سید حمی بات
۹	راجدر سنگھ پیدی	مشخص
۲۷	خواجہ احمد عباس	دو ہاتھ
۳۲	معصت چغتائی	نورالہ
۵۸	بلونت سنگھ	پورا جواں
۶۵	محمد خالد اختر	زندگی کی کہانی
۱۳۱	اعجاز حسین بٹالوی	دس پیسے کے بارہ
۱۵۰	مسعود مفتی	دو خون
۱۵۵	بالو تھ سید	سامان شہین
۱۸۷	محمد فضل الرحمن خان	کوری کوری گدی گدی
۲۰۹	عقراء بخاری	تیاری
۲۲۳	ذکاء الرحمن	ڈپٹی کمشنر
۲۶۸	شرون کمار دتا	ادھوری تصویر
۲۸۷	سلیم اختر	سبقت ۱۹۶۸ء
۲۹۸	رفعت مرزا	رحم اوستے نکلتا تھا میٹ
۳۰۷	اشرف خاوند	ٹھنڈی لڑکی

## عرض ناشر

ادب و ادب کی جو خدمت ملکیت میری لا بُریریؔ سرانجام دے رہا ہے۔  
اُس کے تذکرے کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ علم دوست ادب  
دو شاس حضرات برابر اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

میری لا بُریریؔ نے افسانوی ادب اور خاص ادب کے انتخابات کے جو  
سلسلے شروع کئے تھے وہ اچھے پوری طرح مکمل نہیں ہو سکے، تاہم ان کی قدیمیت  
اب پوری طرح میاں ہونے لگی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ملک کے اکثر دوسرے  
ناشرین اور مصنفین نے بھی اسی ڈگر پر کام کی نقل شروع کر دی ہے اور کسی بھی پیشوائی  
کرنے والے کے لئے یہ بات بڑی ہی حوصلہ افزا ہے۔

میری لا بُریریؔ کے کارپردازان آپ کے لئے وہ سب کچھ کرنے کے لئے کمر بستہ ہیں۔  
جو علم و ادب کی تشیع کو فروزاں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔  
ادارہ آپ کے تعاون کا دل سے شکریہ گزار رہا ہے۔

آپ کا

بشیر احمد چودھری

۲۶ مارچ ۱۹۹۹ء

لاہور

# سیدھی بات

سال بھر کے چٹے ہوئے انسانوں کو کتا بنی شکل دینے کا بوجھ کچے البانیا نہیں پھر بھی ایسے کسی بھی غروے کے مرتب کو اکثر اس سال سے دو چار ہند پڑتا ہے کہ آخر اس انتخاب کی ضرورت کیا تھی؟ ابداً اگر اسے غصے کی بات کہا جائے تو مرتب اور ناشر دونوں ایسی ہی بددیانتی کے مجرم قرار دیئے جائیں گے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

زندگی ہمیشہ سے درخشاں اور اسکی قسم کدہ سری کیفیتوں سے جلدت رہی ہے اور وہی گہنا پنچ حیاتِ انسانی کا واضح مطلبِ نظر سکون کی تلاش ہے اداگریہ کہا جائے کہ فزویہ لطیفہ کی طرف تو توجہ کا باعث بھی یہی سرگردانی ہے تو بے جا نہ ہو گا کہ انی یا مختصر افسانہ کو اس لحاظ سے فزویہ لطیفہ میں ایک خاصہ حیثیت حاصل ہے کہ اسکی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسان کی۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ کہ ان کا آغاز ناموس و تہرا جب انسان نے اپنے ذاتی تجربات اور واردات کو پہلے پہل منکوں کا ادب دیا، پھر یہ ذاتی تجربات اور واردات آہستہ آہستہ ذات کے خول سے نکل کر کامنات کو اپنی پسٹ میں لینے لگے اور اس طرح کہ ان میں صرف ایک فرد کا نہیں بلکہ سب انسانی معاشرے کی ترجمانی ہو گئی۔ اگر بہ نظر غور کیا جائے تو دراصل ہم سب لوگ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں ایک کہانی کہتے یا لکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کہانی کار کے اہل واقعات اور واردات کا بہرہ دہانے والا ایک تکنیکی چاشنی اور فنی رچاؤ رکھتا ہے جہاں کی کارائی اسکی ذاتی واردات ایک پارے ماحول اور ایک پورے معاشرے کی واردات بن جاتی ہے

کہانی چھپے ہوئے معجزوں پر نگہیں نہیں پاتی بلکہ سبھی کوئی تھکری کوئی کہانی پر مستند ہے  
 تو اس کہانی کے رنگ و پے میں زندگی کا ایک نیا خون رواں رواں ہو جاتا ہے اس طرح کہانی  
 ہر سہ مکمل ہوتی رہتا ہے اور مکمل کا یہ عمل کئی زبانوں پر عیاں ہو جاتا ہے لہذا ۱۹۶۸ء کے  
 افسانوں کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنے  
 زمانے کے ذہنی میلانات و حجابات کی مختصر تاریخ مرتب کر دی گئی ہے تو عیاں نہ ہوگا۔  
 میں نے پاک دہن کے ان پندہ افسانوں کے انتخاب کے سلسلے میں کسی تعصب کے  
 بغیر ادبی و دنیاداری سے گزشتہ برس کے تقریباً تمام ممکنہ حصولی ادبی و فنی ادبی  
 رسائل کی چھاپی پبلک کی ہے چنانچہ جہاں آپ ان میں کئی ایسے افسانہ نگاروں سے  
 ملیں گے جو ادب میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں وہاں چند ایک ایسے کہانی کاروں سے  
 سے بھی متعارف ہوں گے جو ابھی مقام کی تلاش میں ہیں یہ یہ کج گشت کی ہے کہ  
 اس غبوسے میں کوئی ایسا افسانہ شامل نہ ہو جو آپ کے ذوقِ سلیم پر گراں گزرے یا ادبی  
 معیار سے گرا ہوا ہو۔ پھر بھی کیونکر یہ میرا انتخاب ہے اس لئے اختلاف کی بہ حوالہ گنجائش ہے۔  
 آخر میں مجھے اپنی اور مکتبہ میری لائبریری کی طرف سے اسی فنکاروں کا شکریہ  
 ادا کرنا ہے۔ جن کے فن پاروں کی بدولت یہ غبوسہ مرتب ہو سکا۔ اس کے علاوہ میں  
 اپنے معاصر میخانہ جرائد کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جن کے معیاری  
 ادبی و فنی ادبی رسائل میں سے ان افسانوں کا انتخاب عمل میں آسکا۔

مدیر اہتمام "ادبِ لطیف"

دنا سر زید علی

مشاور۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

## مستحق

بازار ہی لمبا ہو گیا تھا اور یہاں پھر کاروبار چھوٹا۔ معلوم ہوتا تھا پچھم کی طرف جہاں ملک  
تھوڑا اچھٹا، آسمان سے پشتی اور آخر ایک دم نیچے گر جاتی ہے، وہیں دنیا کا کنارہ ہے  
جہاں سے ایک جست کر لیں گے، اس جینے کے ہاتھوں مر لیں گے۔

دن بھر سو جینے کے بعد گن گھٹکے سکبڈ یسے کو دہری چیزیں ہاتھ لگی تھیں۔ ایک  
فلور ٹین اور دوسری جینیں رائے فلور ٹین کو تو شاید کوئی سرکھر فلور پڈر سر کر لائے پائے بھی  
جاتا، مگر جینیں رائے؟ کوئی بات نہیں۔ آج دھڑ سے چسپا کر رکھے گا تو کل اس کے پوتے  
پڑ پڑتے اس سے کہ ڈول مکائیں گے، جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے بیوناٹو کے  
ایک سو نکل آئیں تو اسٹ کے بلدا میں ان کی بولی لاکھوں تک جاتی ہے۔ ان لاکھوں  
کہ ڈول کے خیال ہی سے گن لال کی آنکھوں میں جھلیاں کو ندے نے لگیں اور وہ یہ بھول ہی گیا  
کہ وہ چالیس یا پچاس سال کا اور ٹھکڑا۔ گنجا ہونے کے باوجود کنارہ ہے، اس لیے  
پوتوں پڑ پڑوں کی بات نہ ہی نہیں۔ گن گن تا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا، اتنے بڑے  
نفسے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندک کا تیاں نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں مایاوت  
آؤ کہہ کر اُسے پرے دھکیل دیتا ہے لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگانا ہے۔ دنیا



بھری پیسے کی گر کوئی پڑجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی کے روز پرات کے نیچے جیوتی کے ساتھ دودھ پانی میں نہلیا، سینہ دھو میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دھڑے کے دل اس کی گاڑھی پھد برگد کے ہار ہوں گے اور سب ترناری مل کر کلکشی کے مندر کو جائیں گے۔ پوجا کے لیے پیسے کے لیے تو وہ یوسف سا بار بار پرہی ایسی تہنی کو بھی بیچنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اور ساتھ ساتھ سراہا۔ ایڈیٹر میٹری کا پچنٹ۔ اس کی دکان تھوڑا پیسے کے گیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، بالکل ہندو جس پر صبح کے وقت آکر پانی میں دھو دھ کے لٹے ڈال جاتے تھے اور دکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کچھ سے اٹ جاتی تھی۔ تقسیم کلب ہندوستان میں وہ جاتے والے سراج کو بالکل ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ نہیں کرتے تھے تو وہ غلے کتے جو دی بھر ٹانگ اٹھا اٹھا کر اس پیڑ پر پشید کرتے رہتے تھے جس کے بارے میں جھگڑاں نے کہا تھا۔ اس کے شول میں میں پیسے ہوں ضرور وہ پھیلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو سینا لیس کے خداؤں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ سراہا ہمیشہ پیسے کی گولیں کھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ بازار کا منہ ہونا بھوک نہ تھی۔ سراہا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جس کی وصافر پشٹ کو محفوظ کر دے۔ ہاں، صدائے لنگ کشوں کا یہی ہے نا کھانا، پینا اور بھوک کرنا وہ دماغی طور پر کوئی ہرگز کوئی مذہب دوش ہیں، جو ہندوستان میں یہی تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پکتائی میں ہوں گے تو۔ میرے سوا بلا لودینے مجھے۔ انہیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں، لگوں ٹکے نے کئی بار اس بارے میں سراہا بھی۔ ان کا اندر خوب عیش کرتا ہے۔ ایک اپنا جھگڑا ہے۔ جو نیچے کی بجائے اوپر کی کھلی کے آس پاس ہی منزل ہوتا رہتا ہے شاید سراہا جانے لہجے

بنائیک تانترک تھا جو ہندو برکشا کے لیے گندھنی کو جگالتے اوراد پر کام کرتے بناتے تھے، وہ عورت کے اندر گڑھے پڑے رہتے، لیکن کسی طرح اپنے جوہر حیات کو نہ جانے دیتے۔ نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی یہ سوچا کہ اس بیچارہ کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ اسے بھوکا، پیاسا، روتا، تڑپا رکھ کر کیسے مرگتے گھسیٹ سکتا ہے کوئی؟ کس پرانتا کو پاسکتا ہے؟ پھر جو نجات بندہ سے چھٹکارہ پالینے میں ہے۔ پُرش کے لیے استری کے لیے؟ سوائی بوند تو مرنے نہیں، نہ سیسہ موتی ہے، مرنے تو بوند کے گرنے اور سیسہ کے اُسے اپنے اندر لے کر مرنے کے لیے میں ہے۔

رات لپک آئی تھی۔ باہر وہ دنیا کا کدوہ اندھیرے کے ساتھ کچھا رہ بھی پاس بیٹگ آیا تھا، شیم دالے دلائی رام، کشمیری بڈ شاہ، آسنی کے اٹل کے پکر پانی کی دکان بھی بند ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے بیٹے کا وہ سراسر منہ برونے کی وجہ سے اس کے سب اہل دوسے ماں بوند اکسیری بک گئے ہوں، عورت سراج کی دکان کھلی تھی۔ نہ جانے وہ کس بل پر تھا؟ شاید اس لیے کہ بیڑی کا مزدورت ماتری کو پڑتی ہے، مگر وہ صبح، صبح کا فربہ ہی کو دکان کھول لیتا تھا، جو رات ہی کا حصہ ہوتی ہے، اس کا آخری حصہ۔ وہ نہ صبح کہاں کسی کی رہی، وہ تو گھیر فٹنوں کی ہول۔ شاید سراج ٹورسٹ، ایجنٹ مائیکل کی انتظار میں تھا تاکہ وہ دونوں مل کر لنگھد وڑکیں، آگے کھجور یا بکاپروگرام بنائیں، تھوڑے پیسے کالیں۔ نہیں، سراج پیسے کے پیچھے تھوڑے جاتا تھا، وہ تو جاتا تھا، کچھ عورتوں کے پیچھے جو کشیر لاندرواجی کی وجہ سے بھجور کی پیاسی آتی تھیں اور یہاں اگر مستان کی محبت کو ادھر کے کسی بھی خواہجہاں طبیعت والے مرد پوچھنا تھیں اور کھجور بھر کے مہلتن کو زندہ

کرتی تھیں۔

جبھی سراج کی آواز نے گمن لال کو جھٹکا دیا۔

”ہیلو، سوٹی پائی ..“

سراج تقریباً اُن پڑھ تھا، مگر ڈرسٹوں کے ساتھ دہننے سے اتنی انگریزی سیکھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے گمن سمجھ گیا۔ کیرتی آئی ہے۔

وہ پچ پچ کیرتی ہی تھی، جو چھوٹے تھے، گتھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی ایک اور اس لڑکی تھی۔ اس کا رنگ پتلا تھا۔ پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھرتی پہن رکھی تھی۔ جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑا ہتھکڑی ہو کر سامنے آئی۔ وہ ہمیشہ استری کرتی تھی جیسے اسے اپنا آپ چھپانا ہے اور شاید اسی لیے سراج کی دوکان کھل تھی وہ ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھتا، اس سے بات کیے بغیر نکل آتی تھی۔ اس کے باوجود سراج میٹیاں بجا رہا تھا۔

مگر کیرتی بات ہی کہاں کرتی تھی اس سے، اُس سے کسی سے بھی نہیں۔ اس سے بات کرنے کے لیے سوال کچھ یوں وضع کرتے پڑتے تھے کہ ان کا جواب ملن ہو یا نہ۔ صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سر ملانے سے بات میں سکے سراج کا سچھڑنا گمن کو بہت ناپسند تھا۔ اس نے گمن بارگمن سے کہا بھی تھا۔ تو گمن عشتی کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا، جہاں لڑکی ہے۔ کھینچ ٹال۔ بہت اُدھر اُدھر ہلکے کیرتی کی طرح سے تو وہ اُڑ ماٹے گی۔ لیکن گمن نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

وہ حقیقت گمن کے کاہنہ سہ سہیاب ہوتا تھا۔ کیرتی کوئی ٹکڑی کا کام یا شلپ بن کر بچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی تو وہ اس میں بہت کیرٹے نکالتا۔ کبھی کہتا

ایسی چیزوں کی آج مانگہری نہیں اندکھیں یہ کہ وہ فن کے معیار و محکم پر پوری نہیں مارتیں۔  
 کیرتی اور بھی مزہ لکھائیتی حالانکہ سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہونا کہ وہ ترو  
 کی چیز پانچ دس میں دے جائے اور پھر یہ اسے سیزن کر کے سینکڑوں میں بیچے۔

کیرتی نے یہ کام کسی آرٹ سکول میں نہ سیکھا تھا اس کا باپ نانائیں ایک سخی تھا  
 جو بھادڑا جی اور جیمز رگس وغیرہ کے ساتھ فیمل اور جانے کساں کسانہ مندوستان کی حالت  
 کو ڈھونڈتا پھرتا تھا جو کہ وہ اصل اندی کے سینہ نیم نیریاک اور شاگلو کی افین کی دوکانوں  
 میں مل رہی تھی۔ ہر سال ہمارے مندوستان اور منم مندوں سے سینکڑوں سورتیاں غائب  
 ہوتیں اور ہزاروں میں دھند کوریو وغیرہ کی دوکانوں میں جگہ پاتیں۔ نانائیں مسلسل سفر سے  
 تنگ اگر لوٹ آیا تھا۔ اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیتے تھے جنہیں کیرتی بڑے  
 انہماک سے دیکھتی رہتی تھی اور پانچ میں انداز کر ڈالتے اور دف تک کرنے میں باپ کی  
 مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر بیٹھ جانے میں نانائیں اس بات کو بھول ہی گیا کہ گھوڑا ہوا درخت  
 پائے ہوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے دو گئے چمگئے ہی نہیں سرگنا  
 مامٹتے ہیں۔ شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی

ماہیت کو سمجھ جاتے ہیں اور زندگی کو پھلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بنانا اور مشکل  
 سے روٹی کمانا تھا۔ ایک دن دو دیوں کے دیہاں اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ  
 جگہ بکا بت بنا رہا تھا جبکہ اس کا اپنا ہی چمڑا اس کے ہاتھ میں لٹک گیا جس سے اسے  
 ٹیٹا نس ہو گیا اور قریب کے چھانو کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتے کی موت مرا۔

کیوں نہ اسی موت مرا ہے۔ جب وہ دیوی کاٹت بنانا تھا تو دونوں مینوں اس کی  
 چھاتیوں، اس کے کولہوں اور انوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیوں خلا

میں گھومتے ہوئے لڑ معلوم ہوتی تھیں، لیکن بڑوں میں ٹانگیں ادا سار سوا یک طرح کی گھڑونچی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے ٹکے تھے جو اس پر رکھے جوتے تھے اور کو لیسے ہفتی کے ماتھے کی طرح سے جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سوئٹھی نکلتی تھیں۔ اس نے دد کا کاشلپ بھی بنایا تھا جو بڑی جبر جنگ دیوی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے ناراضی کتنے کی نہیں تو کیا ہماری آپ کی صفت تروا؟ ”کیا لائی ہو؟“ گنگا ٹکے نے کیرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنے دھرتی کے پتہ سے کلڑی کا کام نکالا اور دھیرے دھیرے اسے گنگا کے سامنے دول ٹاپ کی نیز پر رکھ دیا۔ کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے گنگا نے ایک بیرون کر سی کیرتی کے سامنے سرکادی۔ مگر وہ بدستور کلڑی رہی۔

”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں ٹکے نیچے گرتی تھی اور جب چہرہ گنگا کی طرف کیا تو اس کا ٹھٹھکیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھانڈنی کے اسپتال میں پڑی تھی، جہاں اس کے باپ ناراضی نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو قعد کا سر طاق تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کر کے ایک تلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بوتل باندھ دی تھی تاکہ بول و بار نہ نیچے جانے کی بجائے سارے بوتل میں چلے جائیں۔ پہلی بوتل کسی دجر سے خراب چھ گئی تھی اور اب دوسری کے لیے پیسے چاہئیں تھے۔ اگر وہ گنگا کو بتا دیتی تو وہ شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس ڈنڈک کو دیکھ کر وہ ویسے ہی بھربھک گیا تھا۔

”پھر دہی“ اس نے کہا ”میں نے تم سے کئے بار کہا ہے۔ آج کل ان چیزوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ لیٹے ہوئے دھنواں اور پر خیش تنگ۔ لکشمی پاؤں داب رہی ہے۔“ کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے گم کی طرف دیکھا، جس میں سوال تھا۔ اور کیا جانتاں؟

”ہری۔ جو آج کل ہوتا ہے۔“

”آج کل۔“ کیا ہوتا ہے؟ کیرتی نے آخرتہ کھولا، شکل سے اس کا آواز سنائی دی، جیسے کینری (CANARY) کی چونچ ملتی دکھائی دیتی ہے، مگر آواز سنائی نہیں دیتی۔

گم نے کچھ رکے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا ”اند کچھ نہیں ہوتا تو گاندھی جی بناؤ، نر و بناؤ۔ اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے بولا ”کوئی نیوٹو۔“

”نیوٹو؟“

”ہاں۔ آج کل لوگ نیوٹو پسند کرتے ہیں۔“

کیرتی چپ ہو گئی۔ کنسادی ہونے کے ناطے وہ ستر ماسکتی تھی، لجا سکتی تھی مگر یہ سب باتیں اس کی لڑکی کے لیے تعیش تھیں، اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ گم اس کے ڈورک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں؟ کچھ سوچتے، رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”مجھے نہیں آتا۔“

”کیا بات کرتی ہو؟ تمہارے باپ نے بیسیوں بنائے۔“

”وہ تو۔ دیوی ماں کے تھے۔“

”فرق کیا ہے؟“ گئی ٹھکے نے کہا ”دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ مگر جگہوں کے لیے کوئی دیر بالا اس کے ساتھ سختی مت کرو۔ انہی حرکتوں سے ہی تو تمہارے پتا ایسی موت مڑا۔ سرگیش ہوئے۔“

کیرتی نے اپنے جیروں کے پھپھاڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، جسے وہ نہیں جانتی تھی، کوئی دوسرا نہیں۔ پھر بھی وہ بیوقوف کرسی پر بیٹھی نہیں، اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین مگر مباح خط دکھائی دے رہے تھے۔ کیا شہب تھا، جسے اوپر کے نہیں، نیچے کے نکلاؤں نے بنایا تھا، گئی لال کے دماغ میں اختیار اور بے اختیار آپس میں خبر دنا ہوتا ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ بارہائی لڑکی کے اندر بھی وہی چادر اور لاپاری آپس میں سرسرا رہے ہیں۔ اس کاٹنہ سوکھ گیا تھا۔ گئی گھرنٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ لیٹی۔

”میں۔ میرے پاس موڈل نہیں۔“

”موڈل؟“ گئی نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا ”سینکڑوں ملے ہیں تاج

نرگسی بھی جو ان، خوبصورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایک دم۔“  
کیرتی نے کچھ کہا نہیں۔ مگر گئی نے صاف سن لیا۔ ”پیسے؟“ اور خود ہی کہنے لگا  
”اومی پیسہ خرچ کرے، تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا۔“

اس بات نے کیرتی کو اد بھی اعاس کر دیا۔ اس کی دوج زندگی کے اس جبر کے نیچے پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے، جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے۔ چنانچہ گئی نے اپنا ہاتھ بٹھایا تاکہ اسے

باندوں میں لے لے اور چھاتی سے لگا کر کہے۔ "میری جان اقم ٹکڑ کر۔" میں جڑ ہوں۔ "لیکن کیرتی نے اس سے جھٹک دیا۔ گئی کٹ گیا۔ اس نے یوں نکال ہر کیا جیسے کچھ ہو رہی نہیں۔ تپاس کے ہاتھ میں تھا۔ رول ٹاپ پر سے اس نے ڈوڈرک کو اٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب تک کیرتی نے سچی کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے پہلے نیچے دیکھا اور پھر ایک ایکی سراؤ پر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "اگل بار میٹرو ہی لاؤں گی۔ ابھی تم اسے ہی لے لو۔"

"شرط؟" گئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر ہل دیا۔ گئی ٹھکے کا خیال تھا کیرتی ساتھ ہنس پڑے گی مگر وہ کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے عدل ٹاپ کو اٹھایا اور میز کے اندر سے دس روپے کا چٹا سارا نوٹ نکالا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا۔ "لو۔"

"دس روپے؟" کیرتی نے کہا۔

"ہاں تمہیں بتایا نا، میرے لیے یہ سب بیکار ہے۔ میں اور نہیں دے سکتا۔"

"اے اے تو۔" اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی، الفاظ

سب ٹھک گئے تھے۔ پر مطلب صاف تھا۔ گئی سمجھ گیا۔ "اس سے تو بڑی ہی نہ آئے گی۔" "وہاں کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا۔" عدل بھی نہ چلے گی۔ "قسم کے ختم ہوں گے، سب مجھ اور اندام دار ہی کی قسم کیا کرتے ہیں اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے بس وہ، لا دو تو میں اچھے پیسے دے دوں گا۔"

اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی مدد انگلیوں کا چھٹا بتایا، تھوڑی آنکھ بدی جیسی ٹوٹ ماسند سے نایک کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔



کیرتی باہر لگی تو اس کے ہونٹ پیچھے ہوئے تھے، وہ تھوڑا ہلپ رہی تھی۔ لوٹنے پر کیرتی ہمیشہ اسی طرف سے جاتی تھی، حالانکہ اس میں اسے میل ڈیڑھ میل کا چکر پڑتا تھا۔ وہ نہ چلتی تھی سراج سے اس کی ٹکڑی ہو لیکن آج وہ اسی طرف سے گئی جیسے اس میں کوئی حافضت، بھرائی تھی۔ مائیکل چلا آیا تھا اور سراج کے ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا، جبکہ کیرتی منہ اوپر اٹھائے، ناک پھلاٹے ہوئے پاس سے گز گئی۔ سراج نے کچھ کہہ کر گھن کو سٹائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی کا جذبہ تھا اور یہاں پھر وہ اسی مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھی جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سچتے ہیں۔ مبادا انہی سے کوئی کام اڑے۔ شاید یہ عصمت کی فطرت کا خاتمہ تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہے۔ جس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اسے دیکھ کر ایک بار اس نے سیٹی بھجائی یا اپنی چھاتی پر ہاتھ لکھ کر سرد آہ بھری تھی۔

سراج حاضر در کوئی 'ایفروڈیزیاک' کھا رہا تھا۔ ہر سگت ہے پائے ہوں جو مائیکل اس کے لیے لایا تھا۔ شاید وہ مدوں مل کر گیس ٹکے کے پاس آتے اور اسے کچھ رائیگات بتاتے، لیکن گھن نے وہاں ہی بڑھ جاتی تھی۔ وہاں وہاں کو اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے کیرتی کے نوڈل کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ خیش ناگ کا پھیلا جھڑ توڑ بہت تھا لیکن اوپر اس کی چنگیری کھالی میں اس نے صرف گردنوں سے رنگ بھر دیئے تھے۔ کشن میں ہی تھا جو کوئی بھی عقیدت مند عصمت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ کشنی ڈھیر سی پڑی تھی اور اس کے بدن کے خط واضح نہ تھے۔ شاید کیرتی کشنی کو اس کے کسی بھی سنی میں نہ جانتی تھی۔ حالانکہ اسے روچک بنا نا کتنا آسان تھا جب عصمت پاؤں بدلنے کے لیے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ باند بدن سے

اگک ہوتے ہیں اور مخصوص عودت صاف امد سامنے دکھائی دیتی ہے پھر پہلو پر بیٹھی ہوئی اوپر کی عودت نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے امد مرد کی نظر میں کو کی کیا اور نیچ نیچ سمجھاتی ہے۔ مگر یکساں کیرتی خود عودت تھی اس لیے اسے عودت کی برائیت مرد میں زیادہ دلچسپی تھی تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ عودت اپنے حسن کے سلسلے میں توالی امد ختمک خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کا یہ خود پرستہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو کسی بھی مرد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

گھنٹہ کی کیرتی کے مڈمک کو ایک ہاتھ میں لیا امد دوسرے میں چاقو سے کر اس پر سدھم نہ اس کے الفاظ کندہ کر دیے امد پھر کچھ کمرے میں پہنچ گیا جہاں کچھ زمین تھی جسے گھوڑا اس نے وٹھک کر نیچے رکھا ایک امد مرد نے گز کا لاجو کیرتی ہی کی جانی ہوئی تھی امد پھر گٹھے پر مٹی ٹال کر اس پر کھتے کا پانی چھڑک دیا۔ پراعت کی مٹی جھاڑ کر اسے دیکھا تو بڑی بڑی سٹائیں اس میں چل پڑی تھیں امد وہ صدیق پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن وہ جب اسے لے کر ٹھنڈوں کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گھنٹہ نے انہیں بتایا کہ اس کا ذکر کالی داس کے رگھو نیش میں آتا ہے۔ رگھو جی نے کو گھنٹہ کے علاقے میں ہر کٹ نام کا ایک شہر دیا تھا، جہاں سے یہ بت برآمد ہوئے کچھ میسر کے چھارا جو وٹھار کے پاس ہیں اور کچھ اپنے پاس۔ چنانچہ اس بت کو گھنٹہ نے سٹائے پانسو روپے میں بیچ دیا۔ جس کے لیے اُس نے کیرتی کو پانچ روپے دیئے تھے۔

اس علاقے کے ایک ہفتے کے اندر کیرتی نوٹ لے آئی۔ وہ بدستور بدھواس

تھی، اس کی ماں تو بیمار تھی ہی، وہ بھی بیمار ہو گئی تھی، اسے قریب قریب منسوب ہو رہا تھا۔ وہ کھانسی رہی تھی اور بدلتا بارش کا کچڑا بھی تھی، جس پر اس نے دھل کا لوگوں ایک پیسے پرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کی طرح سے غلاب کو گھنٹے کے ساتھ دیکھا۔ اب کے اس نے اسے کٹڑی میں نہیں، پتھر میں بنایا تھا۔ اب وہ پھر امیدویم کے ساتھ گھنٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گھنٹے اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹا ہوتا۔ اس نے یہاں سے نہ موند سے پسند کیا بلکہ جی بھر کر داد دی۔ عمر آج کیا تو صرف اتنا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ لاش وہ اسے قد آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود گھنٹے کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔ اس نے غلاب کچی کو ہاتھ میں لیا اور خود سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی سچ کا نیوٹ نہ بنا سکی تھی۔ بت کے بدن پہ کپڑا تھا جو گیلہ تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کہیں علیحدہ۔ بظاہر چھپانے کے عمل میں وہ عمدت کے جسم کو امداد بھی عیاں کر رہا تھا۔

غلاب پر سے نظریں ہٹا کر گھنٹے نے کیرتی کی طرف دیکھا۔ ادب بے امتیاز اس کے منہ سے نکلا۔ ”واہ“! کیرتی جھینپ گئی اور اپنی بائیں مادی کو پیچھے سے ڈھانپنے لگی لیکن گھنٹے سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہو کر خود کو دکھا رہی ہے۔ دیکھتی اور اسے بناتی رہی جنکے بار اس نے کپڑا جھگوڑا اپنے بدن پہ رکھا ہر گاہ، جس سے اسے سردی ہو گئی اور اب وہ کھانسی رہی ہے۔ یہ صرف پیسے ہی کی بات نہیں۔ عمدت میں فائش اور خود سپردگی کا جذبہ بھی تو ہے۔ گھنٹے سب سمجھ گئی

تھا مگر تجویز کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”ماں کیسی ہے؟“

کیرتی جیسے ایک دم با فروغ ہو گئی، اسے کھانسی کا فٹ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگی۔ ”نکس گھر گیا تھا اور شرمندہ ہی تھا۔ اس کے بعد سڑک تے ہوئے جو اس نے سوال کیا، وہ بہت غیر ضروری تھا۔“ تو موٹل مل گیا تھیں؟“

کیرتی نے پہلے تو نظریں گرا دیں بعد پھر دکھ سے باہر اس طرف دیکھنے لگی جہاں سڑک آسمان کو جھونک رہی تھی ایک ایک نیچے گرتی تھی۔ گھن نے چاہا کہ اسے اس کمزوری کے عالم میں کپڑے اور وہ مادہ دے جس کی وہ مستحق تھی اور جو شاید وہ چاہتی بھی تھی گھن نے سوچا، ایسے میں عام بڑے جائیں گے۔ اس نے اپنے دل میں باب کے کیرتی کو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ بوس اور بات کی چیزیں شاید تنہا کی نہ ہوں مگر وہ تھری دے گا انہی اندر دے بھی رہا تھا کہ کہیں کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کر دے۔

”کیا عام فصد اس کے؟“ اس نے یونہی سرسری طریقے سے پوچھا۔

کیرتی نے اچھٹی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی ”اب کے میں پچاس روپے لوں گی۔“

”پچاس؟“

”ہاں۔ پائی گم نہیں۔“

گھن نے تسکین کے جذبے سے مدد طلب اٹھایا اور چالیس روپے نکال کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے اور بولا۔ ”جو تم کو۔“ مگر ابھی چالیس ہی میں میرے پاس۔ میں پھر لے جانا۔“

کیرتی نے روپے ہاتھ میں لے لیے اور کہا۔ ”اچھا۔“

وہ جانتے ہی والی تھی کہ گھن نے اسے روک لیا۔ ”سندھ“  
 کیرتی گیت کچھ بچ ختم کر اس کی طرف مجھے تمام لوگ کے اعزاز میں دیکھنے لگی۔ اس  
 کچھ بچے پہ اُس میدان چھٹ جانے کی بجائے کچھ اور کھڑی گئی تھیں جبکہ گھن ٹکھے نے  
 پوچھا ”اتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائے گا؟“

کیرتی نے سر اڑا دیا اور پھر ہاتھ پھیلائے جس کا مطلب تھا۔ ”امکیا کرنا؟“  
 پھر اس نے بتایا ”ماں کا آپریشن آ رہا ہے“ جس کے لیے سینکڑوں روپے چاہئیں۔  
 ”میں تو کہتی ہوں“ اس نے کہا ”اندھ پھر کچھ رک کر بولی“ ”ماں جتنی جلدی کر جائے  
 اتنا ہی اچھا ہے“ ”اندھ پھر نہ کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین پر کر رہی تھی“ آخر  
 وہ خود ہی بول اٹھی۔ ”ایسے ایڑیاں دگر کرنے سے موت آجھی“

جب گھن نے اس سے آگے نہ بڑھائی تو کیرتی اٹھا۔ انیس برس کی لڑکی کی بجائے  
 پینتیس چالیس برس کی بھرپور محنت نظر آنے لگی جو زندگی کا ہر دار اپنے اوپر لیتی اور  
 اسے بیکار کر کے پھینک دیتی ہے۔

”ایک بات کہوں“ گھن ٹکھے نے پاس آتے ہوئے کہا ”تم ہنسنے بناؤ آپریشن  
 کا سب غریبوں میں دے دیں گا“

”نہ ہنسنے؟“ کیرتی نے کہا اور لہذا اٹھی۔

”ہاں“ گھن بولا ”اس کی بہت مانگ ہے۔ ٹروٹس اس کے لیے دیوانہ  
 ہوتے ہیں“

”بیکسی“

”میں سمجھتا ہوں“ گھن نے سر جھٹے ہوئے کہا ”تم نہیں جانتیں تو ایک بار

کچھ دبا ہو چلی جاؤ، اور دیکھ لو۔ میں اس کے لیے تمہیں پیٹگی دینے کو تیار ہوں۔“  
 ”تم؟“ کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بول  
 ”تم تو کہہ رہے تھے تمہارے پاس اور پیسے نہیں؟“  
 گنگی نے فوراً جھوٹا زراش لیا۔

”میرے پاس سچی پیسے نہیں“ وہ بولا ”میں نے دوکان کا کارہ دینے کے  
 لیے کچھ الگ رکھے تھے۔“

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر کیرتی نے اپنے زعم میں نہ لیے  
 اور وہاں سے چلی گئی۔ گنگی ٹھکے نے ٹوٹ کر ”کیشی“ کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی سی  
 ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑی۔ پھر ایک بازو توڑا پھر ٹانگ توڑی اور اس کے  
 سر کے سنگار پر ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں جس سے کچھ کرچیں گریں پھر اسے جا کر اس نے  
 اسے رتھی میں باندھا اور ٹنگ کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے  
 اٹھے۔ گنگی نے رتھی کو کھینچا اور کیشی کو نکال کر پانی میں ڈال دیا۔ اب جو اسے نکالا تو ”کیشی“  
 کے قد و خال دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں بچ میں سودا خ چٹا رخ سے پڑ گئے  
 تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپے میں بکنے کے لیے تیار تھی۔

اب کے کیرتی جو شلپ لائی وہ محسن ہی تھا۔ امدتِ عام۔ وہ ایک بوری میں  
 بندھا ہوا تھا اور ٹھیلے پر آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اٹھا کر اسے گنگی ٹھکے کی دکان  
 پر رکھا۔ پھر اپنی مزدوری لے کر وہ لوگ چلے گئے۔  
 کیرتی اور خود کو تنہا پا کر تیز سانسوں کے بیچ گنگی ٹھکے نے بوری کی دیوال کاٹیں،

اور کچھ دارنگلی سے ٹاٹ کو شلپ پر سے ہٹایا۔ اب شلپ سامنے تھا۔ پرفیکٹ۔۔  
 گمن نے اسے دیکھا تو اس کے گلے میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس  
 کے سامنے اس شلپ کو نہ دیکھے گی مگر وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے کسی  
 بھی یہ جان سے عاری۔ شلپ میں کی محنت تکمیل کو پہنچ رہی تھی جبکہ مرد خود رنگی  
 کے عالم میں اسے دونوں کانوں سے پکڑے ہوئے تھا جسے گمن ٹیکے نے توبہ  
 سے نہ دیکھا۔ وہ شاید اسے فرصت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

”کتنے پیسے چاہئیں، آپریشی کے لیے؟“ اس نے پوچھا۔

”آپریشی کے لیے نہیں۔ اپنے لیے۔“

”اپنے لیے؟ ماں۔۔۔“

”مر گئی۔ کوئی ہفتہ ہوا۔“

گمن نے اپنے چہرے پر دکھ اور افسوس کے جانبے لانے کی کوشش کی،  
 مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بھینچے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی  
 اُٹاس تھی جبکہ اس نے کہا۔ ”میں اس کا ہزار روپیہ لوں گی۔“

گمن بھونچا سا رہ گیا۔ اس کی زبان میں گنگنت تھی، جب اس نے کہا۔ ”اس  
 کے ہزار روپے بھی کوئی دے سکتا ہے؟“

”ہاں“ کیرتی نے جواب دیا۔ ”میں بات کہہ کے آئی ہوں۔۔۔ شاید مجھے  
 زیادہ بھی مل جائیں، لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔“

”میں تو۔۔۔ میں تو پانسو دے سکتا ہوں۔“

”نہیں“ امد کیرتی نے مزدوروں کے لیے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

گن گنکے نے اسے روکا۔ ”سو دوسرا دے لو“

”ہزار سے کم نہیں۔“

گن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیور ہی دوسرے تھے۔ کیا وہ کبھرا ہو گئی تھی؟ ٹورسٹوں سے ملتی تھی؟ کسی بھی قیمت پر کلاکار کا اس کی مارکیٹ سے جدا رکھنا چاہیے۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور آٹھ سو کے نوٹ گن کی کیرتی کے سامنے رکھ دیئے۔ کیرتی نے جلد ہی سے گنے اور اس کے منہ پہ پھینک دیئے۔

میں نے کہا، ”میں ہزار سے کم نہ لوں گی“

”اچھا۔۔۔ سو لے لو“

”نہیں“

\* ساڑھے دس سو۔ نو سو پچھتر۔۔۔“ اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر

اس نے سو سو کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور لٹے کی حالت میں مہش کی طرف ایک گیا۔ کیرتی کھڑی تھی۔ جیسے وہ اپنے فحش کی ماد لینے کے لیے ٹھٹھک گئی تھی۔ گن نے مہش کی حرکت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ کیا وہ لذت کی گلاں باری تھی یا کسی جبر کا احساس؟ کیا وہ دکھ اور سکھ، دوا و دواحت کا مشتہ تھا جو کہ پوری کائنات ہے؟ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بے حد کثیف۔ کیوں کیرتی نے کیوں مرد۔ انسان کی ”حمادیت“ پر غور دیا تھا؟۔۔۔ یہ مہش ہے۔۔۔ مگر وہ مہش تو نہیں، جو پریش اور پر کرتی میں ہوتا ہے۔۔۔؟



ٹھیک ہے۔ اٹھا زیادہ پیسے ملیں گے۔۔۔  
 گمنی ٹھکے نے آدپر کی بجی کو کچنخ کر پھر مرو کی طرف دیکھا اور بول اٹھا۔ ”یہ۔  
 میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔“

کیرق نے کوئی جواب نہ دیا۔  
 ”تم۔“ گمنی نے جیسے پتہ پاتے ہوئے کہا ”تم سراج کے ساتھ باہر  
 گئی تھیں؟“

کیرق نے آگے بڑھ کر زرد سے ایک پتھر گمنی ٹھکے کے منہ پر لگا دیا اور  
 نوٹ ہاتھ میں تھا سے دوکان سے نکل گئی۔

ماہنامہ ”کتاب“ لکھنؤ

## میرے دو ہاتھ

مُد سے کُتھ کے بھرنے کی آواز آئی تو کھانا م کی آنکھ کھل گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کتے کچھ ایسے انداز میں بھنگ رہے تھے، جیسے رو رہے ہوں۔ اندھیرا تو جب وہ سیاہ تھا تب بھی تھا، مگر اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ ابا دس کہلات تھی، چاندنی کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن تاجے بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں، برسات کا موسم نہیں۔ شام کو اس نے دیکھا تھا کہ آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں نہیں ہے، شاید جاڑے کی دھند تھی، جس نے ستاروں کو اپنی کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ دھند تھی یا دھواں یا دھول کا بادل تھا اس میں سکھرام کو گلا گھسٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شاید یہ اُس کا وہ پہلی ہو۔ بھلا اندھیرے سے بھی کسی کا گلا گھسٹتا ہے؟ شاید جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے۔ مجھے کھل سٹ ہو رہی ہے۔ اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکنے والی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ چار بجنے میں پانچ منٹ ہیں، مبارک کے چوکیدار ساڑھے چار بجے اپنا پہرہ ختم کر کے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، پورے گھر کی ساڑھے پانچ بجے۔ اُس کو مکانوں کا صفایا کرنے میں بس یہی ایک گھنٹہ ملے گا۔

چوہی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے تین برس میں کئی بار اس نے جیل کی ہوا کھائی تھی۔ دوبارہ بھی کی پولیس نے اسے تڑی پار کیا تھا۔ اس بات کا ہونا نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھی میں اس کی شکل بھی نظر آئی تو یہ جاس کا چالان کر دیں گے، چاہے اس نے کوئی مجرم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

سوشل ڈراما پر ناچلا آیا تھا، مگر یہاں کا موسم چوہی کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ رات کو سردی کے مارے سب مردانہ کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے پولیس والے کم بجت بھی ہر وقت چکر لگاتے رہتے تھے۔ دو چار والد اس کو پوچھتے بھی تھے۔ "کیوں سکھا رام! بوجے پولیس لے کر دیا نہ تجھے تڑی پار؟ یاد رکھتا کہ ہم تڑی پار نہیں کرتے۔ ذرا سا شبہ بھی ہو تو یہ جیل خانے میں بند کر دیتے ہیں۔" ان حالات میں کوئی شریف آدمی۔ یا شریف چور۔ کسے تو کیا کرے؟ دو چار ہی دل میں جیب میں جو جمع پونجی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ سکھا رام نے سوچا اپنے گاؤں واپس چلا جائے۔ پوناسے سو سا سو مل پر ہی تو تھا۔ مگر جئے تو کیسے۔ تیس برس کے بعد اپنی بیوی کو کیا منہ دے گا؟ گاؤں چھوڑتے وقت اس نے دھڑبھڑ کے منہ میں جا کر اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب وہ اس وقت ہی واپس آئے گا، جب اس کے ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے تاکہ ماہوکار سے اپنی زمین چھڑا لیں، اپنے جھونپڑے کی مرمت کرا لیں اور بل جوتنے کے لیے ایک جڑی کو لھا لیں۔ بیلوں کی خرید لیں۔ بس اتنی سی دنیا تھی ان کی۔ وہ بیگنڈ میں ایک جڑی بیل۔ ایک بل۔ جھونپڑے کی چار دیواریں اور بھونس کی چھت۔ اور سادہ قری یا

ہر بار جب اسے اپنی بیوی سادتری کی یاد آتی تھی تو سکھارام کے دل میں دودا کی ایک میٹھی میٹھی سی ٹھنسی آتی تھی۔ گاؤں بھر میں ایک چھوڑی بھی تو سادتری جیسی نہیں تھی۔ ام کی کیروں جیسی آنکھیں۔ یہ لہجہ ریشم جیسے ملائم بال جی کا جڑا بنا کر اس میں ایک جنگلی پھول لگا لیتی تھی تو سکھارام کے دل میں کنول کھل اٹھتے تھے۔ دہلی تہی گھر شد دل جسم جو تو گز کی ساڑھی اور پھنسی جوئی چوئی میں امد بھی غصہ ٹھاتا تھا۔ بس کچھ ایسی کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو پھر بھی ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی کوئی سیلی جمدی جاتی تو کہتی "مجھے کیا فکر ہے؟ میرے گھر والے کے محنت کرنے والے دودا تھ سلامت چاہئیں۔ سب دودا تھ ہو جائیں گے۔"

سادتری کا خیال آتے ہی سکھارام اندھیرے میں مسکرایا، اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھو کر ٹھوس کر سکتا تھا مگر وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان دودا تھوں نے جو محنت سے گھر سے امد سخت ہو گئے تھے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ ہل چلایا تھا۔ بیج بویا تھا۔ مینڈا کی تھی۔ خلائی اسکائی کی تھی۔ اناج کو چھاج کر بوریوں میں بھرا تھا، بوریوں کو اٹھا کر بیل گاڑی میں رکھا تھا۔ پھر وہ سب بیدیاں ساہوکار کے ہاں پہنچا آیا تھا۔ امد ساہوکار نے بھی کھاتہ کھول کر حساب بتایا کہ اناج سے قرضہ پورا نہیں ہوا، اس کو اپنا بیل بھی بیاج میں دینا ہو گا۔ ایک بیل تو پہلے ہی بوڑھا اور بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ دوسرا ساہوکار کے حوالے کیا۔ ساہوکار کی کوئی ہی دودا تھوں سے ٹکھینا ہوا گھر واپس لے آیا۔ اُس دن سکھارام نے بمبئی آنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے سنا تھا کہ شہر میں کام بہت ہے۔ محنت مزدی کرنے والے

دو ہاتھ ہونے چاہئیں۔ ہاتھوں میں تو ان دو ہاتھوں کا کوئی خریدار نہ نکلا۔ سراس نے ان ہاتھوں سے بوجھاڑ دیا تھا۔ اناج کی بوبیاں مال گاڑی سے اُتار کر ٹرکوں میں بھر کر تھیں اور ٹرکوں سے اُتار کر گوداموں میں رکھی تھیں، امدادی بورڈوں میں سے اس کو گیسوں کی ایسی جانی بوجھی سونڈھی سونڈھی خوشبو آئی کہ اس نے سوچا ممکن ہے میرے کھیت سے پیدا ہوا اناج بھی ان بورڈوں میں بھر کر آ گیا ہے بعض گوداموں میں خفیہ طریقے سے مال دات کھانا جاتا تھا۔ سکھا رام جانتا تھا یہ کالا بازار ہے۔ مگر وہاں مزید دیکھنی چاہی تھی۔ چار روپے کے بجائے آٹھ روپے وزن شا کم چار آنے کی اصل پاؤ کھا کر وہ اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیتا اور بس! سینا کی دنگ برنگی رویشیاں آنکھیں چمکا کر اس کو بلاتیں، اُس کے رنگین پوشروں پر اُدھن لگی تھیں اس کو لٹھاتیں، مگر سکھا رام سوچتا میری سادتری ان سب سے خب صورت ہے۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے کیوں اپنی محنت کی کمان خرید کر دوں؟ اُس کی انٹی میں پانچ سے دس، دس سے بیس، بیس سے پچاس، سو روپے، دو سو روپے لکھے ہوتے جا رہے تھے اور اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کھیت، اس کے بیل، اُس کا گاؤں، اُس کی سادتری، اُس کے قریب آتے جا رہے ہیں، اور وہی بھر محنت کرنے کے بعد جب وہ ان ہی ہاتھوں کا گلیہ بنا کر فٹ پاتھ پر سوجاتا تھا اس کے خواب میں سادتری کے پیروں کی چھال سنائی دیتی، اور وہ اپنے پھلی سے مشدول جسم کو فوگڑ کی سڑھی میں پیٹھے اُس کے لیے بھا کر اور سنگ اور پیاز کی تمشیاں لاتی اور کھیت کی منڈیر پر ہی بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے۔ اور کبھی کبھی بچوں کی طرح سادتری نوالہ بنا کر سکھا رام کو دیتی اور کبھی وہ شراوت سے سادتری کی انگلی کاٹ لیتا اور جب وہ

اس پر کھل کھلا کر غصہ پڑتی تو پھر وہ غلام بنا کر سادو تری کے منہ میں دیتا اور اس کے نزدیک سفید دانت سکھا مام کی مضبوط ٹھوکر دوئی انگلی کو نرمی سے اپنی کپڑ میں لے لیتے اور پھر دانتوں کی جگہ ہرنٹ لے لیتے۔ سادو تری کے انگوڑوں جیسے اُورسے اور سی بھرے ہرنٹ۔ اور سکھا مام کو محسوس ہوتا کہ وہ نرمی اور پیار کی ایک لہر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ ڈوبتا جا رہا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے ٹھونسنے سے بچائے۔

ایک دن سکھا مام صبح کو دریا سے اُٹھا، انگڑائی لے کر دانت بھر کی فینہ کا نشہ بند کیا، پھر رام کا نام لے کر کھڑا ہو گیا تو اُسے اپنی انٹی جہاں وہ سب روپیہ رکھا کرتا تھا ہلکی لگی۔ گھبرا کر حلیہ دی سے کھول کر دیکھا تو سب روپیہ غائب تھا۔ چھ مہینے کی محنت پر پانی بھر گیا تھا۔

”کہاں ہے وہ بد معاش؟“ وہ بے تحاشا چلایا۔

”کوئی بد معاش؟“ کسی نے پوچھا۔

”جو میرے قریب یہاں فٹ پاتھ پر سو رہا تھا۔ دانت کو پڑی ویچک بھڑے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُس کو بتایا۔ ہاں میں نے ہی اُس کو بتایا تھا کہ میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو چکے ہیں۔۔۔ مگر وہ ہے کہاں؟“

ایک بوڑھا بھکاری جو ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا تھا اور اُس فٹ پاتھ کی سب خبریں رکھتا تھا بولا۔ ”ارے جیکو تمہیں اب نہیں ملے گا۔ وہ تو کہیں بیٹھا اتھار سے روپے سے مائدہ لی رہا ہو گا۔“

پورے تین دن اس نے شرکی خاک چھانی سر مارا دیا نے امداد رو بیچنے

کے غیر قانونی اڈے پر برآیا۔ بڑے بڑے عجیب آدمیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کئی چاہتے تھے کہ وہ بھی مارو سپلائی کرنے کے دھندے میں لگ جاتے۔ ایک ہی مہینے میں اُس کا سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ مگر سکھ رام کو کام نہیں چاہیے تھا اس کو بھیکو سے بدلہ لینا تھا، جس نے اُس کی تین مہینے کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ آخر کار چھتے دن دھراوی کے ایک جھونپڑے میں وہ بھیکو کو پکڑ پایا۔ وہ ایک میز پر بوتل اور گلاس اور بجٹے ہوئے چمڑوں کی ایک پلیٹ رکھے ہوئے دائرہ پی رہا تھا۔

سکھ رام نے اُس کو گھٹے سے پکڑ لیا اور چلایا: ”نکال میرے روپے۔“  
 بھیکو نے میں تھا پھر بھی اُس نے انکار نہیں کیا، صرف اتنا کہا:۔  
 ”گلا تو چھوڑ دو، دیتا ہوں، دیتا ہوں۔“

سکھ رام نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیا۔ بھیکو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تھکی بھر سکے نکال کر میز پر ڈال دیئے۔ سکھ رام نے جھپٹا مار کر ان کو تو اپنے قبضے میں کیا۔ پھر گئی کر بولا: ”مگر تُو نے تو ساٹھ سے تین سو روپے چرا لئے تھے۔ یہ تو صرف تین سو روپے اتنی پیسے ہیں۔ باقی کہاں ہیں؟“

”یہاں“ بھیکو نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر تہہ نہ لگا کر بولا:۔  
 ”سب پا گیا۔ بس بڑا مزہ آیا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ دھنیہ داد۔“  
 ”دھنیہ داد کسے بچے؟“ سکھ رام نے پھر اُس کا گلا پکڑ لیا۔ اس پر مارو بچنے والا اور اس کے دو چار ساتھی وہاں آگئے اور سکھ رام کا ہاتھ چھڑ کر لڑائی اس کو مارنے لگے۔

”نہیں چھوڑ دو اسے“ بھیکو نے حکم دیا اور اُن لوگوں نے سکھارام کو چھوڑ دیا۔  
 ”یہ میرا دوست ہے ذرا غصے میں آگیا تھا۔“ اور پھر سکھارام کی طرف دیکھ کر۔  
 ”میشو، میشو۔ تم بھی بیٹو۔ ابھی ہم دو بوتلیں اور منگاسکتے ہیں۔“  
 ”میں نہیں چیتا۔“ سکھارام نے کہا۔

”یہی تو مشکل ہے کہ تم پیتے نہیں ہو تب ہی تو انٹی میں اتنے روپے لیے پھرتے  
 ہوا اور پھر بھی فٹ پاتھ پر سوتے ہو۔ پیر میرے بھائی۔ دامو تمہارے ہی پیسے سے  
 آئی ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے گلاس میں دامو داٹیل دی اور گلاس سکھارام کی طرف بڑھایا۔  
 سکھارام نے سوچا۔ ”یہ بھی ٹھیک کتا ہے۔ میرے پیسے ہی کی تو دائروں رہا  
 ہے۔“ اُس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ ایک بار تو بڑی بُرائی ہوئی۔ پھر دل کوڑھ کے  
 وہ پی گیا۔ اُس کو پیپے تو ایسا لگا کہ کسی نے چاقو سے اُس کا گلا اندر سے چیر دیا ہے،  
 مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ احساس جاننا رہا۔ اور اس کی جگہ ایک نرم نرم گرمی  
 نے لے لی جو اس کے بدلی میں دوڑتی جا رہی تھی۔

بھیکو نے اس کا گلاس پھر پھر دیا تھا۔ ”ادھر پیر میرے پیارے“  
 سکھارام نے دوسرا گلاس بھی پی لیا۔

اب اُس نے گلاس واپس میز پر رکھ دی تھا اور بھیکو اس میں تیسرا پیگ انڈینے  
 کے لیے دامو کی بوتل بٹھا ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر اس کی کلائی پر پڑی جہاں ایک سُنہری  
 پٹے کی گھڑی جگمگا رہی تھی۔

”یہ بھی میرے پیسے سے لی ہے؟“ وہ چٹایا۔



بھیکو نے کلائی سے گھڑی اُتار کر سکھ رام کو دے دی۔ یہ تو میرے یاد آج ہی ایک سنگھ سے پچاس روپے میں لی ہے۔ خالص ولایتی گھڑی ہے، اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے۔“

دھانی بری کے بعد آج بھی وہ گھڑی سکھ رام کی کلائی پر لگی ہوئی اندھیرے میں وقت بتا رہی تھی۔ چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ سکھ رام نے سرچاؤقت بھی کتے دھیرے دھیرے گزرتا ہے، ساڑھے چار بجیں تو میں اپنا کام چالو کر دوں گا، اور پھر اُس کو گھڑی سے بھیکو کی یاد آئی، بھیکو جواب میں جیل کی ہوا کھا رہا تھا مگر جس نے سکھ رام کے روپے چور کر اس کو چوری کا راستہ دکھایا تھا۔

پہلے چھوٹی موٹی جہدیاں۔ پھر بڑی چہدیاں، مگر کبھی سکھ رام کے پاس اتنے روپے نہ ہوئے کہ وہ گاؤں واپس جا کر اپنی زمینی چھڑا لیتا۔ دوپہل خرید لیتا، سادری کے لیے دو چار بڑھیا ساڑھیاں اور کچھ زلیور خرید لیتا۔ اول تو چوری کا مال دوکان داروں کو کڈیوں کے بھاؤ بیچنا پڑتا تھا۔ دوسرے جو آتا تھا وہ کھانے پینے، چلانے میں خرچ ہو جاتا تھا، جیل میں۔ وہ فضلہ ٹھیک کتنا تھا؟ یاد اس حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی ہے۔“

پونام میں ایک دن شام کو اندھیرا ہوتا ہے ایک عورت کا ٹوہ چھین کر بھاگ چلا جا۔ مگر اس کم بخت نے چھینے سے گرا سہاوی سر پر اٹھایا۔ چاروں طرف سے لوگ مدد پڑے تھے۔ سکھ رام نے بڑے سے دس دس روپے کے نوٹ نکال کر ٹوہ زمینی پر پھینک دیا، اور خود بھاگتے بھاگتے ایس۔ ٹی کے بس شینڈ کی طرف آ نکلا۔ ایک

بس جانے کو تیار تھی، وہ اس میں سوار ہو گیا، بس چل پڑی کدہ ٹکڑے کرنے پر چھا، کہاں جاؤ گے؟“ سکھ رام نے جس کا سانس روڑنے سے اب تک پھولا ہوا تھا جواب دیا۔ ”جہاں بھی یہ بس جا رہی ہے۔“

بس کدہ ٹکڑے کس جگہ کا نام لیا جو بس کی ٹھکر ٹھارہٹ میں نشانہ نہ دیا، پھر بس نے کہا۔ ”سات روپے ہوں گے، سکھ رام نے اتنے چوری کا دس کاغذ پکڑا دیا اور تین روپے لے کر حبیب میں رکھ دیے۔

صبح سویرے بس اپنی منزل پر پہنچی تو سکھ رام آنکھیں دٹا ہوا اتر اس کا خیال تھا کہ کوئی گاڑی ہو گا، مگر یہاں پہنچ کر دیکھا کہ بڑی مدافتی ہے، اچھا خا صا قصبہ ہے۔ بازار بھی ہے، بازار میں دوکانیں بھی ہیں، دکانوں میں سامان بھی ہے۔ چوری کرنے کے قابل سامان!

سکھ رام نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین روز یہیں گزارنے چاہئیں، کوئی جانتا ہے اس کی قسمت یہاں ہی کھل جائے۔ دن بھر وہ بازاروں میں گھومتا، کس مکان میں کیکیا سامان ہے، اس کو دماغ میں یاد کرتا۔ کہاں ساڑھیاں مٹی میں، کہاں زیور، کہاں بیڑی کس کس مکان میں تجڑیاں ہیں جو قیمتی ہے روپوں سے بھری ہوں گی، رات کو چمکیا بازار کا گشت لگاتے تھے۔ مگر اس نے دیکھ لیا تھا کہ ساڑھ سے چار بجے صبح ۱۰ اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، بس مری وقت ٹھیک رہے گا، اس کے کام کے لیے دو چار دوکانوں ہی سے اس کا کام چل جائے گا، اور دوکانیں کھلنے کے وقت تک وہ وہاں سے بہت دور نکل جائے گا۔

شہر کی ساری رونق بندھ کی وجہ سے تھی، زیادہ تر لوگ وہیں کام کرتے تھے۔

سوسکھارام نے سوچا کیوں نہ بندھ کر بھی دیکھ لیا جائے۔ بندھ واقعی بڑا جگلی تھا۔ دو پہنڈریوں کے بیچ میں ندی کے پانی کو روکنے کے لیے بندھ بنایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بجلی کے کارخانے بھی تھے۔ بندھ پر اب بھی کچھ کام ہو رہا تھا۔ سینکڑوں مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔

ایک مزدور سے سکھارام نے پوچھا ”کیوں بھی یہ اتنا بڑا بندھ کیوں بنایا

ہے؟“

اس نے کہا۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ یہاں پانی اکٹھا کر کے نہریں نکالیں گے جو سو کے کھیتوں میں پانی پہنچائیں گی۔“

سکھارام نے سوچا ”میرے کھیتوں میں بھی پانی آئے گا؟“

وہ مزدور اب کہہ رہا تھا۔ ”اور یہ بجلی گھر بھی پانی کی طاقت سے چلتے ہیں یہاں

بجلی بنتی ہے اور ان تاروں سے دُور دُور جاتی ہے۔ جانتے ہو بھی ہیں بجلی میس سے جاتی ہے۔“

..... اور سکھارام کے دماغ میں بھی کی لاکھوں جگمگاتی ہوئی روشنیاں اُبھر آئیں۔

اتنی دُور سے بجلی وہاں جاتی ہے! پھر اس نے سوچا ”مگر میرا گاؤں تو صرف چالیس میل ہے یہاں سے۔ وہاں تک تو یہ بجلی جاتی نہیں ہے۔ مجھے اس بجلی سے فائدہ؟“

ایک اونچے ٹیلے پر کسی مزدور نے ٹہن کی چھت کا ایک جھونپڑا بتایا تھا وہ قتل

پڑا تھا، رات کو نظر بچا کر سردی سے بچنے کے لیے سکھارام اُسی میں پڑ رہا تھا وہاں

سے ایک طرف بہت دُور بندھ پر لگی ہوئی روشنیاں نظر آتیں، دوسری طرف شہر

کے مکانوں اور مکانوں کی بتیاں۔ وہ سوچتا اس روشنیوں کے سمندر میں ہی جھونپڑا

ایک اندھیرے کاٹاپو ہے۔ پھر سوچتا۔ شاید اندھیرا جھوپڑے میں نہیں ہے میرے محل میں ہے۔

نہیں یہ اندھیرا کچھ اور قسم کا تھا۔ اس میں تو چندھ کی روشنیاں بھی ڈوب گئی تھیں، اندھیرے کے سمندر کی تہ میں دو درکیں دھندلی دھندلی سی ٹٹ رہی تھیں، اس کا اپنا کلاسی گھٹنا نہیں معلوم ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کوئی دنیا کا ٹلا گھونٹ رہا ہے جسکی ہے یہ میرا وہم ہی جو، اس نے سوچا ادا ایک بار پھر گھڑی کی اندھیرے میں چمکنے والی سوئیں کی طرف دیکھا۔ چار بج کر بیس منٹ ہونے لگے، اب اسے چلنا چاہیے۔ باندھ پہنچنے میں کم سے کم دس منٹ تو لگیں گے، یہ سوچ کر وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ زمین کے اندر سے ایک گڑا گڑا ہسٹ کی آواز آئی جیسے سرنگ میں کوئی ریل چل رہی ہو یا ہوائی جہاز بہت نیچے اڑ رہا ہو اور چھت پر گرے ہی والا ہو۔ ساتھ میں اسکی پاؤں کے نیچے سے زمین جیسے سرک گئی ہو۔ قدم ڈلگائے تو اس نے اندھیرے میں دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ہاتھ سے چھو تو اس کو ایسا لگا جیسے دیوار بھی ڈھکڑا رہی ہے۔ اس نے شام کو شراب پی ہوتی تو وہ سمجھتا یہ سب نشے کا کرشمہ ہے۔ لگاس نے تو چاروں سے مار دیکو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا، پھر یہ سب کیا۔۔۔

”بھونچال!“ دفعہ یہ خیال بھل کی طرح اس کے دماغ میں گوندا ادا اٹھے لمحے میں جھوپڑے کی ڈھکڑاٹی ہوئی دیوار میں ادا کھڑکھڑاتی ہوئی ٹین کی چھت اس کے سر پر آ رہی۔

جب اس کو ہوش آیا تو سب سے پہلے جو چیز اس نے محسوس کی وہ گنچک کی تیز بو تھی ادا ایک دم گھوٹنے والا دھول مٹی کا بادل سا اندھیرا اب بھی اتنا گرا

تھا کہ اس کو چاقو سے کاٹ سکتے تھے۔ سکھلام کو اپنے ماتھے پر پانی کی ایک لکیر چلتی ہوئی معلوم ہوئی ٹٹول کر دیکھا تو منہ سے "سی" نکل گئی۔ سر میں گہرا زخم آیا تھا جس میں سے خون رہا تھا۔ ٹانگوں پر، بازوؤں پر، ایک طرف چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ مگر یہ وقت ان معمولی زخموں کی پرواہ کرنے کا نہیں تھا۔ زخموں کی ٹیس اس کو مجبور کر رہے ہوشی سے باہر نکال لائی تھی اور اب ایک ہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اس جھونپڑے کی طرح بازار میں دکانوں کی دیواریں اور چھتیں بھی گر گئی ہوں گی۔ اس کو تالہ توڑنے کی تکلیف بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پندرہ ساڑھے چار بجے تھے۔ بھونچال آئے صرف دسٹل منٹ ہوئے تھے۔

ٹیم کا پتراجو اس کے سر پر گرا تھا اس کو ہاتھ سے ہٹا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، چاروں طرف دیواروں کی اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ اندھیرے میں ٹٹول، لنگڑا ناگتا پڑنا، وہ انسانے سے خسر کی طرف چل کھڑا ہوا، اندھیرا اب ایک ٹنگے دھندلکے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ گریڈ پر پادشہ میں سب جگہ بجلی کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اب قرائس کا کام ادا بھی آسان ہو گیا تھا۔

سادا شہر ایک دم گر پڑا تھا۔ جیسے گھرنہ ہوں، بچوں کے بنائے ہوئے مٹی کے گھروں سے ہوں۔ زمیں سے دھول کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اینٹوں، پتھروں، ٹیم کے پتروں کے نیچے دبے ہوئے آدمی۔ مردہ عورتیں، بچے۔ جو مر نہیں گئے، تھے یا بالکل بے ہوش نہیں ہو گئے تھے وہ چلا رہے تھے، دوسرے تھے، سک رہے تھے، ایک رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ ایک نے ایک مایہ



ایک اور دوکان کا کیش کس اڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ اُس کو کھڑے کی کوشش کی۔ بڑا بھاری تھا ضرور روپے بھرے ہوں گے۔ جب نہ کھول سکا تو بند کا بند ہی ڈھیر میں شامل کر لیا۔ ساڑھی کا ٹکڑا باندھا۔ اب تروہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ بڑی مشکل سے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس نے سر پر رکھا۔ مڈنی کافی تھا اس کی ٹانگیں بڑھ کر اٹھانے لگیں۔ مگر اس نے جی کڑا کر کے قدم ڈھرائے تاکہ سویرا ہونے سے پہلے وہاں سے باہر نکل جائے۔

دھیرے دھیرے آسمان میں سویرا ابھروا تھا۔ پورب کی طرف بادل پہاڑیں، بندھ، ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی اب دکھائی دے رہی تھیں، دھیرے دھیرے شہر کے کھنڈ بھی دھرتی پر ابھرو رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور تباہی۔ ایسا لگتا تھا شہر مر گیا ہے، دنیا مر گئی ہے صرف ایک آدمی زندہ ہے، اور وہ دونوں ہاتھوں سے دنیا کی دولت بٹور کر لیے جا رہا ہے۔

نہیں (اُس نے سوچا) کوئی اور بھی زندہ ہے! ایک بچے کے رونے کی آواز نے سکھرام کو چونکا دیا، جیسے بیادانہ باہر سے نہ آئی ہو خود اُس کے من کے اندر سے آئی ہو۔ اُس نے مڑ کر دیکھا، ایک گھر کی چھت اور دیوار میں ڈھیر چوہلی تھیں۔ اُن ہی میں ایک طرف باپ مرا پڑا تھا، پاس ہی ماں، اور ماں دونوں لاشوں کے قریب ہی ایک سال ٹوڑا سال کا بچہ جو کسی ٹھہرے سے بچ گیا تھا سائینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

سکھرام نے بچے کو دیکھا پھر ایسے نظر پھیرا جیسے بچے نے اُس کی چھدی پکڑ لی ہو، جلدی جلدی قدم ڈھرائے تاکہ اتنی دیر پہنچ جائے کہ بچے کی آواز اس کے

کافوں تک نہ پہنچے۔ مگر بچے نے پہلے سے بھی زیادہ زود سے رونا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے اس کے قدم آپ سے آپ رُک گئے، اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اُس کا چنانچہ ہر جو ہمیشہ اُن کے سینوں میں آتا تھا۔ مگر جس نے اب تک سادری کی کوکھ سے جھم نہ لیا تھا۔

اس نے مڑ کر بچے کی طرف دیکھا۔ سر پر گھڑدا ٹھائے اُلٹے پاؤں اس کے قریب گیا۔ سوچا کسی طرح اس گھڑی کو بھی لے چلوں اور اس بچے کو بھی اٹھا لوں۔ مگر ہاتھ دھڑکیا۔ یا ایک بوجھ کو سنبھال سکتے تھے یا بچے کو گود میں لے سکتے تھے اس نے سر سے گھڑی اتار پھینکی۔ دوڑ کر بچے کے باپ کے پاس گیا، بی بی کے سر پر ایک بھاری پتھر گرا تھا۔ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ مل کی بنی پر بھی ہاتھ لگا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے، پھر اس نے بچے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ بچہ جھمک کر اُس کی گود میں آئے ہی خاموش ہو گیا جیسے اُسے اپنی منزل مل گئی ہو۔ سکھرام نے ایک نظر اُس گھڑی کی طرف دیکھا، جس میں دنیا کی ہر دولت موجود تھی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے بچے کو سنبھال کر اپنی چھاتی سے لگایا اور چل کھڑا ہوا۔ دور بندھ کے پیچھے سورج بادلوں میں سے اپنا سر نکال کر کوئٹہ نگر کی تباہی کو دیکھ رہا تھا، مگر سورج کی ایک نرم کرن سکھرام ادا اُس کی چھاتی سے لگے ہوئے بچے پر پڑی اور بچہ جس کی آنکھ میں اب تک آنسو تھے، آپ سے آپ سُکرا دیا۔

ہاتھ مار "خس" دہلی



## نوالہ

پورے چال میں ایک دند بچا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی کھولی میں سانپ نکل آیا ہے۔ یا کسی کے بال بچہ جو رہا ہے۔ عورتیں ایک کھولی سے دوسری میں گھس رہی تھیں۔ شیشیاں، برقعیں، ڈبے بے سب کی سب سرلاہیں کی طرف فٹک رہی تھیں۔ جیسے سرلاہیں کا آخری وقت ہوا وہ ساری پڑوسنیں اپنی سی کرنے پر تلی ہوں۔

ایک طرح سے تو سرلاہیں کا واقعی آخری وقت تھا۔

ان کی ٹرین بس چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ پورے ۴۴ برس کی ہوتیں مگر ان کے دماغ اندیشہ والہ ہیں نے پر بھا کر کے سٹوڈنٹ میں ان کی عمر کے پورے پانچ سال نہ ہڑپ کر لیے ہوتے۔

مگر کاغذ کی عمر ایسا زبردست سہارا نہیں ہوتی۔

وہ یورپی کے کسی گناہ سے گناہوں کی پہلدار تھیں۔ مگر بیٹی میں اتنے سال رہیں کہ وطن کو بھول بھال کے بیٹی کی ہی ہو گئی تھیں۔ ان پر کسی صوبے کا قضا نہیں تھا۔ کوئی انہیں گجراتی سمجھتا، کوئی مارواڑی اور سندھی بس جگت سرلاہیں ہو گئی تھیں۔ سرلاہیں کے اے ایم ہاسپٹل میں نرمس تھیں۔ جسنگائی الاؤنس ملا کے دوسرا بیس

روپے ملتے تھے۔ بارہ روپے کمرے کا کرایہ دے کر تانہ بچ جاتا تھا کہ بڑے ٹھاٹ سے رہتی تھیں۔ اسپتال سے مریم بی بی کا سامان، اسے پی، سی کی گولیاں، مرکبوری کرم اصل ٹیکسیرین اور پینٹین دواؤں کے سہل لاکر مفت تقسیم کیا کرتی تھیں۔ ان کا کمرہ آس پاس کے علاقے کے لیے اچھا بھلا اسپتال تھا۔

سرلا بی بی بڑے کام کی چیز تھیں۔ اوپر سے شکل و صورت کے ساتھ ساتھ چال چلن ایسا تھا کہ کہیں کسی کی گڑبستی پر شے پڑنے کا خدشہ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے اختیار دل عزیز تھیں جدھر نکل جاتیں ان کے جنائے ہوئے بچے بھلاتے رہتے سمجھوتے نظر آتے۔ لوگ ان کے قدموں میں آنکھیں بکھاتے۔ ہر مردے والا ہر دم کا نذر انہیں رعایت سے مال دیتا۔ وہ سول قتل کرتی جاتیں اور بعضوں کے حال چال بھی پوچھتی جاتیں۔

”کیوں دے عس، ہو کی کر کا درد کیسا ہے، مارے شاکر میاں اُمنہ بی کے پیروں کی سوجن اتری کہ نہیں۔ شام کو لے آئے انجکشن دے دوں گی۔ اسے او دہنی تیرے گھٹنوں کے درد کا کیا ہوا؟ تیرا مرد پھر وارو لی کر آنے لگا ہے۔“ وہ خیر خبر دہکتی، گھم دیوی کے ٹکڑا والے بسبب اشاپ پر پہنچ جاتیں اور ان کے رخصت ان کو دعاؤں دیتے رہ جاتے۔

بسبب سب کو یہی دکھ تھا کہ سرلا بی بی اب تک کنوارے بیٹھی تھیں اگر شادی کے بعد وہ بیروں کو گئی ہوتیں، یا میاں چھوڑ کر چلا جاتا تو بھی صبر آ جاتا۔ مگر یہ تو نرانا دھیر تھا کہ ان کی ریل چھوڑ دی تھی اور جیروں ساتھ کا درد دور نشان نہ تھا۔ سب کے سران کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے لیے کرتی تھیں،

لیکن ان کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شرابی ہی ہے یہاں زندگی سرپٹ دوڑتی ہے۔ یہاں مشاطہ اور نائن کاغیش ختم ہو چکا ہے۔ یہاں تو بس آنکھ لڑ جاتی ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔

سرلا میں غم ہیروئنہ نہ سہی، ڈراؤنی بھی نہ تھیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ان پر عاشق ہی نہ ہو پائے۔ آدمی کا بچہ تھیں۔ باپ بچپن ہی میں مر گئے ماں ہمیشہ کی روگی۔ سنگرشیں کے بل بوتے پر انہیں پالنتی رہیں۔ پھر جب بیٹی کا منے لگی تو وہ بالکل ہی ٹوٹ گئی۔ وہ ایک بار اچھا ہوا انہیں بیٹی کے بیاہ کا خیال آیا، مگر اس خیال کے کوئی معقول صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی وہ چل بسیں۔ وہ دن اور آج کا دن سرلا میں ایسی اپنے کام میں مجسٹس کہ شادی کا خیال تک نہ آیا۔ خیال آیا بھی ہو گا تو انہوں نے کسی سے تقاضا نہیں کیا۔ اور تقاضا بھی کر لی جس سے تقاضا کرتیں کہ بیٹی بھلا بیاہ کلا دو؟

کہتے ہیں اگر کوئی کنواری کنیا بیٹھی رہے تو دھرتی کی چھاتی پر بوجھ ہوتا ہے اور دھرتی کے اس کب کا پاپ سب کو لگتا ہے۔ کم از کم سرلا میں کے جائزہ کا تو یہی عقیدہ تھا۔ ان کی نیکی اور پار سائی قابل ستائش تھی، مگر نیکی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تو ان سے کوئی نہیں کہتا تھا کہ بابا کسی بھی راہ سے غریب سے غریب کے گھر میں بائیس ٹال کر جھل جاؤ۔ مگر عورت کے چند گز ہیں جنہیں اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آج کل تو رہا ہوا اکیلے ماں باپ کے بس کی بات بھی نہیں۔ اچھی شریف زادیوں بھی اب تو چڑیا خود ہی گھیرتی ہیں۔ پھر شرماء سر جھکا کر ڈور ملا رہی کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں۔ کوئی داغ نہیں لگتا کسی کو

پتہ بھی نہیں چلتا۔ والدین بھی سرخرو، دوسرا دلس بھی گم۔ یوں ہوا کرتی ہیں شادیوں، مگر نہیں ہو پاتیں تو بے چاری سر لایہیں جیسی شمس گایوں کی۔ جو دنیا کے زخموں پر پھا ہار کھنے میں ایسی گم ہیں کہ اپنا کچھ ہوش نہیں۔ سب کے دکھ بانٹتی ہیں، راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتی ہیں۔ نوزائیدہ بچے ہتھیلیوں پر جھپکتی ہیں۔ اور پھر اپنی نیم تاریک کھوٹی میں اٹا سیدھا نکل کر سونے کھاٹ پر پڑ جاتی ہیں۔ کوئی اتنا نہیں جوالہ کی تنہائی کے برستے ہوئے زخموں پر پھا ہار رکھے۔

یہ اتنا بڑا چنٹا چنگھاڑتا بیٹی، کیا یہاں کوئی اکیلا عودت کے پیار کا بھوکا نہیں؟ کسی کو عودت کے لمس کی چاہت نہیں، سر لایہیں کسی کی محتاج نہیں، اپنا کاتی کھاتی ہیں، ساری جہاں میں ایک نگینہ سا کمرہ ہے جو کسی فلیٹ سے کم نہیں۔ صفہ کر ہی بھی چھاپنا الگ سند اس بھی۔ اب اور کیا چاہیے اس دنیا میں۔

لوگوں کا کیا ہے، کنوارے تو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ہر دم شادی کی دعائیں شادی کے تقاضے۔ تو بھی شادی کر لو تو بچے کی فرمائش۔ ایک بچہ ہوا تو یہ آلاہٹ ہے کہ اسے ہے بس ایک مری۔ چلیے دوسرا پیدا کیجئے مگر سر لایہیں کو بھی یقین نہ ہوا تھا کہ وہ سدا کنواری ہی رہیں گی، کوئی تو ہو گا یہاں سے وہاں تک پھیل دیا میں۔ کوئی ایک اللہ کا بندہ جسے خدا نے ان کی زندگی کا حصہ مار بنایا ہو گا، یہ امد بات ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نہیں پاتیں۔ لوگوں کے کہنے سے انہیں اور بھی خیال آنے لگا۔ مگر جب بھی انہوں نے کسی کو اس خیال سے دیکھا وہ فحش منوعہ ثابت ہوا اور اپنی بیوی کی پوشیدہ بیماریوں کا ردنا لے میٹھا۔ کچھ وقت ساتھ گزارنے کو تو بہت سے تیار تھے مگر ہاتھ پکڑ کے نبھانے کے خیال سے ہدایت لے کر چڑھنے کا ارمان

کسی کے دل میں نہ جھانکا۔ ہاسپٹل میں بھی کبھی کسی نے گری گری پڑا سارا آنکھوں سے انہیں نہ دیکھا کبھی کسی نے انہیں ہٹ کر راستہ دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی۔ لوگ دفعتاً نکل جاتے اور وہ اٹلی ہو کر دیوار سے لگ جاتیں۔

گام دیوی کے ناکے سے وہ روز صبح کو پونے آٹھ بجے والی بس پکڑا کرتی تھیں۔ بس میں سب ہی روز کے جانے پہچانے ہو کر تے تھے۔ سب کی سیٹیں کچھ مقرر سی ہو گئی تھیں۔ اس دن وہ بے خیالی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھیں۔ ایک اجنبی کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انہوں نے لبالب بھری ہوئی لمبھی ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بس کے بیچ میں نکل ہوئی رکاب پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اجنبی نے انہیں سر سے پر تک دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جائیے۔“ وہ رکاب پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اخبار چڑھتا رہا۔

انہوں نے پہلے تو بدکھلا کر جھٹ سے اپنا بیٹوہ دلوچا کر کہیں کوئی چوراچکا تو نہیں۔ پھر سمجھیں کسی چیٹ کا شوہر ہو گا اور ابھی پیروں کے دم اند کر کے دکھ سدھ کا قصہ شروع کر دے گا۔ مگر وہ رکاب پکڑے کھڑا جھولتا رہا اور اخبار چڑھتا رہا۔ جب انہیں یقین آگیا کہ وہ خود بھی کسی جھٹک مرض میں مبتلا نہیں تو وہ سناٹے میں رہ گئیں، ایسا تو کبھی ہوتا نہیں!

مگر وہ سوسے دی جب پھر دی ہو کر وہ بس پر چڑھیں اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا تو وہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئیں مگر بڑی کسمپاسیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں، جی چاہا اسے سستی بھر سلفا کی گولیاں ہی دے دیں۔ کہیں زخم تلاش کر کے مرکوری کیم کا پیا ہار کے سفید جھک سے پی باندھ دیں، مگر اس کی مکمل صحت

سے ان پر اوس چڑ گئی ایک کھرو پنچے تک کا نشان نہ تھا۔ وہ بس میں بے تعلق سا کھڑا  
جھولتا رہا اور اخیر پڑھتا رہا۔

تیسرے دن جب یہی عادت ہو تو سرلا میں کے چھکے چھوٹ گئے۔  
”گھوٹے کا ہے کو مجھے روز روز میٹ دیتا ہے کیا تیرے اماں بہنیں نہیں  
کلمہ نہیں“ ان کا جی چاہا اسے کسی بات پر خوب جلی کٹی سنائیں، مگر وہ ایسا بے تعلق سا  
کھڑا جھول رہا تھا کہ انہیں بات بے کی سی لگی۔

جب ہفتہ بھر یہی دستور چلتا رہا تو سرلا میں بالکل اکتل پھل ہو گئیں خدمت گزار ہیں  
کی تو وہ عادی ہو چکی تھیں۔ کسی کا احسان اٹھانے کی ان میں عادت نہ تھی۔ ان کے دل  
پر بوجھ بڑھنے لگا۔ ڈیوٹی پر انہیں بار بار خیال آتا کہ کیا کریں۔ دوسری بس سے چلیں  
تو وقت پر پہنچنا ناممکن۔

سرلا میں کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دنیا سے روٹتی  
روٹتی رہنے لگیں، جیسے کوئی ان کے ساتھ سخت زیادتی کر رہا ہو۔ ان کا مزاج  
بڑا تازہ ہو گیا، اب وہ بات بات پر الجھ پڑتیں۔ بے بات کے روٹنے لگتیں۔  
ڈیوٹی سے لوٹتیں تو انہیں بند کر کے کھاٹ پر پڑ جاتیں، نہ کھانے کی مدد نہ بدھ  
نہ کچھ۔ کسی کو کچھ دکھ درد بھی ہوتا تو پاس آتے ڈرتا۔

”سرلا میں کو عشق ہو گیا ہے“ ستو گرہ کٹ نے رام دلی کو بتایا۔

”درد موٹے، تیری کھاٹ کٹے، سرلا میں تو دلی ہی ہے دلی ہی“

رام دلی نے ستو کی سات پشتیں قدم ڈالیں۔

”میں جو کہہ رہا ہوں“

”کیا کہہ رہا ہے، تیرے منہ میں بھوبلی“

مگر جب ستوگرہ کٹ نے بتایا کہ گام دیوی کسے نلکے پر اس کی بزنس ہوتی ہے۔ ہر ایک کو فرق نہ پرکھنا، اس کی جیب کے بوجھ کو ہلکا کرنا، اس کا وعدہ کا کام ہے۔ ایک عدد بالور وڈانہ اپنی سیٹ سرلاہین کو روکے دیتا ہے اور خود کھڑا سفر کرتا ہے۔ آج سے نہیں ہفتوں سے یہ قعر چل رہا ہے اور معاملہ قطعی چٹا نظر آرہا ہے۔

”ہائے میں مرچاؤں!“ رام دئی نے چھائی کوٹ لی اور دوڑی دوڑی شیشہ کے پاس گئی۔ شیشہ بھی سندھے میں رہ گئی۔ پھر دونوں مل کر سعادت کی بسو کے یہاں گئیں۔ سعادت کی بسو منڈیر پر فونڈے کو لٹکائے اجابت کلاہری تھی۔

”خدا کی قدت!“ لونڈا سودی میں گرتے گرتے بچا۔

پھر یہ بات آگ کی طرح ساری چال میں گھوم گئی۔

”ایسا ہی ہوتا ہے“ لکشمی گھائے نے کہا۔ وہ ریڈی میڈ کپڑوں میں کالج بٹن بناتی تھی اور بڑی جہاں دیدہ تھی، اس کامیاب لاپتہ تھا، ایک لڑکی تھی۔ وہ اس نے مشن اسکول میں دسے دی تھی، سب اسے گالیاں دیتے تھے کہ اس نے لونڈیا کو عیسائی بنوا دیا۔ لیکن لکشمی ایک کان سنتی تھی دوسرے کان اڑا دیتی تھی۔ کالج بٹن سے کہیں پیٹ پختے ہیں؟ سب جانتے تھے، وہ راتوں کو جایا کرتی ہے، لالہ کے ٹڈے گا بھوں کو چالی پر نہیں لاتی مگر کسی کرکيا؟ اس نے وار وپی کے کبھی غصہ نہیں کیا جیسے آئے دن انیسٹری کیا کرتی تھی۔ نام اس کا ایڈتھ تھا مگر انیسٹری ہر کر رہ گیا تھا۔ وہ کھلے بندوں دار و کار خدا کرتی تھی۔ لالہ کو ڈٹ کر بخشش دیتی تھی۔ پولیس سے بھی ہفتہ مقروض تھا۔ کوئی اس کے منہ نہیں گتا تھا۔ کیونکہ وہ آئے دن دار و چرہ ماکر

انگریزی میں گایاں بکا کرتی تھی۔ کم سے کم چال والوں کا تو یہی خیال تھا۔ کئی بار بھنڈی میں  
آچک تھی، اور سرلاہیں کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے اس کی تیار پار لگائی تھی چال میں کئی  
آبرو باختہ عورتیں رہتی تھیں، مگر کسی کو طعنہ دینے اور اعتراض کرنے کی فرصت  
نہ تھی۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رنگ دیتی تھی۔

”توبہ! یہ کیا چال میں ہی رہے گا۔“

”اُدکیا؟ سامنے کے میدان میں تہمتی جائے گا۔ بمبئی میں تو بڑی بڑی شاہیں  
تہمتاں کے کی جاتی ہیں۔“ شبو نے فیصلہ کیا۔

”ہائے مزہ آدے گا۔ اپنی سرلاہیں دہس بنے گی۔ رام دئی کو شادیوں کا  
بڑا شوق تھا۔ وہ ہر موسم میں نئی شادی رچاتی تھی۔ کچھ دن بعد وہ لہاس کی ٹھکانا لکے  
کبھی کبھی کپڑے لٹے تک چرا کے بھاگ جاتا۔ ابھی پھیل شادی تو اس نے باقاعدہ کی تھی۔  
تہمتا خٹے میں بہت خرچہ آتا اس لیے بس کھولی ہی میں پنڈت روپے کی انگلیوں جیسا  
ہونے لے کر آگیا اور پھر بے ڈال دیئے۔ رام دئی خوب سچ کر دہس بنی۔ چالی پر عجیب  
عروسانہ موڈ چھا گیا۔ خوب سی مندی گھول کر سب نے تہمتی۔ ٹیسی بھا کر فلمی گانے  
گائے گئے رخصتی کے وقت جو ہاتھ لگ گیا رام دئی اس کے گلے لگ کر روئی ہائے  
میرا برن۔ ہائے میرا بیل، ہائے مجھے مت اپنی ڈیوڑھی سے نکالو۔“ وہ کسی  
فلمی سینی کی یاد میں چٹکھڑتی رہی۔ پڑاڑی نے تیز تیز آواز میں گراموفون لگا دیا۔ ”کاسے  
کو بیاری جیس،“ گو نہایت سرٹ چھپاتی آواز میں بے مدبے سری عورتیں گلو ہی  
تھیں مگر یہ کم نعت گیت ہی کچھ ایسا ہے کہ جی بھر آتا ہے۔ بیٹی کی رخصتی کا سال بھی  
عجیب ہوتا ہے۔ حالانکہ رام دئی رخصت نہیں ہوئی۔ اس کا بھینٹا دو لہا بھی بیاہ کر



چال ہی میں آگیا۔

کئی دن رام دلی شرمائی لچائی پائل بجاتی پھرتی رہی۔ پھر دوسرے اس کی چائی شروع کر دی۔ روز داری کر بڑیاں توڑتا جیسے بھر کے اندر اندر وہ اس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ لے کر بھاگ گیا۔ رام دلی تھوڑا سبائے کئی دن تک لنگھاتی ہی ہو اس کی جان کو کوستی رہی۔

ان تلخ تجربوں کے باوجود لفظ 'شادی' سے رام دلی کے دل میں لڑو پچھنے لگتے۔ اپنے علاوہ بھی کسی کی شادی ہو تو مضائقہ نہیں، موقع خوشی کا ہے۔  
ڈرتے ڈرتے سرلا بھی کو بھیڑا گیا۔ اور جب وہ ذرا جھینپ گئیں تو بس دھر گیا گیا۔

”سرلا میں بیاہ کر ڈالو۔“

”ہاں جی ہی عسر ہے کھینے کھانے کی۔“

”تمہارے ماما پتا کی آتا کو بھی شادی ملے گی۔“

”ہائے رام، ہم تو خوب پھل میٹھیں گے۔“

”چوک میں تنبو تے گا۔“

”دو لہا گھوڑے پر چڑھ کے آوے گا۔“

”سرلا میں گھونگھٹ کاڑھو گی؟“

”اے بھلا کیوں نہ کاڑھیں گی، کہیں پتا گھونگھٹ کے دھن بنی ہے حرام دلی

نے مائے دی، وہ اس لائن میں ایکسپریٹ مانی جاتی تھی۔

”ہائے چال سوئی ہو جانے گی۔“

”سعادت کی بہو کا بچہ کون جنائے گا؟“ ہر سال سعادت کی بہو کو سرلا بیج کی غذا کی ضرورت پڑتی تھی۔

”سوت نہ کیا اس کو کھو سے لٹھم لٹھا“ سرلا بیج چڑگئیں ”کس نے کھ دیا تم سے شادی بیاہ کا؟“

اسے ہے تو پھر مدد بس میں سیٹ کیوں دیتے ہیں؟“ سب تو خنثائی۔

”یہ تو ان کی بھل منہا ہمت ہے“ سرلا بیج نرمی سے مسکائیں۔

”اسے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، آج سیٹ دیتے ہیں۔ کل دل بھی دیں گے“

سعادت کی بہو نے گود کے کندھے کو کوسے پر ہنس کر فیصد کیا، اس پر سب چمک اٹھیں۔

ان پیاری پیاری باتوں سے سرلا بیج کی آنکھوں میں بھی خواب جھوم اٹھے۔

انہیں ان مدد تو، آبرو باخدا، عواذ عہد توں پر پیار آگیا۔ دل شکر گزار ہی کے احساس سے لرزہ ہو گیا۔

”اب کل بار مدد حکم اترنے کی ترشکایت نہیں“ وہ بات بدلنے کو ایک

دم نرمی سے بھی گئیں۔

”ابھی تک تو نہیں“ سعادت کی بہو منمنائی۔

”اور دیکھا بیٹھے، اب کے اگر کچھ لفظ اہوا تر کسم سے پریس میں دے دوں گی۔

لوپ کیوں نہیں لگوا لیتی“

”بابا وہ لوگ سہینڈ کا نام پوچھتے“ ایڑتھ بھنائی۔

”اینٹری صدیک بابو کا نام دیدے“ رام دلی نے مشورہ دیا۔

”بٹ، ہم کیتھولک ہے وہ ٹپا۔۔۔“

”تو سراجی کا نام دیدے“

”چپ رہو چڑیلو۔“ سرلا میں نے سب کو ڈانٹا۔ اور سعادت کی گرد کے

لوندے کو چپ کرنے کے لیے چچے بھر سیرپ اسے چٹا دیا۔

”دور ہو یہاں سے۔“

”پہلے یہ بتاؤ شادی کب ہوگی؟“ شہباز گئی۔

”ہاں تاہم تاریخ مقرر ہو جائے۔“ گلشنی نے مطالبہ کیا۔

”کس کی شادی؟ کیسی تاریخ؟ کوئی بات نہ چیت۔“ سرلا میں بگڑ گئیں۔

”بات نہ چیت، یہ کیسے؟ کیا دولہا گزنگا ہے؟“ تمقہ پڑا۔

ابھر سب نے بوکھلائی ہوئی سرلا میں کو سمجھایا کہ ان کی ڈھیل سے ہی یہ ٹھنڈا

ہوا ہے کہ ان جیسی گھونٹی کنواری جیٹھی ہے۔ مرد کی بات تو ٹھنڈا ہوتی ہے، جیتنگ

منہ میں تو اورد نہ ٹھونسو بات نہیں بنتی۔ سب سرلا میں کے بھی خفاء ہیں، دشمن نہیں کو

تو اپنی جانیں بھی تندرے لیے دے دیں۔ یہ چڑیا اب ہاتھ سے نہ جانی چاہیے۔

”کسو تو اس سے بات کرنے کو بولوں۔“ سعادت کی ہونے پوچھا۔

”اے ہم خود بات کرنے کو تیار ہیں ان سے کہ بابا لڑکی پسند ہے تو ایسا

بات کرو۔“ مگر رام دئی کی اس رائے سے سب کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسے مردوں کو

پھانسنے میں ملکہ حاصل ہے مگر کم بد بخت کو شادی کا چسکا پڑ چکا ہے، اگر امانت میں

خیانت کر گئی تو؟ نہ بابا رام دئی سے اللہ بچائے۔“

”دشاید بے چارے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ رعب داب کے کپڑے پہنے چنڈ

چڑھا کے جاتی ہیں وہ سوچتے ہوں گے میٹھی نظر سے دیکھا اور جوتے پڑے“  
 شبونے شخصیں کی۔

”کپڑے نئے کا اثر تو پڑتا ہے۔“

”ڈیروٹی کی اور بات ہوئی۔ پر یہ ہر گھڑی ڈاکٹر بنی رہ رہی ہیں۔“

”عصمت کو کچھ سنگار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے یہ کھڑا اس پر میک اپ

ہو تو قسم سے شری مان کے چھٹکے چھوٹ جائیں۔“

”اور کپڑے بھی بھر دک دار ہوں۔“

”بھتوڑا بہت تیل پھیل۔“

”ہاتھوں میں چڑیاں۔“

”کانوں میں آدیرے۔ پھر دیکھتے ہیں بابو جی کہاں جاتے ہیں۔“

سروا جین نے اس وقت تو سب کو جبر دک دیا، مگر سوچ میں پڑ گئیں۔ یہ دنیا

کا دستور ہے۔ بھٹی میں ایک سے ایک بھر دک دار عصمت گھومتی ہے۔ سونی،

سادھی عورتوں پر نظری نہیں نکلتی۔ جیسا موقع دیا بھیجیں۔

مگر ان کے پاس تو سادی سونے لکٹی کی ساتیاں تھیں۔ دو چار بد رنگ سی کٹاؤ کی

ہوں گی۔ گلے میں تانسی نہ خیر تو پڑی ہی رہتی ہے۔ اگرچہ اسے زیور کتنا زیادتی ہے،

ماں کی یادگار ہے۔

دلت کے شاٹھی میں ان کے دماغ میں رنگ برنگے کپڑے اور زیور تھرکتے رہے۔

”شاید بیاہتا ہے۔“ دوسرے دن شبونے فکر مند ہو کر کہا۔

”نہیں۔ یہ ہے تو نہیں۔“

”کیسے معلوم؟“

”بس میں کوئی دوست ملے تو پوچھ رہے تھے، مگر وہ ملا۔ وہ بولے، ہاں ملا۔

کہنے لگے اب شادی کر ڈالو۔“

”پھر کیا بولے؟“ رام دلی قریب کھسک کر بولی۔

”ہنسنے لگے۔“

جلو اور صر سے تو اطمینان ہوا۔ ذات کے تو ٹھیک ہیں؟“

”ہاں، بیگ پر رام سروپ بھٹاگر لکھا ہے۔ وہ تو پہلے ہی دلی دیکھ لیا تھا۔“

بس پھر کیا بات رہ گئی ہے جو ٹھال مشعل کر رہی ہو؟“

”منہ سے جو نہیں بولتے۔“

”کچھ میٹھی نظروں سے کہتے ہوں گے؟“

”نہیں۔“ جو کہتے بھی ہوں گے تو سر ہاں کے کاہے کو پتے پر پڑے گا۔

رام دلی ہوتی، ایٹھ ہوتی، شنبہری ہوتی، قوفٹ کچھ جاتی مدد میں بالو جی مٹھی میں جوتے۔

”ٹھنڈی سانس بھری۔“

”نہیں۔“

”توبہ! مرد واکوئی سی مٹی کا بنا ہے۔“ سعادت کی بیوی گرو گئیں بڑی کائیں

کائیں کے بعد ملے ہوا کہ سر لا جی دور اندیشی پر تیار ہوں۔ تیر تفنگ سے قیس ہو کر

منہ میں نوالہ دیں۔ تب ہی نیا پار لگے گی۔

بس اسی کلمہ عمدتیں اپنے اپنے ترکشوں سے سامان نکال نکال کر سڑو دیوی

کی لگ لگ کو پہنچنے لگیں۔ شبانہ کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا کام بھی لے لیتی تھیں۔ وہ وہاں سے نہ جانے کیا کیا اٹرم سٹریم لایا کرتی تھیں۔ ہنزلی میں اسنو تو سعادت کی بہو کے پاس بھی سال بھر پرانی پڑی تھی۔ ایڈتھ کے پاس تو تمام اسٹاک لیا ہوا کاسٹیک تھا۔ وہ ایک ہیئر ڈیسیر کو بھی جانتی تھیں اور خود بھی فٹ کلاس خیار سے نما اور نچے تو بنی جیسے بال بنا لیتی تھیں۔ اس کے پاس ایسے ایسے چھوٹے بڑے کپڑے تھے جو اگر کچھچی کو پرنا دو تو بت کا فریج جائے۔

بس سب کی سب مرمت پر جٹ گئیں۔ سرلاہیں نے بہت نا زحکی مگر شہب نے اپنی پیازنی ٹائٹلان جارجٹ کی ساڑھی، جس پر سیکورس کا کام بنا تھا انہیں پہنائی۔ بلاؤڈ پر بہت جھگڑا پڑا۔ شہب کو کتنی تھی تازہ ترین فیشن کے مطابق سرخ بلاؤڈ اور سرخ پچی گوٹ ہونا چاہیے، نیچے سے چمکا مارے گا اور لال ہی سینڈل ہوں تب آئے فرزہ، سرلاہیں نگوڑی کو نہ فیشن کا پتہ نہ میپنگ کے راز معلوم ان کے ہاتھوں میں کھیں رہیں۔

منہ پر پیلے کر لیں تھوپی گئیں۔ مع سعادت کی بہو کی ہنزلی اسنو کے، جو سوکھ چکی تھی، کیونکہ وہ برا مانے جا رہی تھی۔ پھر نوٹ اور پاؤڈر کے پیسٹر چڑھے خوب سا سیاہ سوت لے کر توہنی کی شکل کا جڑا بنا۔ پھر زیور کی باری آئی، اس پر خانہ جنگی ہوتے ہوتے بھی، ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اس کا چند زیادہ سے زیادہ ہو۔

جب اونچی اڑی کے کار چولی سینڈل پہن کر سرلاہیں بس اسٹاپ پر لڑاتی ہو گئی تو انہیں تو ان کی بغیر بینک کی آنکھوں میں ترسے ناپاچ رہے تھے۔ پیسے کے شرا سے چھوٹ رہے تھے۔

”دیکھا عورت ہونا کافی نہیں ایک نرالی میں اتنا اچھا چٹنی، مرتے کیوں لازمی ہے“  
ان کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔

اور پھر اس نرالی کو بچانے کے لیے ساری عمر کی گھس گھس۔

جب تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے سرلاہیں کو شتم شتم دایس لوٹتے دیکھا  
تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اٹ گئے۔ وہ بغیر دوا کے دنگاتی لرزتی چلی آ رہی  
تھیں۔ گالوں پر کاہل کی لکیریں بہاتی وہ گٹر میں گرتے گرتے بچیں۔

نرالی تنہو دکھ دیا گیا!

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ سرلاہیں سہالوں کی بوجھاڑ سے بے دم ہر کر پٹنگ  
پر گر پڑیں۔

وہ جب بس میں داخل ہوئیں تو وہ ان سے قطعی غافل اخبار پڑھتا رہا۔ وہ  
رکاب پکڑے سیٹ کے پاس کھڑی جھولتی رہیں۔ اور وہ بس کے دروازے کی  
طرف بار بار دیکھتا رہا، جیسے کسی کے چڑھنے کا منتظر ہو۔

انہوں نے نظروں کے سارے تیراس کے کچھ میں جھونک دیئے مگر وہ ان  
کی طرف سے نہ موڑے دروازے کو نہ گھٹا رہا۔

انہوں نے کانتا کی ملک میں بسا ہر گھلائی آنچل ٹوٹا دیا۔ مگر اس نے اخبار سے  
نظریں نہ اٹھائیں۔

انہوں نے ایک بھر پورا انگڑائی لی۔ مگر اس کی آنکھوں میں مستیاں نہ لہرائیں بس  
نے ایک پتھرائی ہوئی نئی نظر ان پر ڈالی اور ان کے دھوم دھڑکے کو بے اعتنائی سے  
ٹھکراتا ہوا اخبار پر جھک گیا۔

سامنے کی ایک سیٹ خالی ہو گئی اور وہ اس پر بڑھے گئیں۔ سارے تیر  
سننا تے ہوئے دار خالی دے لگے اور خالی ترکش لڑتا رہا، کا پتار ہا۔

ڈرتے ڈرتے انھوں نے اپنی سیٹ سے مڑ کر دیکھا، وہ بس سے اڑ کر  
جا رہا تھا۔ اترتے وقت اس نے بس اسٹینڈ پر دھندا چلا تے ہوئے ستوگرہ کٹ

سے پوچھا۔ ”کیوں رے پاچی آج سر لادیوی نہیں آئیں؟“

ستوگرہ کٹ ہکا تارہ گیا، اور اجنبی لمبے لمبے ڈنگ بھرتا سا منے گلے میں گم ہو گیا۔

(”فنی“ لاہور)



## پورا جوان

آنکھوں میں کامبل کی گھٹا، لب، لعل بدخشاں، گال ٹھابستان سرتا پا موسم بہار کی آمد آمد۔ یہ تھی مہندی، وہ کبھی بچپن کو الروداع کہتی دکھائی دیتی اور کبھی ہنس بچپن کے گلے لگاتی نظر آتی کبھی وادی شباب میں مجو خرام، اور کبھی طوفانی شباب سے بدلتی ہوئی سی لگتی۔ غرض یہ کہ وہ بچپن اور جوانی کی حدِ فاصل پر کسی بجلی ہونٹ ہرنی کی طرح وحشت زدہ سی رہتی تھی۔

سوہنے کو مہندی سے عشق تھا، مہندی کو سوہنے سے محبت تھی، لیکن سوہنا اپنی من موہنی کو نہیں پاسکتا تھا، اور مہندی اپنے من موہی کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

ان کے راستے کی چٹان کا بلا سنگھ تھا۔

ایک صبح سوہنے نے اپنے چچا کا گھوڑا مانگا اور منزلیں مارتا ہوا اٹھارہ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب وہ سائی والا نام کے گاؤں کے باہر کا بلا سنگھ کے کچی اینٹوں کے بنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ سوہنے کا اصل نام بلکار سنگھ تھا۔ لیکن وہ اتنا حسین تھا کہ لوگ اسے سوہنا (خوبصورت) کہنے لگے، اس کے عرصے نے علاقے کی حسین ترین لڑکی کا دل مرہ لیا تھا، لیکن اس کے باوجود کس قدر مجبور اور

بے دست دیا تھا۔

اس کا گھوڑا بے دم سا ہو کر نچتے پھڑپھڑا رہا تھا۔ پیسنے کی وجہ سے اس کی جلد گیلی نخل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ خود سوار کے چہرے پر پیسنے کے موتیوں کی بارش ہو چکی تھی، اس کا سرخ سپید چہرہ، جو ابھی باقاعدہ دایمیں اور منہ کیوں سے برہمی تھا، تھکایا ہوا تھا، اس کی تیز آنکھیں گھوم پھر کر کابلہ سنگھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے کہ اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ اُٹا پاتا پر چھتا وہ مکان تک پہنچ گیا مکان کے باہر کچے بچے کھیل رہے تھے۔ سوہتا کو معلوم تھا کہ کابلہ سنگھ کے تین بچے موجود تھے۔ لیکن اس نے بچوں سے ان کے باپ کے بابے میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کابلہ سنگھ کے پڑوس میں ایک سا، منہ نہ تھا۔ دسا ہنسی وہ لوگ ہوتے تھے جو کتوں کو ساتھ لے کر جنگلی بتوں کا شکار کھیلتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ وہ بتوں کو کھا بھی جاتے تھے! اس وقت ادھیر دھیر کا سا ہنسی اپنے صحن کی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھا حقہ گڑا گڑا رہتا۔ اس کے لیے بسے پٹاس کی گڈی تک پہنچتے تھے اور ان میں تین چوتھائی چاند کی شکل کا کنگھا پسنا ہوا تھا۔ سوہنے نے اس کے قریب پہنچ کر ابدو سے پڑوس والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کی کابلہ سنگھ اسی مکان میں رہتا ہے؟“

ساہنسی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے

جواب دیا ”آہر۔“

”وہ گھری ہے کیا؟“

”نہیں، صرف اس کے بچے ہیں۔ وہ بھی اب آتا ہی ہوگا۔“

ساہنسی کی بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور سنائی دیا، ساہنسی نے جتنے کی جتنے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”لو! وہ آگیا۔“

قریب آکر گھوڑا چک پھیریاں لینے لگا۔ دھول کے بادل بیلہ کر اس کی ٹاپوں کے نیچے سے نکل اُدھر اُدھر اڑنے لگے۔ اسی کیفیت میں سوار نیچے اتر پڑا۔ سوہنے نے اسے بغور دیکھا، اس کی عمر پالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سینہ چھاج کی طرح پھیلا ہوا تھا مگر کا حلقہ اب بھی مناسب حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ٹانگیں لمبی اور مستدل تھیں۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا۔ جیسے کسی نئی دوق صحر میں سورج ڈوبنے کے بعد تاریکی پڑ پھیلا رہی ہو۔ صرف آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ مجموعی اعتبار سے وہ ناگ راہ کی طرح حسین اور پرکشش تھا۔

کابلہ سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے اپنے اٹالے میں داخل ہو گیا۔ ساہنسی نے دور سے پکار کر کہا۔ ”کابلہ سنگھ! تم سے یہ لڑکا ملنے کے لیے آیا ہے۔“

کابلہ سنگھ نے اس کی بات بظاہر ہنسنی اُن ہنسنی کر دی۔ اس نے اٹالے کے کونے میں کھیرل کے نیچے واسے بانس سے بندھی ہوئی رسی کا پیندا گھوڑے کی گردن میں ڈال دیا۔ اس وقت تک گھوڑے پر سوار سوہنا اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

کابلہ سنگھ نے مکر سے چٹکا کھول کر اس سے اپنے جوتے جھاڑتے ہوئے پوچھ دیا۔ ”کونسیا بات ہے! کیسے آئے ہو؟“

”میں آیا تو تھا اترا کھڑا اترنے کے لیے۔۔۔“

کا بلا سنگھ نے اس کی طرف پیٹھ پھیر دی۔ اور کچھ رک کر بولا "تو؟"  
 سوہنا گھڑے سے اتر پڑا اور تیز لمبے میں کھنکھنے لگا۔ "لیکن مجھے چار پانچ سال  
 تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس وقت تمہارا گھوڑا توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"  
 "چار پانچ سال کے بعد کیا ہوگا۔؟" یہ کہتے ہوئے بھی کا بلا سنگھ نے اس کی  
 طرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔

اس کی اس بے اعتنائی سے سوچنے کا چہرہ ادھ بھی تھتا اٹھا اس نے کہا: "اس  
 وقت تک میں پورا جواں ہو جاؤں گا۔"  
 "یعنی بالغ ہو جاؤ گے۔"

سوہنا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ گھوڑے  
 سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں تم نے علاقے  
 بھر میں تھک چار کھانا اب بھی تہداری دھاک ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ تم  
 اپنی دھاک کا اس قدر ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں آتے۔"

کا بلا سنگھ نے اس کے گھوڑے کی کاٹھی پر گتھی ٹیک دی۔ اور اس کی طرف  
 سوالیہ نظر سے دیکھنے لگا۔ سوہنا اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا، اور اگلی بات کہنے کے  
 لیے مناسب الفاظ کی تلاش کرنے لگا۔

گھوڑے کی پیٹھ کے اوپر سے پرلی طرف کو تھوکتے ہوئے کا بلا سنگھ نے کہا۔  
 "چار پانچ سال کے بعد جب تم پورے جواں ہو جاؤ گے تو مجھے امید ہے کہ اس  
 وقت تہداری عقل اس قدر کچھ نہیں رہے گی۔"

سوچنے نے اس کی اس چوٹ کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ اسے تو صرف اپنی بات



کا بلا سنگھ بیان آپہنچا۔ وہ شادی کی بات کی کرنے آیا تھا۔

”تو بات کی ہو گئی؟“

”ہاں۔“ وہ چپک کر بولی۔

سوہنا سوچنے لگا کہ عورتیں بھی کس قدر طوطی چشم ہوتی ہیں۔ کیسی دلیہ دلیری سے بات کی ہو جانے کا اعتراف کر رہی ہے۔

وہ گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اور وہ لگام ہاتھ میں لیے دھیرے دھیرے چپا کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ہندری نے بیان جاری رکھا۔ ”میں گھر آگئی۔ تم گاؤں میں نہیں تھے اور وہ بات کی کرنے آپہنچا تھا۔ پھر بھی میں نے تم سے کام لے کر الگ سے کا بلا سنگھ کو سب کچھ بتا دیا۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی سمجھا دیا۔ اسے اس بات کا احساس کرا دیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی... کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دئے کہ تمہیں تو اور بھی لڑکیاں مل جائیں گی لیکن ہندری کو سوہنا اور سوہنے کو ہندری نہ مل سکے گی۔“

سوہنے کے قدم رک گئے۔ ”پھر؟“

ہندری بچکانہ چاؤ سے بولی ”سوہنے! وہ جتنا باہر سے تدا اور ہے اتنا ہی

قدما بھیت سے بھی نکلا۔ میری باتیں سنا کر وہ کچھ دیر سوچ رہا، پھر لولا کہ اسے ان سب باتوں کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میرا چاچا (باپ) اس کے پیچھے گیا۔ گھوڑے کی ایک رکاب میں پائوں جھا کر اس نے چاچا کی طرف دیکھا اور لولا۔ ”سرواجی! میں نے ہندری اور سوہنے کی شادی کی

کر دی ہے۔ اب آپ بیاہ کا انتظام کر ڈالیں تو بہتر ہے گا۔  
 سو ہنادم بخورہ گیا۔ ہندی بناس کی کیفیت دیکھ کر پوچھا۔ ”جب تم اس  
 سے ملے تھے، تو اس نے کچھ نہ کچھ تو بتایا ہو گا؟“  
 سو ہنادم کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ آکاش پر آکا دکاتا رہا  
 دیکھائی دینے لگا تھا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا ”نہیں۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا  
 موقع ہی نہیں دیا۔“

جب سے کا بلا سنگھ کی عورت مری تھی اس کے گھر کا کھانا ایک مری تیار کرتی تھی۔  
 کا بلا سنگھ کی عادت تھی کہ صبح داتنی منہ میں ڈال کر کھٹاٹے سے ایندھن کے لیے دو چیل  
 مکڑیاں پھاڑ ڈالتا تھا آج صبح بھی وہ داتنیوں میں داتنی دبائے اور کھٹاٹے میں کھٹاٹا اٹھا  
 احاطے میں پڑے ہوئے موٹے موٹے لٹھروں کی طرف بڑھا۔ اسے گھوڑے کے ہنسنے  
 کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کے اپنے گھوڑے کی آواز نہیں تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے  
 سو ہنادم گھوڑے سے اتر رہا تھا۔

کا بلا نے اس کی طرف سبب عادت توجہ نہیں دی۔ دونوں لٹھروں کی ہتھیلیوں پر  
 تھوک کر اس نے کھٹاٹا ہراس میں اٹھایا اور پھر کھٹاٹا لٹھے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے  
 دستے کو بلا جلا کر بھاری آواز میں کہا ”سو ہنادم معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک دلات ہی میں پرے  
 جمان ہو گئے ہو۔ مجھے چار پانچ سال تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔“  
 چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔

ایک دم سو ہنادم کی آنکھیں ڈھب ڈھب آئیں اور وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اں کا بلا سنگھ!  
 میں ایک رات ہی میں پورا جمان ہو گیا ہوں۔“  
 ”شع“ مری

# سردگی کی کہانی

LIE DOWN, LIE DOWN YOUNG YEOMAN,  
THE SUN GOES DOWN TO THE WEST.  
THE ROAD ONE TREADS TO LABOUR  
WILL BRING ONE HOME TO REST  
AND THAT WILL BE THE BEST

A. E. HOUSMAN.

یہ خزاں کی ایک پری اداس شام تھی۔ ہم تین دوست — احسان، اشتاد الحق اور میں مقامی میونسپل پارک میں ایک پنج پر بیٹھے درود پڑھ کر ہر امیں کھڑکھڑاتے اور اڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ باغ کے قطعے میں سونے کے تنکوں کی طرح ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ سورج ڈھب رہا تھا اور اس کی آخری انگلی ہوئی گزریں لیے درختوں میں سے چھپتی ہوئی ہمارے پنج پر اپنی مورتی ہوئی دیکھ پھینک رہی تھیں۔

شام کی اداسی ہمیں چھوئے گی۔ احسان اور میں ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ مقامی کالج میں سیکنڈ ایر کے طالب علم، اشتاد الحق ہم سے دو تین سال بڑا تھا اور ابی۔ اسے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔ ایک سینئر ہونے کی حیثیت میں ہم اسے قدیم اور عزت سے



دیکھتے۔ وہ ایک چھپرہ دار، رماز قامت، خوبصورت نوجوان تھا۔ صحیح معنوں میں جوانِ رعنا، تنگ سرخی کی لٹک لیے، آنکھیں نشیل اور بڑھی، مستوں جاک، تعلیم نیچے دکھڑی، وضع میں کانوں کی ٹوٹک آتی ہوئی۔ ہم کالج میں آکر پتلوں کوٹ پہننے لگے تھے مگر شاد الحق ہمیشہ اپنی اچکیں اور پچھے خصلے کی پگڑی اعداد اپنے گاؤں کے مچھی کی سلی ہوئی طے کی جرتی میں چلتا نظر آتا۔ وہ سچ سچ کراہیک شاہزادے کے وقار سے چلتا اور فی الواقع کمانیوں کا شہزادہ لگتا۔ اسی جیسے جوانوں میں سے ایک جن کے لیے لڑکیاں آہیں بھرتی ہیں اور غمِ محبت میں جلتی ہیں۔ شاد الحق ایک مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔ ہاں اسے اپنے آپ سے کچھ محبت تھی۔ اور اٹھتے ہوئے شباب کے کس لڑکے کو نہیں ہوتی؟ اس کی باتوں میں واقعی پھولوں کی سی باس تھی اور ایک موہنے والا سجادہ اور زندگی کا سوز و ساز۔ اور جب وہ موج میں ہوتا تو اپنے ہوسٹل کے بستر پر لیٹا پیروں ایسی باتیں کرتا کہ تہتا جو سننے والے کے دل کو مسحور اور بے چین کر دیتیں۔ وہ ہر طبقے اور ہر عمر کے شخص سے آسانی سے گھل مل جاتا اور اسے اپنا دوست بنا لیتا۔ احسان اور میں ابھی معصوم لہڑکے تھے شاد الحق نہانے کا سر درگرم چشمیدہ تھا اور وہ ہمیں اپنے انسانی نفسیات کے وسیع علم سے شستہ کر دیتا۔

اس شام وہ بالکل خاموش تھا اور ہوسٹل سے یہاں تک چلتے ہوئے اس نے ایک بھی بات نہ کی تھی۔ اس خاموشی پر ہم نے کرنی تو جہنم دی۔ اس کی بستر میں گھٹکوں کے فوڈ سے ہوسٹل کے کمرے میں اس کے بستر پر سے چھوٹتے تھے اور باہر چلتے ہوئے وہ اکثر چپ ہو جاتا اور کسی گھر سے خیال میں کھو جاتا۔ پھر اس کی زبان کی بجائے اس

کی بڑی بڑی آنکھیں کام کرتیں اور وہ ایک پیدائش جاسوس کی طرح زندگی کی ہنگامگی کو چپکے سے دیکھتا رہتا۔

احسان الہ دونوں اس منزل میں متعجب کسی کی محبت میں گرفتار ہونے کے لیے جی بے قرار ہونے لگتا ہے۔ دراصل اس عمر میں ہماری انگلیں سچی اور بے باک نہیں ہوتیں اور ہمارے جذبات خود اپنی ہی خات میں سرگزر ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بے مثل سمجھتے ہوئے ایک اپنی خود رومی سے خدا کی دھرتی پر پھرتے ہیں۔ احسان نے کالج کی لائبریری میں آسکر وائلڈ کی کہانیوں کی ایک کتاب لے کر پڑھی تھی اور یہ مثلاً دینے والی میٹھی جذباتی کہانیاں اس کے دماغ میں تیز شراب کی طرح چڑھ گئی تھیں۔ ”آسکر وائلڈ سب انگریز ٹکھنے والوں میں میرا محبوب ہے۔ اودہ! اس کی ”ڈمی پرفمنس“ اور — وہ ”گلاب اور بیل کی کہانی“ — احسان بولا۔

وائلڈ تجھے ان دنوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ جھوٹے جذبات اور ذہنی خلع جلالت کی ظرافت جو جلدیاسی ہو جاتی تھی۔ وہ میری پسند کا مصنف نہ تھا اور میں احسان سے اس معاملے پر جھگڑنے لگا۔ احسان نے کہا کہ تم محبت کے جذبات سے کبھی آشنا نہیں ہوئے اور اس لیے آسکر وائلڈ کی خوبصورتی کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس پر ہم میں چرخ ہو گئی اور ہمد سے مزاج برہم ہو گئے۔

شمار الحق اس دوران میں اپنے پاس راہ طریق پر سکھانا رہا۔ میں جاننا تھا کہ اس کا دماغ آسکر وائلڈ اور ہماری بحث سے ہزار میل دور ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس نے وائلڈ کو نہیں پڑھا تھا۔ اداگر طرعاؤں کو چڑھتا بھی تو بھی اس سے کچھ حاصل نہ کرتا۔ وہ کتابوں کے زیادہ پڑھنے پر یقین نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ٹیگور کی گیتا انجلی

کے انگریزی ترجمے کو اس نے بیسیوں بار پڑھا تھا اور اس کے کئی بند اسے  
ازیر تھے۔

جب احسان اور میں خوب لڑ چکے تو ہم برہمی کے انداز میں ایک دوسرے  
کو بر قوت سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے  
خلاف شدید نفرت تھی اور آنسو تقریباً ہماری آنکھوں میں ر کے ہوئے تھے۔ شام  
اب گہری مرنے لگی تھی اور نیلا جھٹ پٹا درختوں کی چھتری ویران ٹہنیوں میں پھیلنے  
لگا تھا ایک چھپاکی باغ کے کونے میں سے بولنے لگی ”تو دت۔ تو دت۔“  
شنادالحق نے کہا ”کیا تم ایک سچ سچ کی کہانی سنو گے؟“

”ہاں! ہاں!“ میں نے کہا۔ ”سنناؤ“

احسان کا چہرہ بھی چمک اٹھا ”شنادالحق ضرور سناؤ کہانی“

شنادالحق نے اپنی بڑی آنکھوں سے دُرد درختوں کے دھندلکوں میں دیکھتے  
ہوئے کہا۔ ”اچھا سنو یہ کسی کتاب کی کہانی نہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں ہے  
جو آٹھ سو سال پہلے اور نے گھڑایا لکھا ہو۔ یہ ایک عام انسان کی کہانی ہے جسے قدرت  
نے خود اپنے قلم سے اثراتی ہر اٹوں میں لکھا۔ اس میں ایک سادگی اور سادگی ہے  
اور یہ ہر ایک کی کہانی ہو سکتی ہے۔ تمہاری یا میری۔ تم کہو گے کہ ہمارے مزاج  
اور طبیعتیں اور شمارے مختلف ہیں مگر حقیقتاً ایک ہی نوع کے حادثات ہم سب  
کو پیش آتے ہیں اور وہ ایک ہی سڑک ہے جس پر ہم اپنی منزل کی جانب سفر  
کرتے ہیں۔۔۔۔۔“

شنادالحق کچھ رکا۔ گھر سے استغراق میں احسان اور میں ہر تہی گوش ہو گئے۔

باغ میں اب مکمل سناٹا تھا۔ گاسے گاسے پتروں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی  
جھینگ امدادات کے دفین کیڑے اپنی مدھم مستقل الاپ سے سناتے کو معمور  
کیے ہوئے تھے۔

”غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے“ شنار الحق بولا۔ ”میری عمر اس وقت کوئی  
ساتھ سے پانچ برس کی ہوگی۔ میرے والدین دونوں خجاج آباد میں نائب تحصیلدار  
تھے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کی رخصت ضرور لیتے امداد سے اپنے آبائی گاؤں کھولہ  
میں گزارتے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک دہقان سفید پوش کی طرح۔  
میری چاند پیٹھے اعلیٰ کی چادر باندھے گاؤں کی گلیوں میں چلتے اور اپنے  
چوبارے کی بیشک میں دیہاتیوں کے سکے سسکی سمجھاتے۔ خجاج آباد میں تو  
وہ بالکل رعب و لب والے سرکاری افسر ہوتے۔ ہمیشہ جامہ زیب، چست امد  
کوڑے کی طرح کرکدار۔ یہاں گاؤں میں اگر اپنے قربت داروں امد عزیزوں کے  
ساتھ وہ بالکل بدل جاتے۔ ان کا ہی جیسا سادہ لباس پہنتے اور ویسی ہی پر سکون  
دیہاتی زندگی گزارتے۔ نائب تحصیلدار کی فن ناں اور ٹیپ ٹاپ خجاج آباد  
میں ہی رہ جاتی۔ میرے دادا تب بقیہ حیات تھے۔ ان کو ہمارے آنے کی اطلاع  
ہوتی امد جڑا کر یا نہ کے چھوٹے پانچ لائن دیڑھے اٹیش پر سدا کی کے لیے  
گھوڑیاں پہنچ جاتیں مجھے یاد ہے کہ گھوڑیاں سواریوں سے کہیں زیادہ جرتیں۔  
تب سائیکل ابھی دیہات میں نامعلوم تھا۔ ایک مجبور۔ کوئی کام کی سڑکیں بھی نہ  
تھیں۔ ہر ایک گھر میں ایک دو گھوڑیاں ضرور جرتیں اور بیشتر لوگ ان پر ہی  
اپنے کاموں پر آتے جاتے۔ ریل پلیٹ فارم پر کھڑی جرتی تو راسی امد کی ڈبے

کے پاس دوڑے آتے۔ ہم بچوں اور سامان کو اتارتے۔ گھوڑیاں ہنستا ہی ہوئی مسافر خانے کے باہر بندھی جوتیں اور سامان کے لیے ایک دو فخر جتنے بڑے گدھے ہوتے۔ میرے دادا کی ایک گھوڑی تھی۔ ہدف کی طرح سپید۔ اسیرانہ خوبزواں۔ بڑی نخری اور آتشیں مزاج۔ وہ اس کی لاٹھلی تھی۔ اس کا نام سادی تھا۔ میرے والد اس پر بیٹھے۔ آدھ گھنٹہ گتوں میں بھٹ ہوتی کہ کوئی گھوڑی اسیل ہے اور کوئی کھجوری۔ اور جب ہم سب اسیل گھوڑیوں پر کسی ہوئی ویسی کاٹھیوں میں بیٹھا دیئے جاتے تو گاؤں کی سمت لیے اور آہستہ سفر کا آغاز ہوتا۔ سوائے سادی کے ہر ایک گھوڑی کی باگ آگے آگے چلتے ہوئے کئی کے ہاتھ میں ہوتی۔ کھوہار جوڑے سے چار پانچ کوس ہے مگر اس سفر میں کوس ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ دوپہر کے چلے ہم کھوہار میں گری پڑے پہنچتے۔ جب تنگ کاٹھیوں میں بیٹھے بیٹھے ہماری کمریوں دو دہانے گتیں اور کمرے چھلنی ہونے لگتے تو یہ چھوٹا قلعہ مستانے اور ٹانگیں میدان میں کھینے کے لیے سڑک کے کنارے رک جاتا۔ اس کافی خوفناک سفر کی کچھ تلافیاں بھی تھیں۔ ڈلیانی سے آگے گزرتے ہوئے ہمیں پتی کی ٹپلی پہاڑیاں نظر آتے گتیں اور ہمارے دل اچھلنے لگتے۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے ایک عجیب مسوت میرے دل کو گرفت میں لیتی۔ دوستوانم کیا جانو مرے دیس کی پہاڑیاں کتنی خوبصورت ہیں۔ دنیا میں ایسی پہاڑیاں اور کہیں نہیں جیسی یہ پتی کی پہاڑیاں۔ بعض دفعہ اس سفر میں حادثے بھی ہو جاتے کسی گدھے کی تنگ ٹو جھیل ہو جاتی اور اس پر دھرے ہوئے کبے اور ٹوکے نیچے سڑک پر پڑ چکے گرتے۔ تنگ کو کہنے اور اس پر پھرے سامان جمانے میں آدھ گھنٹہ لگ جاتا اور ایک بار تو وہ گھوڑی جس پر

میرا بھائی اور میں دونوں سوار تھے، بڑی کچھری نکلی۔ میرا بھائی آگے لگام پکڑے بیٹھا تھا، رکن خوشامدوں سے ہم نے فوری سیرانی کو تیار کیا تھا کہ وہ لگام ہمیں پکڑا دے۔ میں اس کے پیچھے ہاتھ میں ایک چابی سے چلنے والے انجن کو پکڑے بیٹھا تھا۔ یکھنت گھوڑی بد کی اور گھٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں تو دھکا لگنے سے نیچے زمین پر آ رہا۔ اسی طرح چابی والے انجن کو ہاتھ میں پکڑے۔ مجھے تھوڑی دیر کے بعد ہی پتہ چلا کہ میں گھوڑی سے گر گیا ہوں اور پھر میں دوسرے لگا جھلا کہ مجھے ذرا بھر بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ میرے بھائی کو گھوڑی کو دتی پھلانگی دو کہیستوں میں لے گئی اور ابھی ایک کنوئیں کی منڈیر پر جا کر ایسا اس کی پیشانی بھٹ گئی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔

مگر اتنی صعوبتوں کے بعد جب ہم کھوہار میں اپنے آبائی مکان میں پہنچے تو کیسی آؤ بھگت ہماری منتظر ہوتی۔ گھر کے سب دیے روشن ہوتے اور بچے دروازے میں ہماری داد دیں، خالائیں اور پھر بھیاں چمکتے چہروں سے ہماری بلائیں لیتیں۔ ڈیوڑھی سے گزرتے ہی دیوار کے پاس ادھول کی آگ پر پتیل کی منگی میں دودھ ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا۔ ہماری دادی ہمارے پہنچتے ہی ہمیں کڑھے میٹھے دودھ کے گلاس پلاتی۔ ہمارے باپ کی گردی میں ہاتھ ڈال کر وہ اس کی پیشانی کو چومتی اور خوشی اور محبت سے رونے لگ جاتی۔ وہ بوڑھی اور کبڑی تھی مگر اس کے خدو خل چمٹے اور تیکھے تھے اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ وہ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت عورت تھی۔۔۔۔۔“

”ا“ شادالہو نے ایک ٹنڈا اسانس بھرا۔۔۔“ میں کھوہار میں کبھی گرمی

میں گیا تھا اور وہ گھر وہ گھر نہیں رہا جسے میں اپنے بچپن میں جانتا تھا۔ اب کے دیے میرے جانے پر نہیں چلے اور آباؤں حویلی تیار اور شکستہ حالت میں تھی۔ صرف ہمارا پرانا میراثی نور علی وہاں طویلے میں اپنی کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ خیمہ اور لنگے جیسے سفید بالوں کے ساتھ۔ اس کی ٹھکریں اور مخولی بھی اب وہ نہیں رہے۔ میں بعض دفعہ سوچنے لگتا ہوں کہ وہ سب اچھے مہربان چمکتے ہوئے محبت کرنے والے چہرے کہاں غائب ہو گئے۔ سب چلے گئے۔ وقت کے دھندلکے ہیں۔

شنا دا لہجہ اب خاموش ہو گیا، شاید گئی گزری چیزوں اور بستیوں کو یادوں کے پردے پر دیکھتا ہوا۔ ایک بڑا زرد سا چاند درختوں کی اوٹ میں سے طلوع ہو رہا تھا اور اپنی آبیسی و مکا ہٹ سے ٹہنیوں اور پتوں میں ضیا پاشی کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور زرد پائے خزاں کے پتے ہماری طرف تیرتے ہوئے آئے۔ میرا دماغ غیر حاضر ہو جاتا ہے اور میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہوں۔ ”شنا دا لہجہ بولا میں کیا کہہ رہا تھا؟“

احسان اور میں مسکرائے۔ یہ ہماری دوست شنا دا لہجہ کی پرانی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ایک واقعہ بیان کرنا شروع کرتا اور پھر بات سے بات نکل آتی اور وہ دور بھٹک جاتا۔ یوں اصل واقعہ کا سرا رکھ دیا جاتا اور ہم اس کی ان طولانی ”ڈائی گریشنز“ (DIGRESSIONS) ہی کی وجہ سے اس سے محبت کرتے تھے۔ اگرچہ ہم بھی کسی بھی غیر حاضر دماغ اور نیم خوابیدہ سے ہو جاتے اور قطعاً بھول جاتے کہ وہ ہمیں اصل میں کونسا واقعہ بتانے چلا تھا۔

”بہت جلد ایک ٹون“ میں نے کہا ”سات ابھی جوان ہے۔ ویسے تم





میری پھوپھی بولی: ”دس دن اسے اس آفت دا... پر میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ اس کا مرد اللہ وار پچھلے سال چھٹی پر کب آیا تھا؟“

بھاگ بھری مصنی نے کچھ سوچ کر حساب لگایا۔ ”چدھرائی، مجھے تخت پرٹنا ہے کتے پوہ میں۔ وہی حیت تھا جب ہڑھ آئے تھے ادا یاد ہے مصلیٰ کا کوٹھارہ لٹھ گیا تھا۔ اس جیسے تو چدھرائی رانی!۔ ہماری گائے کا لے سانپ کے ڈسنے سے مر گئی تھی۔ یہ سنو بجو جب بھی گاؤں میں قدم دھرتا ہے کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے“

”کتیں۔ تو کتنے جیسے ہو گئے؟“ میری پھوپھی انگلیوں پر گننے لگی۔ ”ہس بھاگ پڑھیا اے۔ چار اوپر دس جیسے ہوتے ہیں اور بجو یہاں کوئی پندرہ میں دھاڑے رہا۔ ہائے نی بھاگ۔ یہ جاگ ہو کیسے گیا۔ پہلی وار بچے کو چار اوپر دس جیسے پیدا ہوتے سنا ہے۔ مرد کے بغیر جاگ! پاچی شرھو تو دوسری حضرت مریم ہو گئی.... تو بہ تو بہ!“ میری پھوپھی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”ہائے نی چدھرائی“ مصنی نے ناک پر انگلی دھری۔ ”میں نے تو یہ سوچا ہی نہ تھا۔ مگر چدھرائی۔ شرھو کے پاس اور کوئی مرد گیا ہوگا؟ مردوں کا تو اس سے بول نکلتا ہے“

”چپ کر رہو۔“ میری پھوپھی منہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”پل شرھو سے جاگ نروں دیکھ آئیے“

وہ جانے لگیں تو میں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ ہو گیا۔ ایک بچے کی پیدائش گاؤں میں ایک اہم واقعہ ہوتا ہے۔ ماسٹر بھر میں سوچتا رہا کہ پھوپھی کا رنوں کا حساب لگانے سے کیا مطلب تھا اور مرد کا عورت کے پاس جانے سے بچہ کیسے پیدا ہوتا

ہے۔ ان دنوں مجھے پراعتیق تھا کہ بچے آسمان سے گرتے ہیں۔ جب بھی میں اپنی ماں سے پوچھتا کہ میں کیسے پیدا ہوا تو وہ پراسرار طریقے پر مسکاتی اور کہتی: ”لال بھی نہیں ہزار بار بتا چکی ہوں کہ تمہاری بوڑھی دائی مائی پیماناں تھیں اپنی گود میں مٹائے آسمان پر سے ہمارے گھر میں کود گری تھی۔“ ہمارے بعض بڑے مجھ سے اکثر سنجیدگی سے کہتے کہ مجھے میرے باپ نے معنیوں سے پانچ دس روپے میں خریدوا ہوا ہے۔ ان بیانات میں تضاد مجھے حیران سا کر دیتا۔ پیدائش کا مسئلہ مجھ پر تب کھلا جب میں کافی بڑا ہوا تھا۔ تم یقین کرو نہ کرو۔

ہم چھپر کے پاس شریچو کے کوٹھے میں گئے۔ وہاں کالے رنگ کے تہبند اور کالے کرتوں میں گاؤں کی بہت سی عورتیں شریچو کے جاتک ہونے کی خبر سن کر آئی ہوئی تھیں۔ ایک ایسے پوتے کمرے میں جس میں سب دیہاتی کوٹھنوں کی طرح ایک طاق پر تانبے اور المونیم کے چمکتے دھکتے برتن ایک دوسرے کے اوپر جمے تھے، شریچو ایک کھاٹ پر بیٹھی پھٹے ہوئے کپڑے میں پیٹے اپنے بچے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ شریچو ایک چوڑے ہڈ کاٹھ کی غونٹاک عورت تھی۔ تو سب کی طرح کالی بھوت۔ موٹے اور بھدے سے خد و خال ابد بال کھلے اور پریشان۔ وہ زیادہ غفلتوں کی عورت نہ تھی اور جب وہ بولتی تو اس کی آواز کی کرختی ایک کوڑے کی طرح لگتی اور اس کی ہسائیں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتیں۔ سب اسے اس کی کٹھنی کیسی زبان دمازی سے ڈھتے ہوئے اسے اس کے مال پر ہنسنے دیتے اور اس طرح اس سے بچتے جیسے وہ طاعون ہو۔ اس کے خاوند بھو اللہ داد نے اس کی بدکلامی اور درشت مزاجی سے تنگ آکر لاہور میں چھکے

سے ایک اور شادی کر لی تھی اور ہر کوئی گستاخا کہ اس نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ کوئی ما  
مرد ایسی عادت کے ساتھ زندگی بھر نہا کر سکتا ہے۔

شریچو نے کوئی پٹی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور بچے کو دودھ پلانے  
میں مشغول رہی۔

میری پھر بھی نے کہا ”شریچو! جاگ کی مبارک ہو۔ چن جیسا ہے۔ مثلاً اللہ۔  
اس کے باپ کو اطلاع دے دینی تھی“

شریچو نے جل کٹ کر اپنے خاوند بھو اللہ داد کو ایک موٹی سی گالی دی۔  
”داد سے مار ڈھی لگیا۔ وہ اس بھون حرامزادی لاہورن کے ساتھ جھک مار  
رہا ہے اور اس کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ چٹی مار ڈھی اور آٹا خراب۔ اس بھون کے  
گھٹنے جھوڑ کر وہ کیوں آئے گا۔ یہاں آئے تو سی وہ کبھر۔ جی اس کے منہ پھتر  
نہ ماروں تو شریچو نام نہیں“

لیکن شریچو۔ آخر وہ اس کا باپ ہے۔ اسے چھٹی تو کھھا دو۔ ”میری پھر بھی  
نے کنگھیوں سے مصنی بھاگ بھری کو دیکھا۔

”چھٹی کھھا سئے میری جوتی“ شریچو بول اور گالیوں اور پھکڑوں کی ایک  
ندی اس کے موٹے مونٹوں سے نکلی۔ دو تیس عورتیں تو بہ قہر کرنے لگیں۔

پھر بھاگ بھری مصنی سے نہ رہا گی۔ وہ گھٹنے لگی۔ اس نے بوجھا۔ ”تی سرفراز  
بلیگم اللہ داد پچھلے کتے میں آیا آٹا“

شریچو کھلا کر اٹھی اور چیخنے لگی۔ ”بھونے۔ تیرے داد سے مار ڈھی لگیا۔ تیرے  
خضم کو چرے جائیں۔ میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔ تو میرے بچے کو حرامی بتاتی ہے۔

تو حرامی، تیری بے بے حرامی۔ تیری سات پیڑھیاں حرامی۔ وے اسمعیل۔ اس  
 پڑیل کو بتا۔ تیرا باپ کتیس کے بعد پوہ میں رات کی رات مجھ سے معافی مانگنے  
 آیا تھا یا نہیں اور جاتے ہوئے میں نے اس کی کیسی گت بنائی تھی۔ تو مجھے نہ پکڑتا  
 احد بیچ میں نہ پڑتا تو میں اس کی مارٹھی کا بال بال نوچ لیتی امد وہ اس بھون لاہرہ  
 کے پاس کھو دا کھسرا بن کر جاتا۔ وے اسمعیل تو نے اپنی بے بے کو اس دلی پکڑ  
 کر بڑا غلم کیا۔“

اسمعیل بچو اللہ داد کا بڑا کوئی سترہ سال کا ایک اکھڑ، ہونٹ ساڑ کا تھا۔  
 کچھ کچھ باؤ لا امد بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔

اسمعیل نے کہا ”چا چا پوہ میں آیا تھا امد بے بے کو میں نہ روکتا تو وہ اُس کی  
 جہ بچہ کہانی کر دیتی ....“

شریبو نے پھر سعلی امد سب عورتوں پر ایک نفرت بھری نہ ہر بی، بھلا  
 دینے والی نگاہ ڈالی۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ موہی جو دیں آئے ہیں۔ بروہوں  
 والی مسجد کا امام میان غوث محمد اندر آیا۔ وہ ایک امام مسجد کی بجائے ایک کڑیل  
 دمقانی چھیرہ لگتا تھا امد اس وقت بھی ہاتھ میں ایک گڈریئے کی لاسٹی لیے ہوئے  
 تھا۔ میان غوث محمد کی عملیت کی سادے گاؤں میں بڑی دھاک تھی۔ اسے  
 پکی روٹی کے سادے شعرا زہر تھے۔

غوث محمد نے لاسٹی کھٹکھٹاتے ہوئے اپنے کرخت دیہاتی لہجے میں عورتوں  
 کو ہٹنے کے لیے کہا۔ ”گڑا یو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ شریبو۔ اللہ کی تم پر رحمت  
 ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں“ اور اس نے پنجابی کے کچھ اشعار بچوں کی

برکت کے بارے میں پڑھے۔ ”ابھی اس کے کان میں کسی نے اذان تو نہیں دی؟“  
شریچھو نے کہا۔ ”مولوی جی۔ آپ کے سوا اذان کون دیتا ہے۔“

”بھئی“ مولوی غوث محمد رینگا ”حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں پہلی آواز کلمہ کی جانی چاہیے۔۔۔۔۔“  
مولوی غوث محمد نے نوموود کے کان میں اذان دی اور اذان سے فارغ

ہونے پر شریچھو اٹھی اور بھڑولی میں سے ایک رومال میں دو روپے مولوی کو  
گزارانے۔ اور مولوی غوث محمد کچھ مزید مٹھے مسائل سمجھا کر اور دو تیس طلبہ  
کے سروں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد چلا گیا۔ اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرے  
اور میری چھوٹی کے ایک دو پر شریچھو کی ہتھیلی پر رکھنے کے بعد ہم گھر کو لوٹے۔  
مجھے واپسی پر اپنی چھوٹی سے یہ پوچھنا یاد ہے کہ اگر بچہ آدمی رات کو آسمان  
سے گرا تھا تو وہ چھت میں سے کیسے شریچھو کی گود میں آگیا۔

”شاد دل۔ کیا الٹ پلٹ سوال تم پوچھتے رہتے ہو“ میری چھوٹی نے کہا۔  
”جب تم بڑے ہو گے تو تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔“ اور اس نے بھاگ بھری  
مصطفیٰ کو کہنی ہدی آٹکھ میں شرارت لیے ہوئے۔

”میری چھوٹی چھوٹی ایک منہس کھ لاٹا بی طبیعت کی عورت تھی۔ زندگی کی  
رنگینی اور کھیل کود سے محروم۔“

شاد الحق پھر کچھ دیر کے لیے گم سم ہو گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ شریچھو  
کے اس بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ یہ بچہ یہ خبر بھی بھاگ بھری مصطفیٰ نے آکر دی۔ یہ  
نام بچے کے نانا بوڑھے اور درشت کلام رضی اکبر نے تجویز کیا تھا جو ایک پیشوا زادہ

معلم تھا ادب اب کھو ہار کے دیہاتی ڈاک خانے میں ٹکٹوں کی فروخت اور ڈاک کی ترسیل کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔ سب پرسٹ ماسٹر اس کے عہدے کے لیے کچھ زیادہ ہی ادھیچام ہے۔ اسے اس کام کے لیے ڈاک کے ٹکے سے صرف پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ وہ گاؤں مالوں کی چٹیاں لکھ کر کما لیتا۔ سب کیریکٹر تھا۔ کڑوا اور نہ ہر ملا، اپنی بیٹی شریلو کی مانند۔ اس کا ایک بیٹا جس کا نام عبداللہ تھا اور اہل شباب میں قوت ہو گیا تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اپنے نواسے کا نام بھی عبداللہ رکھا۔

تجوا اللہ داد بچے کی پیدائش کے کوئی تین چار دن بعد گاؤں آیا۔ غالباً اس کے خسر نے اسے پرسٹ کارڈ سے اطلاع دے دی ہوگی۔ اسے دیکھ کر اس شخص کو داد دینی پڑتی تھی جس نے پہلے پہل اسے تجوا کا لقب دیا تھا۔ یہ نام اس پر ٹوٹی کی طرح فٹ بیٹھتا تھا۔ میں نے اسے گاؤں میں کئی بار دیکھا ہے اور ایک بار اس کے ہاں کسی کام سے لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ بوبو بوجو کی شکل — بوٹے غدو غل کا ماتمی چہرہ۔ صندی سے رنگی بوسیدہ واٹھی۔ سر پر کھڑکی دار میلے چمکٹ کلاہ پر بندھی پگڑی اور بدن پر ایک پرانی دقیا نرسی اچکن پہنے جسے اس نے کئی برسوں میں تبدیل کیا تھا۔ اس کی ساری ذات گرم خورہ تھی۔ جب میں لاہور میں دل محمد روڈ پر اس کے بانگنی والے غلیظ مکان پر اس سے ملا تو اپنی دوسری بیوی سے اس کا ایک بچہ بوجکا تھا اور گھر میں اس کی حیثیت ایک بچے کو کھلانے والی دانی کی تھی۔ مجھے بھی پارے بچو پر رحم آیا اور اسے بچے کو ہاتھوں میں لے دیے ہوئے دیکھ کر ہنسی بھی — آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا.....

”میں تمہارے کان کیسے نہ لگا ہوں شہناز الحق۔“ میں نے کہا۔

”شہناز الحق ہنسنا۔۔۔۔۔“ ہاں بھگوان کے گاؤں میں آنے اور شریچھ کے استقبال کا منظر ایسا تھا جسے گاؤں والے برسوں میں نہیں بھولے۔ مصطفیٰ بھاگ بھری خود وہاں موجود تھی۔ بچو ایک بھوری سریل گھوڑی پر سوار کچی سڑک پر شیخ شیخ آتا تھا گاؤں سے گھوڑے غاصلے پر شریچھا سے ملے۔ وہ اپنے گدھے پر بیٹھی ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے بوٹیوں میں سے ٹکڑیاں کاٹنے جا رہی تھی۔ وہ اس سینے کا قصور کرو۔ بچو کا چہرہ اپنی خوفناک بیوی کو آتے دیکھ کر فٹ ہو گیا اور اس نے باگ مڈر درختوں کی امٹ میں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن شریچھ اس کے سر پر اپہنچی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیے۔ روکے بال پھیلائے وہ گدھے پر سے پھیلاٹک کر اتری اور سڑک کے بیچ گھوڑی کے رستے میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ بچو کے لیے بچنا مشکل تھا۔ اس نے موت اپنے سامنے رکھی۔ شریچھ نے کلہاڑی کو بڑے وحشیانہ طریقے سے ہلایا اور موٹی گالیوں اور لعن طعن کی ایک نہ ختم ہونے والی بوچھاڑ اس کے موٹے ہونٹوں سے چھوٹی۔ اس منظر کو دیکھنے والے اس عمدت کی ندرت و مافی پر حیران ہو گئے اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ یہ عورت کوئی انسان کی بچی نہیں تھی یہ تو کوئی چڑیل تھی۔

”داوے واڑھی گیا۔ بچو اکھوہ دیا۔ خدا تیری بیٹیوں میں وٹے ڈالے۔“  
 تو نے مجھ پر سوکن ڈالی ہے؟ میرے گھر کی چوگھٹ کے اندر قدم تو دھر۔  
 تیری بوٹی بوٹی نہ کروں تو میں رضی اکبر کی وحی سرفراز نہیں۔۔۔۔۔“  
 بے چارے بچو نے کچھ دیر تو یہ صلواتیں سنیں۔ پھر اپنی جانی کو خطرے میں

دیکھ کر اس نے گھڑی کا ڈنگا کر بھاگ دیا اور شہر چھوڑا اپنے گدھے پر سوار ہو کر اپنے  
خفے پاؤں نیچے لٹکانے اپنے فلور ہوتے ہوئے خاندان کے پیچھے گئی۔ گایاں  
اعدہ جسے بکیتی اور اپنے چوٹے سروں کے سے بیسنے پر دم مڑتا رہتی، اعدہ نے خیال  
تو چننا۔ اس طرح بھراؤ اس کی بیوی گاؤں کی لگیوں میں سے گزرے۔ اور جس کسی نے  
بھی دیکھا بعد میں کہا کہ کھو ہوا میں خاندان کی ایسی خاطر پہلے کسی جانی نے نہ کی تھی بھڑوات  
کو اپنے ایک شریک کے گھر رہا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے نو مولود کو رکھا یا نہیں۔  
مگر دوسرے دن مزا اندھیرے اس نے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ جب تک شہر بھیجیت رہی  
اس نے گاؤں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی۔

چاند اپ مدختوں کی چڑھیوں کے اوپر اٹھ آیا تھا اور اس کی سفید فخر و دشمنی ہم سب پر بیٹھے ہوئے دو تین دوستوں کو غلا رہی تھی۔

میں نے پوچھا ”کی شر بھڑکا بچے حرامی کتا،“

”میں نہیں کہہ سکتا“ شتا والحسن نے کہا ”وہ حرامی تھا یا نہیں میری بھری

جیسا کہ بعض دوسری عقائد کو اس کے حوالی ہونے کا یقین تھا۔ (مگر بعد میں میں نے اس بات کی کافی کھوج کی) بحوالہ داد پرہ میں مات کی رات آیا ضرور تھا۔ اپنی بیوی کے پاس گیا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ حرامی تھا یا نہیں۔ وہ خدا کی اس دنیا میں بعینہ اس طریقے سے آیا جس طریقے سے ہم سب متائے ہیں۔ ایک عودت کے بلکل سے۔ اور شادی کیا ہے۔

مصطفیٰ کی دل کہا کرتا تھا کہ ایک ٹکڑ گدا اُٹلا کے چید فقرے بڑھنے سے ایک عورت اور مرد کو اکٹھے ہونے کا لالٹنس مل جاتا ہے اور اس اتحاد کو برکت اور پاکیزگی مل



جاتی ہے۔ جب ان فحشوں کے بغیر ایک عورت مرد کے پاس جاتی ہے تو لوگ شور مچاتے ہیں کہ یہ بدکاری ہے۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور دیکھو تو بات بیکہری ہے۔ کتنی بچے بے نیت شادیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مگر کوئی انہیں برا نہیں جانتا۔۔۔ میں نے کئی بالوں کو دوسری عورت کے ساتھ گھربانے کے بعد اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے قطعاً لا تعلق ہوتے دیکھا ہے۔۔۔۔۔“

احسان احمد میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ شتاد الحق اپنے خاص قدرتی عقیدوں کو ہوا سے رہا تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے اسے ٹوکا تو وہ بخل خلق کے خلاف اس کی تباہی ٹھہرنے لگے بغیر تک جاری رہے گی۔

”تم کہاں سے بھٹک رہے ہو بیک ڈن“ میں نے کہا۔

”معاذ کرنا۔ میں کہاں تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”شریچو کے بچے کے حوائی ہونے یا نہ ہونے پر تم ہمیں فطرتی اخلاقیات کا

دوس دینے لگے تھے“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ ہاں۔۔۔“ شتاد الحق نے یاد کیا ”اس طرح عورت شریچو کے

پیٹ سے عبد الشاس رات پیدا ہوا۔۔۔۔۔ ایک پھول کی مانند کھلتا ہوا۔

وہ اس چمکتے دلہا احمد حیرت رات کی دنیا میں آیا۔۔۔۔۔

”..... سال گزرتے گئے۔ والد صاحب کی تبدیلی دہاڑی ہو گئی اور میں

چوتھی جماعت میں چڑھ گیا۔ ہر سال سنی یا جری میں ہم اپنے وطن اپنے دادا سے

دادی کے پاس آتے۔ اپنی بھینچیں اور خالائیں سے ملتے۔ گاؤں کے بچوں

کے ساتھ دیہاتی کھیل کھیلتے۔ گھوڑیوں کی سواری کرتے۔ اپنے چمکے فدا رخصی  
 والے ماموں جلال کے ساتھ پتی کے حامن میں ڈھاکوں سے پٹے جوڑے میدان  
 میں خرگوش کے شکار پر جاتے۔ میرا ماموں جلال اب ختم ہو چکا ہے۔  
 کیا ہی عجیب آدمی وہ تھا۔ اس کی حویلی کی ڈیڑھ سی میں ہمیشہ دوا دینے والی  
 والی، پتل اور بانگی خاکستری رنگ کی کتیاں بندھی رہتی تھیں۔ ان کی وہ وہ  
 خاطر داری ہوتی تھی کہ الامان والہ فیض۔ تین چار مراٹھی ان کی خدمت کے لیے  
 وقف تھے۔ کوئی انہیں تنہا رہا ہے اور گڑ رہا ہے۔ کوئی بیٹھا چھٹے سے  
 ان کے کانوں کے اندر سے چھپر نکال رہا ہے۔ ان کے لیے خاص برٹوں سے  
 مرکب طاقت کے کھانے پکے تھے اور دن میں ایک بار یہ کتیاں لگی اور شکر کی  
 چھری کھاتی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماموں کے دوسرے شوق کیا تھے۔  
 وہ سٹے مسائل بتلنے میں کافی شہرت رکھتا تھا اور گاؤں والے اس سے سٹے  
 پر چھنے آتے تھے۔ ”مولی جی۔ دھوکے بعد تبا کو بھینکے سے دھوڑتا ہے یا  
 نہیں؟ مولی جی۔ آج میں نے غصے میں اس نیک بخت شید کو تین دفعہ طلاق  
 کہہ دی۔ ہمارا اعجاز ٹوٹ گیا نہیں۔“ ہم جب بھی جاتے اسے کتیاؤں کی دیکھ بھال  
 علاج معالجے میں مصروف پاتے۔ اپنی بیوی اور اپنے بچے گھاس سے اکھڑتے  
 لٹکے روبرو سے وہ قطعاً نا تعلق تھا۔ میری چھوٹی بھینجی زینب بی بی اس کے مگر  
 تھی۔ وہ سارا دن بھیٹل سٹگرشیں رکھٹکٹ کرتی رہتی اور گاؤں کے لیے  
 ایک ٹیلرنگ شاپ کا مقصد پر سار کرتی، وہ ایک ہنس کھو، لا آباں ابدیا تلافی عورت  
 تھی۔ دھند ماموں جلال کو نانی یاد آ جاتی۔ ہم اس ماموں کو ”کتیاں والا ماموں“



میں ایک ملک سے محبت نہیں کرتا۔ سکاٹ لینڈ والے اپنے قبیلے اور اپنی عید سے  
سرخ ہوتے ہوئے پہاڑیوں کے گیت گاتے ہیں۔ دولتِ برطانیہ کے نہیں جس پر سے  
سورج غروب نہیں ہوتا تھا ایک صحرائی بد صورت اپنے صحرائی تین، کچھ بد  
اور خیموں سے محبت کرتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی باتیں کرتے ہوئے کہیں ہم  
اپنے آپ کو دھرم کا تر نہیں دیتے؟

”یاد رکھنا کہ جو تم نے شروع کی تھی“ احسان نے کہا ”اگر تیار رہی تم  
ایسے ہی بھگتے رہے تو یہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ گیدہ بچے کے بعد ہوشل کا پلک بند  
ہو جائے گا اور پس و پیش میں پتا نہ پڑیں گی“

”اے میک ڈون“ میں بولا۔ ”لے تمہارا یہ بھگت جانا اچھا لگتا ہے مگر  
اب کافی دیر ہو چلی ہے اور اب لے کچھ سڑی سی لگ رہی ہے۔“

”اے۔ اے۔“ تیار رہنے پر گلابرا۔۔۔۔۔ ”میں کمان تھا۔“

ہم نے اسے بتایا اور وہ پھر اپنی کافی کی طرف مڑا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میری عمر تب نو سال کی ہوگی۔ میں چوتھی میں تھا اور ہم گھنٹوں میں  
آئے ہوئے تھے۔ ایک دفع میری چھوٹی بھوپھی جس کے ہم بڑے دوست تھے لے  
پھرے پھرے ایک شاوی کے گھر لے گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہم خیر  
کے باپ بڑے سے ملکر رضی بکر کے پاس آفس کے پاس سے گزرنے پر دستِ آفس  
کیا تھا۔ مکان کے باہر ایک سرخ لیرٹکس لگا تھا۔ نیچے ایک پٹائی پر ایک  
مستحق اور قلمدان سامنے رکھے پر دستِ آفس صاحب بیٹھتے تھے بٹلے بٹلے  
اور دنیا جہاں سے بیزار گھسیٹا میاں جسم اس پر کچڑا ہندی کی بھروان دھو

موتیچے سے سجا و دست بہرہ ی چہرہ۔ کتنی لمبی ناک تھی رمنی اکبر کی۔ وہ صندوقچی میں سے ایک عورت کو دینے کے لیے کارڈ نکال رہا تھا مگر بڑی جلدی سے۔ چٹائی کے سرے پر جو گئے رنگ کے کرتے میں ایک آدھ جنگا چار سال کا بچہ لیٹا تھی پر اب ت لکسیٹس رہا تھا۔ اس کے بال گھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور دلچسپ اور اس کی آنکھوں میں قد قی شرارت اور ہنسی تھی۔

”وے شتادل۔ تمہیں پتہ ہے یہ جاکل کوں ہے؟“ میری پوچھی نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ مجھے پتہ نہیں پھوپھی جی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا کیا نام ہے؟“  
 ”یہ شر پھولا کاڑ کا ہے عبداللہ“ میری پوچھی نے کہا ”تمہیں یاد ہے چار دہے کی بات ہے۔ تم یہاں تھے اور میں شریعہ کے گھر تمہیں لے کر آئی تھی۔“  
 ”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ اور پھر میں نے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے زہد سے کہا۔ ”پھوپھی جی۔ پھوپھی جی۔ یہ تو کھچو ہے۔“

عبداللہ کانٹے کا قلم اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے اپنی طرف سے خوش غلی کی کوشش کر رہا تھا۔

عبداللہ نے کھچو کے لفظ پر اپنی آنکھیں تختی پر سے اٹھائیں اور منہ کھول کر مجھے ایک چمکیں سکا اہٹ دی مگر رمنی اکبر جس نے اپنے منہ کے متعلق یہ لفظ سنا لیا تھا بھلا اس جنگل کیسے جانے دیتا۔

اس نے ایک دلچسپ آواز میں کہا ”تے قیس حایا بکھ ہرود گے۔“

میری پوچھی نے وار کو بڑی مضبوطی سے سنبھالا اور پھر بظاہر بڑی خوش طبعی سے میں ہیں کہ ہاں۔ ”یہ میرا بھتیجا بھلا ہے اور ہمارے داد کے سب بچکے ہیں۔“

مراڑ مستقیم پر چلنے والے اور میدان سے کام کرنے والے۔ مٹال کے سب بچکے  
ہو تھے میں میاں رضی اکبرؑ

”گڑھے۔ جا جا۔ راء لے“ رضی اکبر نے نفرت اور حسد کی انکھیں، انکھیں  
اور گھیس گھیس لفظ اس کے موٹے ہونٹوں سے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح نکلے۔  
”میں تجھے بھی جانتا ہوں اور تیرے داد کوں کو بھی۔ یہیں گھاس مارا کرتے تھے میری  
زبان نہ کھلا“

ایک اور عورت کو کارڈ دیتے ہوئے رضی اکبر کہنے لگا۔ ”راجو مصطفیٰ اب تو وہ  
اگر ایک تین پیسے کا کارڈ لے جاتی ہے۔ تو کارڈ نہ لکھے تو تیری مصطفیٰ کے ہٹ نہیں  
پڑنے لگیں گے۔ تو کبھی ہے سرکار نے ٹاک خند تیرے پیسے کھولا ہوا ہے؟“  
عبداللہ نے اپنے تانا کے خنک بھرے الفاظ کو بڑے لطف اور مزے سے  
سنا۔ یہ اس کے لیے باقاعدہ تفریح تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر مجھے اپنا ہرماں  
بنایا جیسے کہ رہا ہو۔ ”دیکھو راجو مصطفیٰ کی کیا گت ہی رہی ہے۔“

جب میری پیدہ بھی اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس خنک بڑھے آدمی سے  
رضعت ہوئے تو میری پیدہ بھی نے کہا۔ ”عبداللہ خدا جانے اس خنک چڑھوں کے  
گھر کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ ان میں سے نہیں لگتا۔ مزاج یا خنک کوئی بھی چیز تو اس کی  
مادریاں پر نہیں۔ پتہ نہیں مجھ کو شرمچہ اس کو کہاں سے لے آئی؟“

میں بعد میں اکثر وہاں سے گزرا کرتا۔ میری مدد میرے خلاف میں اس طرف رہتی تھیں  
اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتی۔ یہاں گاڑھے کے لیے چرے اور سیاہ تبنہ میں  
یہ خلائیں جب بھی میں جاتا تھا وہ شکر کا شیرہ گھول کر مجھے کھلاتی۔ کتہ مزید

وہ ہوتا تھا! اُن دنوں میں کافی بیٹھتا تھا۔ ان کی البتہ پوچھے مرنہوں سے میری جلیبی لیتا  
 مجھے ناپسند تھا۔ میرے وہاں سے بار بار گزرنے کی ایک وجہ ایسی تھی کہ تم ہنسو گے۔  
 میں لیٹرکس کو دکھاتا چاہتا تھا۔ سُرخ اور چمکیلا لیٹرکس! جہاں ایک آدمی کی طرح گول مثل  
 تھا اور جس کا ایک چہرے دار منہ تھا جس میں سے وہ کارڈ اور لفافے ہڑپ کر جاتا  
 تھا۔ لیٹرکس گاؤں کے گلے پھیکے رنگوں میں ایک بھر پکتی ہوئی آگ کی مانند تھا۔ تم  
 پھر ہنسو گے۔ شاید بچوں میں میری اس سرخ گول ڈبے سے شینگلی کاٹہ ہے کہ میں اب  
 بھی جب ایک لیٹرکس کے پاس سے گزرتا ہوں میرا دل تھوڑا سا اچھتا ہے اور  
 زندگی چمکیں اور پُرسرت لگنے لگتی ہے۔ اور پھر یہ خیال کہ تم اس لیٹرکس میں  
 خط ڈالو تو وہ کئی سو میل سفر کرتا جاتا ہے! لیٹرکس۔ ہا۔ کہتے بچھڑے۔ دُور و ماور  
 پٹے ساتھی اس کی بدولت ملتے ہیں۔“

”یہ لیٹرکس پر بڑا اچھا ایسے ہے میک ڈون۔ اس کے متعلق تہذیبی شعری  
 ہم پھر کہیں نہیں گے۔ اب کہانی سناؤ۔۔۔۔۔“

”باغ کے پاس ہی پولیس اسٹیشن میں گھنٹے پر ضربوں کا آواز آئی۔ ایک۔ دو۔ تین۔  
 — دس۔ ابھی سے دس! اور ہوا میں خشک تھی۔“

”اچھا میں مختصر ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے لیٹرکس کے نیچے بیٹھے ہوئے  
 خشکیں قیدہ پوسٹ ماسٹر اور ننھے ننھے ننھے تھکتے ہوئے یا پاس ہی کھیتے ہوئے  
 روکے میں کچھ کشش ہی لگتی تھی۔ میں دور سے انہیں دیکھتا گزر جاتا۔ عبداللہ سے دوستی  
 کرنے کو میرا دل چاہتا تھا مگر میں بوڑھے کی بد مزاجی سے ڈرتا تھا۔ دوسرے میری  
 داد کی کور مٹی اکبر اور اس کے خاندان کے غلام کچھ پانے لگے تھے اور اس نے مجھے

ہدایت کی تھی کہ میں ان کے گھر نہ جایا کروں۔ یہیں کوئی نفاق یا پرست کار ڈمگھانا ہوتا تو میری رادی ہمیشہ نور سے مالا یا کسی امد سے منگواتی۔ اسی طرح ہر خط آتے ان کو لینے کے لیے بھی کوئی کٹی بھیجا جاتا۔ اسے دو تین چکر کاٹنے پڑتے کیونکہ میری رادی سے بدلہ لینے کے لیے بوڑھا راضی اکبر پہلے پیرے پر کسی کو یہ کہہ کر جھڑک دیتا کہ ”میں نے ابھی چھانٹی نہیں کی“ یا ”میرے کام میں ہرج ہرتا ہے میں اپنے وقت پر چھانٹی کر دوں گا“ حالانکہ گاؤں میں بہت کم چٹھیاں آتی تھیں اور وہ بھی سختے میں دوبار۔

ایک دفعہ میں نے عبداللہ کو لیکٹر کس کے نیچے اکیلے بیٹھ ہوئے پایا۔ اپنے تانا کی نقالی میں پرسٹ ماسٹر بنے ہوئے۔ بوڑھا آدمی غالباً باہر بروٹوں میں گھاس پھیلنے گیا ہوا تھا یا کسی شریک کے ہاں کوئی جائداد کا جھگڑا طے کرنے۔ عبداللہ تختی پر آٹے ترچھے حروف میں قلم پر زہد دے دے کر ابجد کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے شراست سوجھی۔

میں اس کے پاس گیا۔ ”پرسٹ ماسٹر۔ مجھے روپیہ کا کارڈ تو دیتا؟“  
عبداللہ نے اوپر سکر اتے ہوئے دیکھا۔  
”تھامانا کہاں ہے؟“

”ماٹھے ....“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تہیں الف ب

لکھنی آتی ہے؟“

”کیوں نہیں“ میں نے فخر سے کہا۔ یہ تو میں نے پہلی جماعت ہی سیکھی تھی۔



مجھے سونک پہاڑے بھی آتے ہیں اسانگریزی میں اسے۔ بی۔ سی لکھ سکتا ہوں۔  
 سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ آر۔ اے۔ ٹی ریٹ۔۔۔۔۔ اور میں تمہاری طرح کبھی نہیں  
 ہوں۔“

وہ ایک نعت زور زور سے پکارنے لگا۔ ”بے بے۔ بے بے۔ بے بے میاؤں کا  
 رٹکا مجھے کبھی کہتا ہے۔“

میں نے اسے منت کر کے چپ کرایا اور پھر اس کی تختی پر خوشخط الف ب  
 لکھنے لگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ اے۔ بی۔ سی کیسے لکھتے ہیں اور کیٹ کیسے۔  
 ”میرا نام لکھو۔“

میں نے اس کا نام لکھا۔ وہ بڑی خوشی اور تعجب سے دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”میں بے بے کہ جا کر دکھاؤں۔“

”شہر دے بے کو پھر دکھا دینا۔ یہ میرا نام ہے۔“ شامالختی — دیکھو  
 کہتا شاذار“ اور میں نے اس کے نام کے ساتھ اچانام لکھ دیا۔ پھر خیال آنے  
 پر میں نے آگے یہ الفاظ لکھے۔۔۔۔۔ ”دوست یہی۔“

میں نے اے۔ اے۔ آدی اور زگوش اور گھوڑے کی بھدی الٹ سلیٹ تصویریں تختی  
 پر بتادی۔

”یہ گاہ ہوتا ہے“ اس نے کہا ”میاں جی کہتے ہیں کہ آدمی کی تصویر بنانا  
 گاہ ہوتا ہے اصلاً میاں اس پر بڑے خفا ہوتے ہیں — تم نے اللہ میاں  
 دیکھے ہیں؟“

”ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ بڑے نیک لوگ ہی اللہ میاں کو دیکھ سکتے ہیں۔“

”بے بے کتنی ہے اللہ میاں ہر جگہ جوتے ہیں۔ میں انہیں درختوں اور پھوپھوں کے پاس ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے تو نظر نہیں آتے۔ اُن کی دلاڑھی ہوتی ہے؟“

”اللہ میاں کی شکل نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

”شکل نہیں ہوتی؟“ یہ بات عباد اللہ کو بڑی عجیب لگی۔ پھر اس نے کہا ”ہماری مبین نے کتنی دی ہے چلو تھیں دکھاؤں۔ نہیں پر میاں جی نے کہا تھا تم یہیں بیٹھے رہنا۔ کوئی لفافے لے جائے اور پیچھے نہ دے۔۔۔۔۔ احمد سوہا صاحبہ کی لڑکی کا ہے نا، ما۔ کل شام کو وہ اس لڑکے کے کس میں روڑے لٹاتا رہا۔ میاں جی نے اسے خوب مارا۔“

اس طرح ہم باتیں کرتے رہے جو اب مجھے یاد نہیں۔ وہاں صندوقچی کے پاس ایک کاغذ میں سودا خ کرنے والی مشین تھی۔ عباد اللہ نے اس سے مجھے سودا خ کر کے بتایا۔ یہ مجھے بڑی عجیب و غریب بات لگی اور ہم بے سٹے مارٹر کے ایک نئے نیپے سفید کاغذ کو شیش چلا چلا کر سودا خوں سے چھپتی کرتے رہے۔ سودا خوں کی جو گول گول کترنیں نکلتی تھیں وہ ہمارے لیے سونے سے زیادہ قیمتی تھیں ہم ان کو بعد میں بانٹنے کے لیے سنبھال سنبھال کر رکھتے جاتے۔ وقت آتا گیا ساتھ میں میں نے نظر اٹھائی تو سامنے سے ہاتھ میں ہگ والا عصابیے کھد کا پرسٹ مارٹر اپنی گھٹنی چال سے چلتا آ رہا تھا۔ میری تو جان نکل گئی۔ وہ دھیر سے دینگا۔ ”یہ میاں کا لڑکا آگ کیا لیٹے آیا ہے؟“ ممکن ہے اس نے اسے اپنی طرف سے خوش طبعی سے کہا ہو اور خوش آمدید کے طور پر۔ مگر میں اتنا ڈرا کہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اپنی قیمتی کترنوں کو بھول کر۔ بعد میں مجھے یقین

ہے کہ عبداللہ نے اسے بتایا ہوگا کہ مشین سے اس کے کاغذ میں سوراخ بھی بنائے  
کیے ہیں اور تختی پر چاندیہ چیزوں کی تصویریں بھی بنائے جاتی ہیں۔ بوڈھا غور سے بڑھایا  
ہوگا مگر میرا خیال ہے اس نے عبداللہ کو معمولی سوزش کی جوگی۔ وہ دوسروں کے  
لیے بڑا کرما اور کھردرا تھا، اپنے خون پرست کے لیے نہیں اور اپنے چھوٹے  
خوبصورت نواسے کے لیے تو اس کا دل خاص طور پر نرم تھا۔

لیکن ایک بار میں بوڈھے رضی البکر کی سخت خفگی کا سبب بنا اور وہ بھی مفت  
میں۔ عبداللہ چند دوسرے بچوں کے ساتھ پھرے پرشیدہ کھیل رہا تھا۔ میں  
وہاں سے گزرتا تو ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔ رشیدہ تم نے کھیل ہوگی سبھی  
پر ایک کیکڑے ایک مستطیل کھینچ لیتے ہیں جسے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کرنی  
چھوٹا کرنی بڑا۔ خانوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ایک خانہ نانی ہوتا  
تھا۔ ایک ٹاپو۔ ایک گھڑ گھڑا اور چھوٹا سمندر اس سے آگے بڑا سمندر  
کھینچنے والا پچھلے خانے میں گٹھی پھینکتا ہے اور وہ ایک ٹانگ پر پھینکتا ہوا  
پاؤں سے گٹھی کو باہر سرکاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ گٹھی کبیر کے اوپر نہ آئے اور  
نہ ہی پاؤں کبیر پر پڑے ورنہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور دوسروں کی باری آجاتی  
ہے۔ نانی کے اوپر سے بھلا ٹانگ کر گزرتا پڑتا ہے اور اس میں گٹھی چل جائے تو  
بھر پچھلے خانے سے شروع ہوتا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی باری پر پہلے خانے کبیر  
کر لیے اور گٹھی نانی میں پھینکی اور خانوں میں سے پھینکتا ہوا چلا تو عبداللہ نے  
شور مچایا کہ میرے پاؤں کی ایڑی کبیر پر لگنی ہے۔ میں نے اس سے انکار کیا اور  
عبداللہ کہنے لگا کہ تم دو غدار تھے کہ ہم تم سے نہیں کھینچتے۔ اس نے گٹھی اٹھائی

اور گھر کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کی بڑی منت کی اور اسے یقین دلانا چلا کر میرا پاؤں لکیر پر نہیں لگا تھا۔ مجھے کھیل میں مڑا آ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور میں جیت رہا تھا عبداللہ بھی ضدی بلا تھا۔ نہیں مانتا۔ آخر میں نے غصے میں چڑھ کر کہا یہ نہیں کھیڈتا تو چڑھ۔۔۔۔۔ سب لگاؤں کے بچے لڑکے اور بڑے ایسے لفظ بغیر سوچے کچھ استعمال کرتے ہیں مگر عبداللہ نے تو بات کا تنگڑ پٹا لیا اور گھراپے نانا ادا بے بے سے جا کر میری شکایت کی کہ خدا دالمت نے ایسے گندی گالی دی ہے۔ میں تو دواں سے چلا آیا مگر بوڑھے یعنی اکبر اور شہزاد نے بڑا طعناں بچایا۔۔۔۔۔ "کون جیسا اسے ساڑھے دسے نوں گالیاں دینے والا۔ اب یہاں آئے تو سہی"۔ پوسٹ ہاسٹرنے اس پر سی اکتفا نہ کی بلکہ شام کو اپنے نوے کے ہمراہ چوبارے پر میرے دادا کے پاس آیا۔۔۔۔۔ برسوں میں شاید پہلی بار۔ جس نے میرے دادا کو کہا کہ خدا دالمت نے عبداللہ کو یوں یوں کہا ہے۔ جب دادا نے مجھ سے پوچھا تو بات سچ تھی اس لیے میں انکار نہ کر سکا۔ میرے دادا نے مجھے خوب تھوڑا کا کہ تو نے یہ گندی باتیں کہاں سے سیکھیں اور یہ کہ اسے علم نہیں تھا کہ مجھے بڑی عادتیں پڑ گئی ہیں۔ میں بڑا شرمندہ ہوا اور اس شراوت کی سادی جڑ عبداللہ نے میری اس سمر ز نش پر خوب بغلیں بچائیں۔

میں اس گام میں پھر اس کے ساتھ کھیلنے نہیں گیا۔ چھل خورہ خلیاتی دقہ

کہیں کا

میں نے کیش کو کرٹ کیا۔۔۔۔۔ میرا دل دیکھتا ہے اور ایک سلا دینے والی

سکتے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے..... میک ٹوف “

احسان نے کہا ”یار ہمیں دیوار پھاندنی پڑے گی۔ اگر پھر عطرے گئے تو ریلوے پر جائے گی۔“

شمار الحق نے اپنی کہانی جلدی رکھی۔ اپنی گزری ہوئی یادوں کے حزن میں ڈوبی ہوئی۔ جس کا ایک ایک لمحہ وہ دوبارہ جی رہا تھا۔ وہ ایک طاقت ور شراب کے نشے میں مبتلا انسان تھا۔ اور ہر سال ہم اپنے وطن میں تقریباً ساون بھاؤوں کے مہینوں میں آتے تھے جب ہمیں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ میں اکثر عید الفطر کو دیکھتا۔ کبھی گاؤں کے بچوں کے ساتھ گریاں اور شیدوں اور ٹی ٹیٹا کیلئے۔ کبھی چھپر میں اپنی بھینس کو نڈلاتے۔ کبھی دویا کے آس پار واڑے میں اپنے جانوروں کو چراتے۔ وراثتی بے گھاس چھیلنے کے لیے برڈیوں کی طرف جاتے یعنی وہ مختلف کام کرتے جو سب غریب دیہاتی لڑکے کرتے ہیں اور جو میری رائے میں خشک الفاظ رہنے یا سود مرکب کے سوال مل کرنے سے کہیں زیادہ مستند اور مفید کام ہیں۔ عید الفطر کی نویں کی طرح وہ سورج اور بادِ خن کی چھینٹوں میں بڑا ہوتا رہا۔ جب بھی ہم جتے ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکاتے ادا دھرا دھرا کی باتیں کرتے جو اب مجھے یاد نہیں۔ ہم دفنوں میں کی حیفِ خودی کو بھول گئے تھے اور وہ اب ہمارے درمیان ایک ہنس کی بات تھی۔ اس نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور گاؤں کے اسکول میں بھی جانے لگا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے منشی کے بونے کی ہو مو نقالی کر کے ہمیں بڑا ہنسیا۔ اس کا نام غلام رسول تھا مگر وہ مشہور غشی چمڑ کے نام سے تھا۔ اگرچہ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ عید الفطر نے بڑی ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے جیادیا۔ شامل۔

یہ چھڑ لوگوں کو بڑی سزا دیتا تھا۔ جب کسی لڑکے کو سبق نہ آتا تو اس کے پاس ناگر پیٹ بغل یا ٹانگوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا۔ لڑکے ٹاپتے دو دو سے جلاتے اور چھڑ بڑا خوش ہوتا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ایک دن اس نے میرے ساتھ بھی ایسا کیا۔ میں نے تناول بدلے میں چھڑ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلی پر زور سے چک مارا۔ پھر تو چھڑ صاحب کہنا ہی یاد آگئی۔ زور سے ”ہاؤ“ کیا۔ وہاں چھڑ نے مجھے دھمکی دی کہ ”بے وقوف! بدتمیز! نکلاؤ۔“ میں تیرے نام نہی اکبر سے تجھے پڑاتا ہوں۔“ وہاں سے بھاگا اور ڈاک خانے میں میاں صاحب کے سامنے میری شکایت کی کہ آپ کے فرما سے گستاخی کی ہے اور میری انگلی کاٹ لی ہے۔ میاں صاحب کی عادت تم جانتے ہو۔ انہوں نے کہا ”چھڑ۔ تیرے کروت ہی ایسے ہیں۔ اس کی سزا تجھے ملی۔ وہ نہ جہاد اللہ بڑا نیک ہے۔“ میری بے جا چھڑ کی ہال ہال سس کر بدعافی لیے آگئی اور پھر تو آگے آگے مسٹر چھڑ اور پیچھے میری بے جا بدعافی اٹھائے اور چھڑ کی ایسی تیس کرتی ہوئی وہ چھڑ کو راجہ کے کمرہ تک چھوڑ آئی۔ وہ دن اور آج کا وہی پچیرٹنے پھر کسی لڑکے کی چٹکیاں نہیں ہیں۔ مجھے آتا دیکھتا ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ چھڑ کی ایک اور عادت یہ تھی کہ اچھے کھاتے پیتے لڑکوں کو تہوں تالی بجا کر بلاتا ”اے منظر اے۔“ (تالی) جاپنی بے جا سے تازہ کھس لے آ۔“ یا ”اے۔“ تالی۔ شیطان دی تالی (تالی) آگے افش جی کو مٹی روئی کھلا۔“ جس طریقے سے عبداللہ یہ باتیں سناتا تھا اور جس سحرے انداز میں ہنسی سے بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے گاؤں کے بچوں کو ٹیکری پر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے عبداللہ کی سرکردگی میں تالی کو گیر رکھا

تھا اور تالیاں بجا بجا کر ایک ساتھ کورس میں گارہے تھے۔

تانی گنتے دی نانی جلا پور جانا پیا

تانی بیچارہ نے لگا اور پھر ملتے میں کوئی سوراخ دیکھ کر نکل بھاگا سب چھوڑے  
شیطانوں کا گھڑ تانی گنتے دی نانی چلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آگے آگے عبداللہ  
میں نے جا کر تانی بیچارے کو ان شرارتی لڑکوں سے نجات ملائی۔ تب میری بارہ  
تیرو سال عمر تھی اور میں خاصا بڑا اندکڑا تھا۔

جائے ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں فٹ ایر میں  
داخل کیا۔ داخلے کے بعد ہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور میں وطن چلا گیا۔  
مادامی تب حلیل تھے اور میرے جانے کے کوئی ایک ماہ بعد وفات پا گئے، آخری  
دم تک ہوش میں رہے اور اپنے بستر سے ایک بادشاہ کی طرح ہدائیں دیتے۔  
میں گھوڑی پر اسی طرح کہیں دن ڈھلے وہاں پہنچا۔ دادا سے مل کر نیچے آیا تو چوچھی  
جینا نے باتوں باتوں میں بتایا کہ حیدر پہلے شریچھو مر گئی ہے۔ شریچھو کی موت بھی  
بالکل اس کی دہنگ جفاکش اور وحشیانہ زندگی کے صحن مطابق تھی۔ وہاں وحشی رات کو  
اپنے گہ سے پر پتی سے لڑکیاں کاٹ کر لاہی تھی کیونکہ دن کو وہاں ٹھکر جنگلات کے  
سیلہ اریوں کی پیرو مادی رہتی تھی۔ اندھیری کالی سیاہ رات تھی اور یہ دو جنوں جتنی دلیر  
عورت اکیلے دم پہنڈی سے اتھڑی تھی کہ ایک مراد سے (جنگلی سٹو) نے اس پر  
حملہ کیا۔ شریچھو کے ہاتھ میں گولہ باری تھی اور اس شیر کی بچی نے اس سے مراد سے کا  
جی مار مقابلہ کیا۔ جنگلات والوں نے بعد میں پتہ چلایا کہ انھوں نے اس رات ہی میں

”یا علی مرد“ کا نعروں سناتا تھا اور اس کے بعد ایک محنت کی عجیب ہولناکی چھین اور بدعاشی۔ اس مقابلے کو کسی نے نہیں دیکھا اور کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوا اور شریچہ پونہند جنگلی سڑ سے کیسے لڑی مگر دوسرے دن صبح گاؤں کے باہر شریچہ کا گدھا کاٹھڑیوں کے گٹھے سے لدا ہوا دیکھا گیا۔ اپنی ہنکانے والی کے بغیر۔ اس سے ہر ایک کو تعجب ہوا اور جب شریچہ دیر تک نہ آئی تو بوڑھا رضی اکبر۔ اس کے بیٹے اور دو پرستے گاؤں کی ایک جماعت کے ساتھ تلاش میں پی پی میں گئے۔ ایک پہاڑی پر چند میٹھے اور اچھلتے ہوئے گدھوں سے سراخ پا کر وہ آدھر گئے اور وہاں ایک جھاڑی کے پاس انھوں نے شریچہ کا زخمی مسخ شدہ اکڑا ہوا جسم پایا۔ آنکھیں سٹا کا نہ انداز میں کھلی اور پھیلے ہوئے ہاتھ کی مٹھی کے ساتھ کھڑی جس پر خون جما ہوا تھا۔ پاس ہی دو قدم پر جنگلی سڑ میں کھڑی کے پھل کا قاتل زخم لیے مردہ پڑا تھا۔

میری بھوپتی جیتانے کہا ”جو کچھ کہو۔ مٹی شریچہ کوئی سچ کی بچی۔ جو عورت ایک مرید سے کو کھڑا سے سے مار سکتی ہے اس کے جگر سے اور زور کو دھن ہے۔“

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ساتھ جوڑا لے جایا گیا اور جب اسے دفنایا گیا تو زونٹ کھول کر اسے پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ میری بھوپتی نے ڈرامائی انداز میں یہ واقعہ سنایا تو میں نے محسوس کیا کہ شریچہ جاتے جاتے گاؤں کی تبلیغ میں ایک اور (Legend) جھوٹ گئی ہے جو چشموں میں نہیں بھلائی جائے گی۔

دوسری صبح میں شریچہ کے گھر اس کے میٹھوں سے تعزیت کرنے اور فاتحہ پڑھنے گیا۔ رضی اکبر اپنے میٹرکس کے نیچے پٹائی پر بیٹھا تھا۔ خیمہ اور شکستہ۔ وہ اپنی بیٹی کی موت کے صدمے سے دفنوں میں بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور پہلے سے بھی زیادہ



مدد کھا اور قریباً۔ اس کی آنکھیں خالی اور کوری نظر آتی تھیں جیسے وہ پتھر کی ہوں۔  
میں نے جا کر کہا ”اسلام علیکم چا چاچی“

اس نے پہلے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نہیں پہچانتا۔ پھر اس نے کہا ”علیکم اسلام۔  
آؤ جی۔ جی آیا ہوں۔ لٹانے کا رٹ لینے آئے ہو؟“ وہ اچھی طرح میرے آنے کا مقصد  
جانتا تھا۔

”نہیں چا چاچی۔ اجازت دیں تو بیٹھ جاؤں۔ ہامی سرفراز کے انتقال کا سو کر  
بڑا افسوس ہوا۔ بڑی شیر دل عورت تھی۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔“  
و مشیتِ ایزدی رضی اکبر سے خدا کا واسطے اسی رہ گئی ہے۔“ وہ بڑبڑایا اور  
پھر ایک نہر خند کے ساتھ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

”میں نے کہا کہ ہر ایک کی زندگی لکھی ہوئی ہے اور سب کو باری باری جانا ہے۔  
لیکن کئی تو یہاں دھڑنا مار کر بیٹھے ہیں۔ ایسا بڑھے نیاز احمد جو دیں حالی صندے  
نے۔ مرے نہیں۔“

اپنے دادا کے بارے میں اس کا یہ حوالہ ایک جلتا ہوا انگڑا تھا مگر میں اسے چبا  
گیا۔ رضی اکبر کا غالباً بڑھا چپے کے مدد سے دماغ چل گیا تھا۔  
میں نے کہا۔ ”چا چاچی۔ آپ کی اس بات کے بعد مجھے فائدہ نہیں کہنی چاہیے۔  
مگر سرفراز بیگم آپ کی بیٹی تھی۔ میں مرحومہ کی فائدہ کہنے آیا ہوں۔“

میں نے ہاتھ اٹھائے۔ اس نے سر سر ہا دے دلی سے ہاتھ اٹھائے اور  
ہم نے فائدہ پڑھی۔ فوراً بعد رضی اکبر نے کہا۔ ”نیاز احمد کے پاس میرے فراموش  
کی کچھ ذہین گردی رکھی ہوئی تھی جس پر وہ قبضہ کر بیٹھا ہے۔ اس کو کوکر میرے فراموش

کا حق نہ مارے اور اس سے پہلے کہ فرشتہ اجل اس کی روح کو واکگذار کرے اس ظلم سے قویہ کرے ؟

بوڑھے کی باتوں نے میرا دل بڑا میلایا۔ میں نے تحمل سے کام لیا اور اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا ”عبداللہ کہاں ہے؟“

”عبداللہ — حافظ عبداللہ۔ وہ وٹھے پٹھے کاٹنے گیا ہوگا۔“

میں وہاں سے نہر کے پار واڑے میں گیا۔ سورج چمک رہا تھا اور ناچ کے اور کئی ٹھیکیت سنہری دھوپ میں نہل رہے تھے۔ ایک باڑ کے پاس میں نے عبداللہ کو ایک ٹیکری پر دیکھا۔ وہ ایک درختی سے کچر کچر گھاس کاٹ رہا تھا ایک دیہاتی لڑکے کی طرح تازہ رُو اور صحت مند۔ اس کے چہرے پر طہانیت اور سکون تھا اور ہونٹوں پر بامیہ کی گنگناہٹ۔

”آؤ بھائی شادول۔ کدے بوبہ“

ہم نے ہاتھ ملائے۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔

”میں تمہارے نانا کے پاس فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم وٹھے میں گئے ہو۔“

”بے بے نے مریدھے کو مار ڈالا۔“

”ہاں مجھے پتہ لگ گیا تھا۔ تمہاری بے بے بڑی بہادر تھی۔“

”جنتیہ والا دل تھا بے بے کا۔۔۔۔۔“ وہ پھر دہاتی مہلانے لگا ”شادول“

میں نے قرآن حفظ کر لیا ہے۔

”حافظ عبداللہ بن گئے ہو گویا۔“

”اور میں اب چنسن کے سکول میں جاتا ہوں کھوار میں تو صرف پانچ جماعتیں ہیں۔ چنسن میں ہائی سکول ہے۔ مجھے بھی اسے۔ بی۔ سی آگئی ہے۔ وٹ از ویزیم۔ ہاؤ ڈوی ڈو۔ دن ٹو بکل ٹائی شو“ اور وہ فخر سے مسکرایا۔

پھر وہ بولا ”شنادل۔ یہ جو ہوائی جہاز اڑاتے ہیں کیسے بنتے ہیں؟“  
”کیسے کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ سیرادل کرتا ہے میں ہوائی جہاز اڑایا کروں۔ ہوائی جہاز مجھے بڑا پسند ہے، پریمیاں جی کہتے ہیں وہ گر پڑتے ہیں۔“

”ہاں گر تو پڑتے ہیں۔“ میں نے اسے مددیں ہوائی جہازوں کے گرنے کے حادثات سنائے۔ جرمین زبہنسی کا قصہ بھی جسے ہوا میں اگل لگ گئی تھی۔

ہم گھاس کی کٹر کٹر اور پرندوں کی چیخا ہشوں میں بہت سی باتیں کرتے رہے۔ وہ سوال پوچھتا نہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بائیسکوپ کیا ہوتا ہے۔ اس نے نرینبہ بی بی کے مگر بھونپو داسے گلاسزوں کے دیکھا رٹھنے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی گانے والی نوحہ جھپی ہوتی ہے۔ اتنی باتیں ہم نے کہیں۔

میں نے کہا ”تم درانتی سے گھاس بڑی تیزی سے کاٹتے ہو۔“

”تم کاٹو۔ بڑا آسان ہے۔“ اور اس نے درانتی میرے ہاتھ میں دے دی۔

میں نے گھاس کاٹنے کی کوشش کی مگر اسے اتنا آسان نہ پایا۔ وہ ہنسنے لگا

اور پھر اس نے مجھے اس کا گر سمجھایا کہ درانتی کو اس طرح پکڑتے ہیں اور اس درخ

جلاتے ہیں اور یہ کہ درانتی کا پھل پہلے ٹھیک کر لینا چاہیے اور پھر کسی پھنڑے تیز۔

میں نے پھر کوشش کی تو اپنا ہاتھ تھوڑا سا کاٹ لیا۔ خون بہنے لگا۔ اور عبداللہ

نہر کے کنارے سے سختی پر ریت لے آیا جسے اس نے زخم پر کھیر دیا۔ پہلی دفعہ ہاتھ ہر کسی کا گھٹا ہے۔ اس نے میری حوصلہ افزائی کی ”تم میرے ساتھ آیا کرو۔ میں تمہیں فٹ سکھادوں گا۔ میں اب گھر کے بہت سے کام خود کرتا ہوں۔ پہلے تو میری بے بے تھی۔ میں اشری سوت بھی کات لیتا ہوں اور سوجے بھی گانتھ لیتا ہوں مگر ہوائی جہاز اڑاتا مجھے نہیں آیا۔“

”ہوائی جہاز تمہارے پاس ہے کہاں؟“

”تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں۔ اگلے سال میں آؤں گا اور سم دونوں اسے اڑایا کریں گے۔ لگاؤں

کے اوپر اور پتی کے اوپر۔“

”اُھا۔ اُھا“ وہ دانتی پھینک کر خوشی سے ناپھنے لگا۔ اور پھر اس نے

شکایت کی کہ میرے پاس تھا تو میں اس پر کیوں نہیں آیا۔ ویل گاڑی میں کیوں۔ میں نے کوئی مناسب عذر کیا۔

ہم واپس ایک بڑا سا گھٹا لے کر آئے اور چھتر کے پاس پھر ٹھننے کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔

ایک بار میں پھر اسے ملا۔ میں سادی گھوڑی پر اپنے ایک رشتہ دار کو ملنے پنجیس جہاز ہاتھ لے رہے تھے۔ میں سڑک پر عبداللہ اور اس کے پانچ چھ ساتھی بستے بغل میں دا بے پیدل سکول کو روانہ تھے۔ میں نے اس کو گھوڑی پر اپنے چھپے بٹھایا۔ سادی گھوڑی، میں نے کہا ہے امیرانہ خوبڑی کی وضع دار گھوڑی تھی اور بعض وقت وہ اتنی چکینہ ہر جاتی تھی جتنی کوئی گھوڑی ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی میٹھ پر سراسی کرانے



بہن ہنری میں اچھا لپٹنے کا ہے مگر اس کا ارادہ یہ نہ تھا۔ صرف وہ برے فوٹو سواروں کو بھانپ لیتی تھی۔

وہ چٹری پر بھاگی۔ ہم اس کی میٹھ پر جھے رہے۔ عبداللہ نے کہا: "اس کی باگیں مجھے کپٹاؤ۔" شادول: "مگر اتنے میں زین کا تنگ کسی طرح ڈھیلا ہونے سے زین الٹ گئی اور اس کے ساتھ میں زین پر آ رہا۔ گھوڑی کی رفتار بھی ہلکی تھی۔ عبداللہ بھی کود کر نیچے اتر آیا۔ سادی فوراً وہیں کی وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں کی فیس کانپ رہی تھیں۔"

عبداللہ خوب ہنسا۔ پھر اس نے گھوڑی کو تھاپیاں دیں اور پھر اس نے منہ سے کہے "تر کو کچا کر اس پر زین کے تنگ کو مناسب طریق پر کسا۔" نہ کم اور نہ زیادہ۔ اس نے کہا "تھیں سادی نہیں آتی۔ اب شادول۔ میں آگے بیٹھتا ہوں اور تم پیچھے۔ اب سادی خشتاں نہیں کرے گی۔"

اس نے مجھے چڑھایا اور پھر خود رکاب میں پاؤں رکھ کر بڑی ٹھہرتی اور صفائی سے اوپر زین پر کود گیا۔ باگیں ہاتھ میں سنبھالیں پہلے تو سادی نے اپنی پہلی ہارن کرنے کی کوشش کی۔ "کبھی گھومتی کبھی اچلتی مگر عبداللہ نے تپکیوں، بولٹیوں اور باگ کے اشاروں سے اسے رام کر لیا۔ وہ بھانپ گئی کہ اب اس کی پشت پر ایک سراسر ہے اور اس کی کچھ نہ چلے گی۔ وہ اب عبداللہ کی مرضی پر کبھی ہلکی ملتی کبھی پیچیدہ اور کبھی آہستہ آہستہ راستہ بھر عبداللہ مجھے گھوڑے کے گر سکھاتا رہا جس طرح اس نے ایک دفعہ مجھے رہائی سے گھاس کا ٹٹا سکھایا تھا۔ وہ پیچھے ترس گیا اور میں زین پر۔ اب کے میں کافی مدد کا ہوا تھا اور سادی نے راستہ بھر کوئی

حجّت نہ کی چیں آسنے پر میں نے عبداللہ کو شرک کے دو شاخے پر اتارا اور خود آگے  
موج پور کی سمت چل پڑا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ مسکراتا ہوا اللہ  
اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا۔ بایاں ہاتھ۔ عبداللہ ابھی کبھی ہوتا۔

اس کے بعد میں ایک مدد فرم گھر گیا اور پھر حالات کے تحت تین چار سال تک  
نہ جاسکا۔ میرے دادا کی وفات کے بعد کھوار وہ پہلا سا کھوار نہ رہا۔ وقت کے  
ساتھ کتنے ہی انقلابات آجاتے ہیں۔ چیزوں میں اور انسانوں میں ہم خود بدل جاتے  
ہیں اور ایک طرح سوچ تو نہیں بھی بدلتے۔ میں اپنے بچپن اور لڑکپن سے اپنے  
آپ میں بڑی تبدیلی پاتا ہوں۔ لیکن شاید اسی زمانے کے تاثرات، عادات و فریادوں  
اور نظموں نے ہی مجھے وہ آدمی بنایا ہے جو میں اب ہوں۔ ممکن ہے اپنی اصل  
میں میں ہی معصوم، گھسیا ہوا، شرارتی بچہ ہوں۔ مگر یہ میں جانتا ہوں کہ چیزوں میں  
وہ پہل سہی تازگی اور بھرپور اب مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ زمین پر پھیلی ہوئی ایک سنہری  
دھندلاہٹ گئی ہے۔ ..... داما کے تین ماہ بعد میری دادی بھی سیر طبعیوں  
سے گر کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اگلے سال میری دونوں بیوہ خلائیں بھی یکے بعد دیگرے  
وخصت ہو گئیں۔ پہلے بڑی خالدہ زبیراں تپ بھر تو میں مر گئی۔ میری چھوٹی خالدہ کو  
اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ بڑی اسے جھڑکتی اور ٹوکتی رہتی تھی۔ وہ  
کھٹنے لگی اور آخر ایک حینے کے بعد اپنی بڑی بہن سے جا ملی۔ میری چھوٹی چھوٹی  
جینا اپنے خاوند گیتوں واسے ماما غلام رسول کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر خانیوال کے  
پاس چلی گئی۔ جہاں انہیں آباد کاری کی شرائط پر کچھ مریضہ نہیں مل گئی تھی۔ .....  
۱۹۴۸ء میں میں گاؤں چند روز کے لیے گیا۔ وہاں بچی کی زمینوں پر مہاں سے

چند شریکوں نے قبضہ کر لیا تھا اور میرے والد نے مجھے لکھا کہ وہاں جا کر اس ٹنٹے کو چکاؤں۔ میں رات کو اپنے چوبارے پر جا رہا۔ میرے دادا کے پرانے مراثی درے کی گھر والی نے مجھے روٹی کھلائی۔ دوسرے دن شام کو میں ٹوباری سے مل کر گھوڑی پر واڑے سے آملا تھا کہ راستے میں خانقاہ کے قبرستان کے پاس میں فاتحہ پڑھنے کے لیے رُکا۔ جب میں بچپن میں اپنے دادا کے ہمراہ یہاں آیا کرتا تو سیلی خیمہ اینٹوں کی کلائی سے سبز قد آدم چار دیواری تعریفاً محفوظ تھی اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے والا آہنی دروازہ تھا تاکہ گاؤں بھینسیں اندر نہ جاسکیں۔ میں اس دروازے پر جھبھوٹے لیا کرتا تھا۔ اندر لمبی گھاس میں ہمارے مرے ہوئے بڑوں کی پختہ قبریں تھیں۔ ہر قبر کے اوپر ایک کتبہ تھا جس پر مرنے والے یا مرنے والی کی تاریخ پیدائش درج تھی اور اس کے نیچے ایک تعریفی شعر جس سے مرحوم کی تاریخ وفات نکلتی تھی۔ میرا دادا ایک عالم اور شاعر تھا اور یہ کتبوں پر اشعار اس کے ہاتھ سے لکھے گئے ہیں۔ چکر والا آہنی پھاٹک بھی غائب تھا۔ قبریں سب شکستہ حالت میں تھیں اور اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں ڈھنسی ہوئیں۔ میں شام کے دھندلکے میں کتبوں کی عبادت پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جواب مٹ چکی تھیں۔ تب میں نے ایک دیہاتی لڑکے کو منہ پر ڈھانٹا یا دیکھا اور بات کہی کوئی چیز بچے سامنے سے بردہوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی چال اور وضع میں مجھے کوئی چیز آشنا لگی اور پھر میں پکارا ”عبداللہ! حافظ عبداللہ!“ وہ ٹھٹکا۔ اور پھر اس نے نیچے مڑ کر نظر ڈالی کیونکہ یہ وہی تھا۔ اب سترہ اشعار برس کا لہیا، تیرہ منڈ لگا۔ جوانی کی سرحد



پر۔ وارثی کا سبزہ نمودار۔

”شمار الحق۔ بھائی شمار الحق۔ اس کی آواز میں بدوقت اور مردانگی کا بھاری پن تھا۔“ السلام علیکم۔ کب آئے ہو؟ خیر خیر بت ہے؟“

اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر سکراہٹ نہیں آئی اور مجھے عجیب سا لگتا شاید میں نے سوچا۔ اس کے آبا کے خوں میں رچی ہوئی جدی ٹھکانی اور درشتی اب جب کہ وہ جوان ہو گیا ہے اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ اس کے انداز میں کچھ رازدارمی، کچھ جید کا شاہدہ میں نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملنے سے کتراتیں رہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے؟

”کہاں جا رہے ہو عبد اللہ؟“

”بروٹیاں۔ پٹھے کاٹنے۔“

”اس وقت؟ اندر منہ پر ڈھانا کیوں باندھا ہے؟“

”منہ سوچ گیا ہے اس لیے رد مال باندھ لیا ہے؟“

”آج کل کیا کر رہے ہو؟ چا چار رضی اکبر کا کیا حال ہے؟“

”چا چا ٹھیک ہے۔ میں نے ٹرل پاس کر کے سکول چھوڑ دیا ہے۔ اچھا تم

اب کچھ دن رہو گے؟ میں کل ملنے آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ؟“

وہ جلدی میں تھا۔ جیسا سے اس گھر سے جوتے جھپٹے میں لیے لیے ڈگ بڑھتے دیکھتا رہا۔ یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وہ کس طرح بدل گیا ہے اور کیسے اتنا بے رخصا اور روکھا ہو گیا ہے۔ پھر قبرستان میں کچھ وقت گزار کر اندھا تھوڑے پھرنے کے بعد آگے گاؤں کی طرف چل دیا۔

میں گاؤں کی آوازوں میں جب ویٹے سے روشن کمرے میں کھانا کھانے بیٹھا تو نور امراٹی نیچے کڑوں بیٹھ کر امداد چہتا ہوا مجھے گاؤں کی خبریں دینے لگا۔ وہ ایک چھوٹا جو کڑا سا آدمی تھا۔ ایک بکرے جیسی چھدری داڑھی کے ساتھ جراب سفید ہر چل تھی۔ اس میں اپنی نسل کی ساری لطیف گوئی اور نقل کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے چٹکوں اور باتوں نے مجھے خوب مہلک دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مولوی خورشید محمد نے دوسرا نکاح پڑھوا لیا ہے۔ چچی داڑھی اور آٹا خراب۔ لالو پاچھی کی بیوی جنھوں کے علیا کہار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بابا فضل کے دھڑکے فوج میں چلے گئے ہیں۔ میں نے اس سے قبرستان میں حافظ عبداللہ سے ملاقات کا احساس کے عجیب بے پروائی کے رویے کا ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ اب گاؤں کی گلیوں میں بے گم گھومنے کی طرح متناہا پھرتا ہے، ہر وقت لیشی لاپچ میں چھیل چھبلا جاتا ہوا۔ بات بات پر ہنستا ہے اور گاؤں کی کنھاریوں کو دیکھ کر اس کے منہ پر ہر حادثہ شاہ یا مہیے کے بدل آجاتے ہیں۔ وہ رانجھا اور مہینول بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

”فرسے“ میں نے کہا ”جوانی دیرانی جوتی ہے۔ ہم سب اس منزل میں سے گزرتے ہیں۔“

”ہج ہے میان خنداں یکٹیوں پر اس آندھی کو چڑھتے دیکھا ہے۔ یہ جانیوں کا بھوت بڑا ابرا ہے۔ حافظ مجنوں کو دیکھ رہے صورت نہ شکل۔ اس عمر میں بھی محنت کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے اور جب لڑکیاں اس سے ٹھٹھا محفل کر کے اٹھا دیتی ہیں تو کہتا ہے۔ دل کرینا مجلس کرے باہیں نہ دیندیاں گڑیاں۔ اگلے دن مجھے سکول

کے پاس ملا اور کہنے لگا۔ ساتھ درہے کا ہو گیا یہ حافظ مجنوں نگر اب بھی جنائی کو دیکھ کر دل پھل جاتا ہے۔ گناہ کمانے کی بات ہے۔ جنائی شے ہی خدا نے عجیب بنائی ہے اور ہر ایک جنائی کا الگ الگ سوا۔ تو میاں شادول۔ حافظ عبد اللہ پر تو مست جہان گھر کرائی ہے؟

پھر اُس نے مجھے حافظ مجنوں کی نقل کر کے خوب خوب ہنسا یا اور میں سو گیا۔ صبح کا ندب کے وقت مسجد میں اذان سے میری آنکھ کھل۔ تم جانتے ہو میں نماز کم ہی پڑھتا ہوں مگر گاؤں میں خدا جانے کیوں مسجد میں جا کر جماعت میں نماز پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے سادہ دہقان لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ کر عجیب بے طبع حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے مسجد میں جا کر مولوی غلام غوث کی امامت میں نماز پڑھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح دہقانی اور اکھڑا تھا مگر وہ میرے کانوں پر گرا نہ گزرا۔ وہ مجھے اس ماحول میں کچھ اچھا ہی لگا۔ دعا پڑھنے اور حاضری سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں اٹھا تو میں نے حافظ عبد اللہ کو وہاں دیکھا۔ ہم اکٹھے جوتیاں پہن کر باہر نکلے۔ گلی میں مولشی اپنے گلے کی گھنٹیاں ٹٹٹاٹے گھاس چرنے برڈیوں میں جا رہے تھے۔ گاؤں جاگ اٹھا تھا۔

”عبد اللہ“ میں نے کہا ”مجھے پتہ لگا ہے کہ اس گاؤں میں راجے کی روات

اب تمہارے دم قدم سے ہے“

”قبیلے کس نے بتا یا بھائی شادول؟“ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

میں نے سمجھا کہ اس سے اس کا بُرا مانا ہے۔ پھر وہ کھٹکھٹا کر ہنسا اور اس نے

میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ بالکل ایک جہان کی طرح۔

”بھائی شادول - مجھے معاف کرو۔ میں کل شام تم سے اوپر اٹلا۔ میں ایک ضروری کام سے جلدی میں تھا۔ تم نے پتہ نہیں اس سے کیا سمجھا ہو گا۔ اب میں غدرخ ہوں اور میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں“

ہم اوپر چڑھ کر اسے میں آئے اور بیٹھ گئے۔

”بھلا اب جو بھائی شادول۔ میں کل شام کو کہاں جا رہا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم موشیوں کے لیے چارہ کاٹنے جا رہے ہو۔ میں دل میں حیران تھا کہ اس کام کے لیے یہ کونسا دقت ہے؟“

”میں تمہیں بتا دوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تم میرے پرانے بلی اور بڑے بھائی ہو۔ تم سے کیسے چھپاؤں۔ میں ایک آدمی کو ٹوکے سے قتل کرنے جا رہا تھا۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ”کیوں! تم نے اسے قتل کر دیا ہے؟“

”نہیں“ عبداللہ نے کہا ”اس کی قسمت اچھی تھی۔ وہ مجھے مل جاتا تو میں اس کو کبھی نہ چھوڑتا۔ اس کی نگرہ بوٹی کر دیتا۔ وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔“

”تمہاری قسمت اچھی تھی۔“ میں نے تلخی سے کہا ”تم خون کر دیتے تو پولیس تمہیں پکڑ کر لے جاتی اور تم پھانسی چڑھ جاتے۔ تم اتنے اچھے لڑکے تھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم بڑے ہو کر قاتل ہی بن سکتے ہو۔“

”بھائی شادول۔ تم تو غصے ہو گئے۔ وہ حرامزادہ بڑا بھیرا آدمی تھا اس نے میری شاماں کے ساتھ فحش مذاق کیا تھا اور اس پر دست درازی کر کے مجھے کوشش

کی تھی۔ میں بڑا بے غیرت جوتا جو اس کو پی جاتا۔ میں مرد ہوں۔“

پھر اس نے مجھے سلمیٰ کہانی سنائی۔ گاؤں کے ایک سفید پوش برکت کی لڑکی جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا تھا اپنے چھوٹے دس سالہ بھائی کے ہمراہ اپنے ماموں کے ہاں رسول پور گئی تھی۔ جب وہ گھوڑی پر واپس آرہے تھے تو ایک شخص غلام خمد گامی اور اس کے ایک ساتھی لنگے نے انہیں راستہ میں ایک کیکر وں کی ڈھک کے پاس روک لیا اور شاداں کو چھوڑنے لگے۔ شاداں ایک دلیر اور پُر حوصلہ لڑکی تھی اس نے ان کو خوب خوب سنائیں، مگر آخر وہ اکیلی عورت تھی اور اس کے ہر مقابلہ دو ٹکڑے تو جواں! اور وہ دل میں بڑی ڈری۔ جگہ بڑی بیابان تھی۔ گامے نے بڑھ کر لڑکی کو بازو سے نیچے کیپنے کی کوشش کی۔ شاداں کا چھوٹا بھائی رونے لگا۔ خدانے اس کی آبرو کی حفاظت کی کیونکہ اس وقت سڑک پر سوڑھی شریف کے پیر صاحب اور ان کی جماعت کے کچھ لوگ اچانک گھوڑیوں پر آتے نظر آئے۔ گامے کی ان کو دیکھ کر سچی گم ہو گئی اور شاداں کو دھمکی دے کر کہ وہ اس کے ہاتھ سے نہیں بچے گی، گاما اور اس کے ساتھی کیکر وں میں گم ہو گئے۔ شاداں نے اپنی گھوڑی کو تیز کیا اور اسے دوڑاتے ہوئے پیر صاحب کی جماعت کے پاس سے گزری۔ وہ ایک لڑکی کو اس طرح تیز گھوڑی دوڑاتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور پیر صاحب نے پوچھا بھی ”دیجئے خیر ہے؟“ مگر شاداں نے جانور کی رفتار کم نہ کی اور اس طرح اپنے گاؤں میں ہاتھی کا پتہ پہنچی۔

شاداں نے تین چار روزہ ہوئے اس وارڈے میں اس کا ذکر دوتے ہوئے کیا اور میں نے قسم کھائی کہ میں گامے کو نہیں چھوڑوں گا اور وہ زندہ نہیں رہے گا۔

ایک دن رسول پور جا کر اس کے متعلق مجھے پتہ لگا کہ اس کا باپ اب جہلم میں سکونت پذیر ہے جہاں وہ کسی دیکل کا منشی ہے۔ گامی پھیلے کہنے کو تو زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے مگر اس کا اند اس کی لنگوں کی ٹولی کا کام سوائے میل میل کرنے اور گاؤں کی دیکوں سے چھیڑ خانی کرنے کے اور کچھ نہیں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا اور اس جگہ کا پتہ لگایا جہاں وہ سوتا تھا۔ کل شام کو میں اسے ختم کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ اسی لیے میں تھکے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا کیونکہ رسول پور آٹھ کوس ہے اور مجھے کافی دور جانا تھا۔ مگر افسوس اس کی حیاتی کچھ دن اور لگھیں ہوئی ہے۔ ایک دن پہلے وہ اپنے باپ کی سرزنش سے بگڑ کر جہلم جا بھرتی ہو گیا ہے۔

”تمہارا مطلب ہے تم کل شام رسالہ پور گئے بھی اور کوٹے بھی؟ سو کہ کوس؟“

”یہ کوئی بات نہیں۔ میں کوئی تین بجے مسجد میں آیا۔ ٹھہر بھی نہیں گیا۔ میاں صاحب فکر کر رہے ہوں گے۔ دیکھو شاد دل تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا“ پھر یہ لا شاد دل تم نے میری شادمان کو دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“

”میں تمہیں دکھاؤں گا۔ سارے گاؤں میں اس سی سی سوہنی اور جاندار گڑی اور کوئی نہیں سارے قوم مان جاتے گے کہ عبداللہ یہ نہی اس کے لیے ہونگے نہیں بھرتا۔ ہم ورگا اس کا بڑا قاصد ہے اور اس کی آنکھیں نئے کے کٹورے ہیں۔ بھول گلاب کا ہے شادمان“

میں ہنسا۔ ”عبداللہ۔ تم تو شاعر ہو گئے ہو۔“

”شادمان چیز ہی ایسی ہے۔ چپ شاد دل وہ دیکھو۔ وہ آہی ہے۔“

چال دیکھو ۛ

میں نے لکڑی کی نیچی بالکن میں سے دیکھا۔ گلی کے سڑ پر سے ننگے پاؤں، نیلے تہبند اور سبز چھینٹ کی لمبی قمیض میں ایک لڑکی سر پر گھڑار کھے آنے ہی تھی۔ دوسری دیہاتی لڑکیوں کی طرح کنویں پر سے پانی بھر نے جاتی ہوئی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی، بالکی اور چھیل چھیل۔ رنگ میں صباحت تھی اور اس کے چہرے کے خند خال تکیے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اتنی شرمیلی اور محصور مگن تھی جیسے اس نے کسی کسی نوجوان دیہاتی لڑکے کی خواہش سے ملتی ہوئی نظروں کو اپنے جسم میں کھینچتے نہ محسوس کیا ہو۔ جیسے کبھی اس کے ارمان نہ جاگے ہوں۔ سب دیہاتی فوخی لڑکیاں ایسی ہی لگتی ہیں اور ان کے سینوں میں جذبات کا کتنا مشلاطم طوفان ادا کتنے رنگیں پہنے ہوئے ہیں یہ ضارای جانتا ہے۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور اس نے ہمیں بالکن پر کھڑے اور اسے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے میں آگ سی دوڑ گئی اور اس کی چال میں آپ ہی آپ لڑکھڑاہٹ آگئی۔۔۔۔۔ اور اس کے سر پر کپڑے کے پچھلے پر رکھے ہوئے گھڑے کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے لاجے نانک ہاتھوں سے گھڑے کو سنبھالتی وہ الٹ اور ایک تڑاخ سے گلی کے فرش پر گر کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ عبداللہ نے اوپر سے کہا ”کڑیے۔ گھڑا توڑ دنا ای۔ تینوں بے بے مارے گی۔“

گھڑے کے ٹوٹنے سے وہ بڑی پریشان ہوئی اور کچھ دیر وہاں گم سم کھڑی رہی اور پھر چہرے پر ایک مسکراہٹ لیے وہ اٹھ پائوں بھاگی۔ سامنے سے بابا شاہ اپنی

لاٹھی لیے آتا تھا۔ شاداں اس سے ٹکرائی اور شاہو کی دھمکی گر پڑی۔ شاہو نے ٹھری ہوئی لاٹھی کو اٹھایا اور بھاگتی ہوئی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس نے لگی کو ستایا: ”اے برکتے دی کرٹیے۔ تو مجھے بھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔“

”اس کا گھڑا تم نے تڑپایا ہے“ میں نے عبداللہ سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور پھر وہ سنجیدہ ہو گیا ”تم میرے بھائی ہو۔ میری مدد کرو۔“

قول دو کہ تم میری مدد کرو گے۔“

اس نے مجھے بتایا کہ شاداں کی بے بے قراری پسند کرتی ہے لیکن برکت شاداں کا رشتہ اپنی بہن کے لڑکے سے کرنا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی میں اس بات پر ناجائز بحث کرتے ہیں۔ تم برکت سے بات کرو۔“ عبداللہ نے کہا ”تمہاری بات کا بٹا آخر ہو گا۔ آخر مجھ میں کوئی نقص تو ہے نہیں میں خدا کے فضل سے جوان اور تندرست ہوں اور میں اپنے پیچھے کے ساتھ مل کے آٹے کی مشین کا کام شروع کر رہا ہوں۔ خدا اس میں برکت دے گا۔ تم برکت کو کہنا کہ شاداں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ پیرامچ شامل میں اس کو بڑا خوش رکھوں گا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک محبت میں محصور فرد جوان کی طرح باتیں کرتا رہا۔ میں مسکایا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں برکت سے ضرور بات کروں گا۔ وہ چلا گیا۔ تو میں تھوڑی دیر کے بعد برکت کے ہاں گیا۔ وہ میرے دادا کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے طریقے سے لکھن کے لیے اچھڑ دشتے طے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ تم میری دوگوں کو اکسانے کی صلاحیت تو جانتے ہو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میں نے کوئی دو گھنٹے کی



تقریر کئے بعد اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ شاداں کا رشتہ عبداللہ سے کر دے گا۔

”پتر شاد الحق“ اس نے کہا ”تم مجھے نہ کہتے تو میں کبھی نہ مانتا تم بڑے سیانے ہو اور تمہاری بات کو میں موثر نہیں سکتا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ بڑھاوا دینا رضی اکبر میرے پاس عبداللہ کا کشتہ مانگنے آئے گا۔“

”وہ آئے گا“ میں نے کہا ”اور اگر وہ نہ بھی آئے تو کوئی بات نہیں عبداللہ بھو اور شریچھو کا لڑکھ ہے۔ رنجو خود لاہور سے آکر تمہارے پاؤں پر پڑے گا۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ برکت کو میں نے بڑی تدبیر سے شیشے میں اتارا ہے۔“ عبداللہ شام کو آیا تو میں نے اسے یہ خوشخبری دی۔

وہ بے حد خوش ہوا ”میں جانتا ہوں میرے بخت اچھے ہیں شاداں تمہنے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔۔۔۔۔ تمہارے پاؤں دباؤں!“

”مگر عبداللہ“ میں نے کہا ”کیا رضی اکبر برکت کے پاس شاداں کا رشتہ مانگنے آئے گا؟“

”یہ میرا کام ہے“ وہ بولا ”میاں جی دوسروں کے لیے کتنے ہی دشت ہوں، میرے ساتھ ان کا لڑا لڑا ہے۔ وہ جائیں گے۔“

میں گاؤں میں تین چاندوں اور دھارے میرے جانے سے پہلے معاملات طے ہو گئے تھے اداس کی شادی کی بات چیت بھی ہو چکی تھی۔

عبداللہ مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آیا۔ سارا راستہ وہ ہنسی بلاق

کی باتیں کرتا رہا اور طے کیا تھا تارہ۔ اس نے مجھ سے شادی میں آنے کا وعدہ لیا اور کہا کہ وہ مجھے کارڈ دیکھے گا۔ وہ اس وقت کتنا خوش اور بے فکر تھا، ایک ایسے شخص کی طرح جس کی عزیز ترین خواہش پوری ہو گئی ہو۔

پریس اشیش کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ چاند اب برف کی طرح سفید اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا اور تارہ سے نیلے سیاہ غبار میں چاروں طرف چھٹکے ہوئے درمجم شمار ہے تھے۔ کبھی کبھی پتے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے کھڑکھڑاتے۔ ”ہمیں اب دیوار پھاند کمری جانا پڑے گا۔ بارہ ہو گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”نکرت کرو“ ”خدا والحق نے کہا“ رات جوں ہے اور رات بھری ہے..... اور کتنا کچھ میں نہیں جانا چاہتا ہوں۔ کتنی یادیں میرے دماغ میں مجھم بن کر ابھور رہی ہیں۔ مگر کسی اور وقت۔ تم ٹھک گئے ہو گے اور تمہیں خیندا رہی ہوگی۔ میں اب زیادہ دیر نہیں لوں گا۔..... ہاں حافظ عبداللہ کی شادی میرا خیال ہے، مارچ ۱۹۸۰ء میں مجھے لاہور اپنے کالج کے پتے پر اس کا کارڈ ملا کہ اس کی شادی فلاں تاریخ کو طے پائی ہے اور میں ضرور آؤں۔ میں ان دنوں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لیکن میں نے ایک دن کے لیے گاؤں جا بنے اور شادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ جوڑے اشیش پر ہمارا ملائی نو ماگھوڑی سے کہ پہنچا ہوا تھا بے سادی نہیں تھی جو میرے دادا کی وفات کے دو دن بعد ہی مر گئی تھی۔ یہ اس کی جوان بھیری تھی، اپنی ماں کی طرح سفید نہیں بلکہ خاکستری رنگت کی، کنوین کھڑی کیے اور جھون کی طرح چمکدار، پھرتلی اور چاق چوبند۔ اس پر وہی پرانی اپنی

مان کی انگریزی زیریں کسی تھی۔ گاؤں کی واحد انگریزی زیریں — سب جاننا یہ تھیں گزرباق میں گھران کی استعمال کی چیزیں ان کے پیچھے رہ جاتی ہیں اور ہماری گاؤں کی حویلی میں ابھی تک ایک مسند فچی پڑی ہے جس میں میرے دادا کی صینک، بڑا کی ٹوپی والی کالی دوات اور کچے پرانے خطوط اور مسودات رکھے ہیں۔ ماضی سے ملنے والی ایک زنجیر کی مانند... فرسے نے مجھے بتایا کہ بھو اللہ داد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی پر آیا ہو رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر نے کیوں حیران کیا۔

شام کو میں اپنی حویلی میں پہنچا۔ دوسرے دن عبداللہ کا نکاح تھا۔ عبداللہ اپنی شادی کے اختتامات میں لگا تھا۔ مگر میرے آنے کا سہی کہ وہ وقت نکال کر میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا۔ وہ ایک بانکا گھبراہٹ لگتا تھا۔ بادشاہ کی طرح خوش۔ وہ چاہتا تھا میں اس کا شہباز بنوں۔ میں نے کہا ایک تو میں وہ کپڑے نہیں دیا جو اس موقع کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے شہباز ایک چھوٹے ٹکڑے کو پہنا چاہیے جس کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ سکے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا ”شاول۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب سادہ نے اڑی کی تھی اور تم میرے پیچھے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھتے تھے اور کپڑوں کا کیا ہے۔ میں تمہیں پتہ لاجو دے دوں گا۔ تم بڑے اچھے شہباز بنو گے۔۔۔۔۔“

میری عادت ہے کہ مجھے تمنا بخشنے سے بول آتا ہے اور آخر میں نہ اسے اکسایا کہ وہ اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی رحمت کو شہباز بنائے۔

رات کو میں اس کے گھر گیا اور اس کے اعزاء اور اقارب سے ۱۰۔ ۱۲ بجے سڑی

رضی مکر کے چہرے پر میں نے پہل باز سکرابٹ سے متی جلتی کوئی چیز دیکھی۔ اس کے  
 ”جی آیا فوں۔ شانرا لمتی۔“ میں حقیقی محنت کی گرمی تھی۔ وہ اس حد تک پرتعاض تھا  
 کہ اندر سے دھن کا جوش ابھی دکھانے کے لیے نکل آیا۔ گونے گونے کی دہری کا سرخ بانا  
 جوشا جو اس نے خود جہلم میں ایک دہری سے سوا یا تھا اور جس پر ڈیڑھ سو روپے  
 لاگت آئی تھی۔ میں نے جوشے کے کپڑے اداس پر کام کو بہت سراہا اور اس سے  
 رضی مکر بہت گھنگنے لگا۔ رات بھر گاؤں کی لڑکیاں گھرؤں پر پامیہ اور شادی کے  
 گیت گاتی رہیں اور دیہاتی مہمان نئے تہ بندوں اور مہانوں میں ملبوس تھے پیٹے اور  
 اور مرد و عورت کی باتیں کرتے رہے۔ دوسری صبح حافظ عبداللہ سر پر ٹنگی باندھے  
 اجلا ریشمی لاچر اور اچکن پختہ چھیل چھیلانا بارایتوں کے ہمراہ دھن کے گھر ڈھکا۔  
 وہ ہماری سادی کی پھیری پانگڑی زری زری میں سوار تھا۔ اس کا چہرہ سرے سے ڈھنپا  
 ہوا۔ اور چھوٹا رجتا اپنے نئے کپڑوں اور سلیے ستارے والی گول ٹاپی میں غور غور  
 خوش اس کے پیچھے اس کی کمر میں اپنے بازو محامل کیے۔ دھن کے گھر تک زیادہ  
 فاصلہ نہ تھا اس لیے ہم سب پیدل چلے۔ مولوی غلام غوث نے نکاح پڑھایا۔  
 چھوہارے بانٹے گئے۔ اس کے بعد شاداں کا داج جو اس کے باپ برکت نے  
 اسے دیا تھا، باہر لایا گیا۔ رنگیں پیل پامیل کے پلنگ اور پلنگریاں، پکتے ہوئے  
 پیتل اور ایلومونیم کے بھانڈے، ایک بڑا صندوق، ایک لال چمچا چرخہ، دو  
 لائٹیں، ایک دودھ بلونے کی ”مٹی“ دھانی کے ساتھ، رنگدار لکڑی کے  
 چمچے اور ڈونیاں، چار پانچ اچھے کھل بستر اور ایک سنگرٹھیں۔۔۔ داج میں ایک  
 بھینس بھی تھی۔ جب براتی داج کو دیکھ چکے تو مصطفیٰ شاداں کے داج کو پلنگوں

پر رکھے سارے گاؤں میں پھرانے لے گئے تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں کہ شادیاں  
کے باپ نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ دیا ہے۔

دوپہر کی روٹی میں نے دلہن کے گھر کھاٹی۔ مٹی کے برتنوں میں کمرے کے  
گوشت کا سالن اور گھی میں تر بڑا آٹے کی میٹھی کڑھائی۔ ہر کوئی ہنسی مذاق کی تڑنگ  
میں تھا۔ خود مٹری رضی اکبر نے ایک دو مذاق کیے۔ اس نے ایک مرمیے پانسی  
کا ذکر کیا جو کہا کرتا تھا کہ کڑھائی سلونے سے پہلے کھانی چاہیے تاکہ آدمی اچھی  
چیز سے شکم سیر ہو جائے تو پھر سلونے کو ہاتھ لگائے۔ اس نے حافظ مجنوں کا  
بتایا جس نے ایک دفعہ کڑھائی کی پوری دو تین پراتیں کھالی تھیں اور جب وہ  
نکو تک پہنچا تو دوا دیوں کو اسے جھوٹے کی طرح اٹھا کر اس کے گھر پہنچا پٹار  
حافظ مجنوں نے جو موجود تھا اور کڑھائی کو دونوں ہاتھوں سے شپڑ شپڑ کھا رہا  
تھا، اس قصے کی صداقت سے انکار کیا لیکن سب اس پر ہنستے۔ جب اسے  
زیادہ چھیڑا تو وہ اپنے اذیت دینے والوں کو دُور کرنے کے لیے اپنی لاشی ہما  
میں گھس تا ہوا وہاں سے بھاگا۔ وہ یہ دیہاتی شادیاں یہ تہا کے شہروں  
کی شادیوں کی طرح پھیلکی اور بے روح نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔ چار بجے ہم رخصتی گئیں  
کے درمیان شادیاں کی ٹولی عبداللہ کے مکان پر لاسے۔۔۔۔۔ میں نے عبداللہ  
کو بات بات پر ہنستے جھوٹے دیکھا۔ اس کے سگلی ساتھی اس سے مروانہ، براہ راست  
ننگے محل کرتے تھے اور وہ جراب میں ہنس دیتا تھا۔ مجھے شام کو گاڑی پکڑنی تھی  
اور جب میں دلوں سے چلا تو حافظ عبداللہ ایک رنگین پائیوں کی پینگڑی پر کھڑا تھا  
اور اپنی خالٹوں اور پھوپھیوں اور دوسری عورتوں سے ہنستا ہوا سلام کرائی و وصل

کر رہا تھا۔ وہ اب شادی شدہ تھا۔ گھر بار والا۔ ایک پورا مرد۔

جب اگلے سال میں گاؤں گیا تو عبداللہ کا ایک بچہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پہلے گھر سے جہاں اس کا بڑا بھائی اور اس کے چھوٹے بچے رہتے تھے اٹھ آیا تھا اور چھپرے کے پار اپنی کھلی رات کی مشین کے احاطے میں ایک کچے گارے سے پے کرکٹ میں رہتا تھا۔ ایک دوپہر کو ایک گاؤں سے لوٹتے ہوئے جہاں میری بڑی بھوپھی ایک ٹھیکیدار سے بیاہی تھی، میں کھلی میں اس سے ملنے کے لیے رکا۔ کھلی کی ”کوہ گوہ“ اور ٹوپی دار لہجی چمن سے نکلتے ہوئے دھوئیں سے میں نے اندازہ لگایا کہ آٹھاپس رہا ہے اور حافظ عبداللہ کا کام چل پڑا ہے۔ اس سے مجھا طبعان ہوا۔ بڑی چکٹ کے کھلے دو دروازے کے باہر تین چار گدھے اناج کی بوریوں سے لدے کھڑے تھے۔ میں گھوڑی پر سر نیچا کیے اور داخل ہوا تو میں نے عبداللہ کو مشین کے کوبٹھے کے باہر ایک بڑی کڑی میں کچھ بورے توڑتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھ کو دیکھا اور ایک ہنستے ہوئے خوش آمدید بھرے چہرے کے ساتھ کام چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا۔ میں گھوڑی سے اترا جسے ایک کوئٹہ پشت کہیں نے منجیال لیا اور ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں بندھے۔ اس نے مجھے جنت سے خود بخود آئی کے سے انداز میں خوب بھیڑیا اور ہم ہنسنے لگے۔ وہ اب سوچہ رکھے تھا۔ اس کے بال کنگھی چوٹی سے جھے ہوئے تھے اور تیل سے چمکدار۔ اس کی کلائی پر ایک گھڑی بندھی تھی۔

”خداوند! تمہارے آنے کا پتہ ملا تھا اور اس کے بعد میں مدد و نصرت سے یہاں پر پہنچا ہوں“ اس نے کہا۔ ”تیس میرے پاس ٹھہرنا چاہیے تھا۔ خدا کے فضل سے

میری اتنی حیثیت ہے کہ تمہارے جیسے مکان کو بستر اور روٹی دے سکوں۔  
 وہ مجھے اپنے کوٹھے کے اندر لے گیا۔ صحن میں ایک بھینس اور کئی کھری کے  
 پاس بندھی تھیں اور اس کی بیوی اپنے بچے کو گود میں دھکے دے دیتی ایک پر پڑھے  
 پر مٹی کے چولہے کے پاس میٹھی ہانڈی پکا رہی تھی۔

”شاداں! شاداں! شاداں آیا ہے۔ اٹھ سلام کر۔ یہ تیرے باپ سے میری  
 سفارش ذکر تا تو میرے گھر کبھی نہ آئی۔ شاداں! ہمارا ایک جانک ہے۔“  
 شاداں اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے اٹھی اور جھکی آنکھوں سے کہنے لگی ”جی  
 آیاں نرن۔ بھائی جی“ اور اس نے اپنے بچے کو آگے بڑھایا۔

میں نے گل گو تھنے ننگے بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ ایک صحت مند  
 موٹا بچہ تھا۔ ہنسنے کی آنکھوں والا۔ بالکل اپنے باپ پر۔ وہ رونے لگا اور میں نے  
 اسے اس کی ماں کو دے دیا۔

”نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سکندر حیات“ اس کی ماں نے غرور اور خوشی سے کہا۔

”مولوی غوث محمد نے کہا تھا کہ اس کا نام سکندر حیات رکھو۔“ عبداللہ نے

کہا ”بڑا بروک بخت ملا بروگلا اور وزیر بنے گا۔“

میں نے شاداں کو غور سے دیکھا۔ وہ سال میں ہی پوری عورت بن گئی تھی۔ جسم  
 بھرا بھرا اور گندرا یا ہوا۔ فخر کی طرح مضبوط اور پختہ بیاہی عورت کا چہرہ۔ وہ اب  
 بھی ایک حکم کی طرح حسین اور پُر وقار تھی۔ وہ ایک بہتی ہوئی نزاکت سے چلتی تھی۔  
 ہم پلے پڑتے صاف کھترے چمکیے برتنوں سے بچے ہوئے کمرے میں داخل

ہوئے تو ایک طاق میں رکھے ہوئے ٹائٹم میں کالادرم بچنے لگا۔

عبداللہ نے سرت سے کہا ”شاباشا۔ گھڑیے گھڑیے بول۔ شامل آیا ہی؟“  
میں رنگیں پاؤں کی چنگڑی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں شامل کے راج کا سلسلا سامان  
ایک عجائب گھر کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ ایک بڑے بھونپروالا گراموفون بھی تھا۔ وہاں  
بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کمرے سے زیادہ آرام دہ اور پر تعیش کوئی شاہی  
محل ہو سکتا ہے۔ شادان میٹھی لسی ایک ٹینے کے جنگ میں لے آئی اور ہم نے دودھ  
گلاس پیئے۔ عبداللہ نے اپنی بیوی کو چھیڑا ”شادان۔ میں تم سے تمہاری بہن کی ایک  
شکایت کرنا چاہتا ہوں۔ جب سے سکندر حیات خاں ہمارے گھر میں تشریف لائے  
ہیں تمہاری بہن نے میری پروا میں کسی کر دی ہے۔ نہ یہ اب میری ٹانگیں جاتی ہے  
نہ میرا سر سلاتی ہے“

شادان شران ہوئی فوراً باہر چلی گئی۔

عبداللہ نے کہا ”شادان نے مجھے بڑا سکھ دیا ہے۔ اس کے آنے سے میری  
جوانی ہی بدل گئی ہے۔ یہ ہے نیک بخت عورتیں اپنی قسمت ساتھ لاتیں ہیں۔ اس کے  
آنے کے چھ مہینے کے اندر اندر مجھے کسی کی محتاجی نہیں رہی۔ میں اپنے پاؤں پر  
کھڑا ہوں۔ اپنا گھر بار اور اپنا کاروبار“

پھر اس نے اچانک کہا ”شادان۔ تمہیں جنائی کی خواہش نہیں ہوتی؟ تم اپنا گھر  
کیوں نہیں بساتے؟“

میں نے جواب دیا کہ ابھی دقت نہیں۔ میں پڑھ رہا ہوں اور حبیب میں پڑھائی سے  
خارج ہو جاؤں گا تو شادی کی سوچوں گا۔“



”جنانی کے بغیر ایک مرد کی کچھ زندگی نہیں۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے تم کیسے عورت کے بغیر رہتے ہو میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

میں وہاں عبداللہ کے گھر کوئی دو گھنٹہ بیٹھا۔ اس نے مجھے اپنی کھانسی کے کاروبار کے متعلق بتایا اور یہ کہ وہ کچھ پیسے آنے پر آنے سے اور ڈاکے کی مشین بھی لگائے گا اور وہ رکھتا ہے ہم نے بعد نپڑ والے گراموفون پر کچھ ریکارڈ بھی سنے۔ اس کی بیوی ایک کلڑی کی طشتری میں کھانا لے کر آئی۔ ساگ اور تلدہ کھنکھن اور خور کی روٹی۔ کھانے نے بڑا لطف دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سکند جیات کے ہاتھ پر دو روپے دکھ کر اس خوش بابرکت گھر سے رخصت ہوا۔ اپنی زندگی کے بخر پر اور تنہائی کا سہتا ہوا میں کچھ اداس اداس حویلی کو لوٹا۔

میں اپنے تعلیمی کردار سے بڑے ہٹے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ اور اس کی وجہ سے میں متواتر دو سال بی۔ اے میں فیل ہوتا رہا۔ والد صاحب قبلہ سخت ناراض تھے۔ کیونکہ مجھ سے انہوں نے کافی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس مدت میں میں گاؤں نہ جاسکا۔ حافظ عبداللہ اور اس کا ایک ساتھی دشمنو کھتری جو گاؤں میں کینک بنا ہوا تھا، ایک بار لاہور شینری کے کچھ پرزے خریدنے کے لیے آئے۔ عبداللہ ریڈیو سٹیشن میں مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اس کا جسم ابھی تک کسرتی تھا مگر خوشحالی اور بے فکر کی وجہ سے کچھ فریب کی طرف مائل۔ اوائل شباب کی تازہ رمل کی جگہ ایک مردانہ پختگی نے لے لی تھی اور اس نے بھی ترکیب مرنچیں اگائی تھیں۔ جن کی ٹوکوں کو وہ مسلسل بن دیتا رہا۔ وہ بے ساختگی سے ہنستا تھا۔ اس نے مجھ

بتایا کہ اب اس کا ایک امداد کا بھی پیدا ہو چکا ہے۔

”امداس بار تم نے اس کا نام خضر حیات رکھا ہو گا؟۔۔۔ سکندر حیات کے بعد خضر حیات“ میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ ”نہیں نہیں۔ اس بار میں نے سب تجویزوں کو رو کر دیا۔ میں نے اس کا نام اس کے چاچا پرستادہ لکھ رکھا ہے۔“ اس نے خضر سے میری طرف دیکھا اور میرے دل کا کوئی اندہونی حقہ سترت سے دھکا۔

”چاچا رضی اکبر نے اس کی مخالفت نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔ ”اسے ہم موانوں سے بڑی کہہ رہے ہیں۔“

”سچ کہوں۔ میاں جی نے مخالفت کی مگر میں نے کہا کہ اس کا اصل چاچا نہ لکھ رہے امداس اس کا نام بھی رکھوں گا۔“

”امداس شاداں کیسی ہے؟“

”ٹھیک اور خوش ہے۔ ہاں میاں جی سے اس کی نہیں بنتی اور مجھ پر بھی غصے ہوتی رہتی ہے کہ میں میاں جی کی پاسداری کرتا ہوں۔ شادی کے وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنی تیز مزاج نکمے لگی۔ ایک دو بار تو وہ اس بات پر سیکے چلے جانے کی دھمکی بھی دے چکی ہے لیکن میں اس کو راضی کر لیتا ہوں۔ جتنی کہ بھی انجمن کی طرح ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ میں کچھ سوچ میں چلا گیا۔“

”اسے خوش رکھو۔“

”ہاں۔“ وہ چرکا ”خوش اتم تھے اسے لکھ دلیا ہے۔ میں اب بھی اس سے پہلے کی طرح محنت کرتا ہوں۔“

دشمنو کھتری ایک بچے کوٹ میں ایک چھوٹا سا آدمی تھا۔ چھوٹے کانوں میں مندریاں پہنے ہوا۔ ”لا لہ سکھی رام کا قول تھا کہ جب عورت ہسٹ پراتی ہے تو صرف ایک چیز اسے درست کر سکتی ہے۔ سمٹے کی مار۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔“ میں نے دیکھا کہ دشمنو کھتری کے کوٹ کی جیب میں سے ایک بند بوتل کا تھوڑا سا نکلا ہوا ہے۔ وہ مجھے شراب کی بوتل لگی اور میں تعجب کرنے لگا کہ کہیں حافظ عبداللہ کو بھی چسکی لگانے کی لت تو نہیں پڑ گئی۔ وہ آدھ گھنٹے کے بعد چلے گئے۔

۱۹۴۳ء کے جون جولائی کے مہینے میں مجھے اپنے والد کی ہدایت کی تکمیل میں پھر گھاٹن جانا پڑا۔ میں اس مشن پر جانے سے قطعی خروش نہیں تھا اس وجہ سے کہ فریقِ ثنائی نہ ہی چڑچڑا اور تلخ کلام بوڑھا حافظ عبداللہ کا ناراضی اکبر تھا۔ ایسے خانگی تئانے بڑے تدبیر اندہ محصلے ہی سے پیشائے جاسکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب دوسرا فریقِ معاہدہ کی ماہ اختیار کرے اور کچھ جھکے۔ رضی اکبر ایسا شخص نہ تھا۔ وہ ساری زندگی نہ خدا کے سامنے جھکا تھا نہ شیطان کے سامنے۔ اور میرا خیال ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں اس کے سجدے نیاز مندی اور عبودیت سے مدد ہی ہوتے تھے۔ اس کا عبودہ خود تھا۔ اس کا غرور اور اس کی اتار دیرا کے پار ہماری کچھ متنازعہ زمیں پر ایک آدھ اکرٹھتی اس کے بڑے نواسے اسماعیل نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ والد صاحب نے اسے اور رضی اکبر کو کوئی بار لکھا کہ وہ قبضہ چھوڑ دیں مگر یہ ایسی بات تھی جو رضی اکبر کے سینے میں ہمارے خاندان کے خلاف بھرے ہوئے زہر کو اندازیدہ ٹھکرتی۔ میں نے سوچا کہ میں اس معاملے میں بوڑھے کی

بجائے حافظ عبداللہ سے بات کر دیا گا کہ وہ اپنے نام کو سمجھائے۔

جب گاڑی جوڑے کے اسٹیشن پر پہنچی تو مطلع ابراہیم تھا۔ کالی سیاہ گھٹاپتی کی ہاڑیوں پر سے اُٹتی ہوئی آسمان پر چڑھتی آہری تھی اور پریت کی ٹھنڈی ہوا ایک ہر اہل دستے کی طرح درختوں کو تھپڑے مارنے لگی تھی۔ نوے نے جو گھوڑی لے کر آیا ہوا تھا مجھے کہا کہ زور کی برسات آنے والی ہے اور بستر ہو گا کہ چودھری علم دیں گے ڈیرے میں بارش کے کہنے تک آرام کر لیں۔ مجھے پی کے شام اب گھرے نیلے پٹ لیکروں اور بیکریٹوں کے درمیان لہراتی سیاہ ہوتی ہوئی سڑکیں، چمکتے کڑکتے بادلوں کے نیچے کلاتے ہوئے پرندوں کی نواہیں، سب اتنے بھلے اور سحر انگیز لگے کہ میں نے اس موسم میں گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ "بارش آتی ہے تو آئے۔" میں نے کہا۔ ہم چل پڑے۔ آگے آگے بدلتی گھوڑی پر میں اور پیچھے پیچھے سامان سے لدے گدھے پر نورامرائی۔

ہم کمال پور سے گزے اور بارش پھر بھی نہ آئی ساگر چٹھنڈی ٹھنڈی فر فر کرتی مہمانی سے لدی ہوئی تھی۔ تھوڑی دُعا گئے ایک چھوٹی ٹکی کے اور پہم نے ایک خمیدہ کندھوں والے سلاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتے ہوئے بوڑھے آدمی کو جابایا۔ میں پاس سے گزراتو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ دیا۔ یہ کھوپار کا پوسٹ ماسٹر رضی اکبر تھا۔ بڑھاپے اور ضعیفی اور کپڑے پی کے باوجود اسی طرح مغرور اور ساری دنیا کے خلاف کینہ پالے۔

"اسلام علیکم چاچا جی" میں نے گھوڑی روکتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے

آ رہے ہیں؟"

”علیکم السلام“ وہ رکھائی سے غرایا اور اسی طرح لالٹھی ٹیکتا ہوا چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے کچی سڑک پر چلتا رہا۔

”چاچا۔ میں شنارالحق ہوں۔ عطارالحق کا بیٹا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟“ میں نے کہا۔

”اچھا! اچھا۔ میری بیٹائی گزرد ہو گئی ہے۔ مگر میں ٹھانوں کو ایک میل سے سونگھ لیتا ہوں۔ ان کی بو اتنی تیز ہے۔ شنارالحق خاں۔ تمہارے باپ کا ایک حال ہے؟“ وہ خیریت سے ہیں۔

”خیریت سے؟“ اس نے اپنی لالٹھی ہوا میں لہرائی ”اسے میری طرف سے کہہ دو کہ ظلم کبھی نہیں بنتا۔ جب تک رضی اکبر زندہ ہے اسے وارثے والی زمین کا ایک چپہ نہیں مل سکتا۔“

”چاچا!“ میں نے کہا ”زمین کی کس نے بات کی ہے؟ آپ گھوڑی پر چڑھ بیٹھیں۔ کھدہ بار کا کافی فاصلہ ہے اور بارش آ رہی ہے۔ میں پیدل آ جاؤں گا۔“

وہ اس اخلاق پر حیران ہوا۔ وہ اپنے زہر کو اگلنے کی خاطر تلخ کلامی کے لیے زمین ہسار کر رہا تھا اور یہاں اس کے شریک اور دشمن عطارالحق کا بیٹا اسے ساری کے لیے اپنی گھوڑی کی پیشکش کر رہا تھا۔

”جاؤ۔ جاؤ۔“ وہ بولا ”میری ٹانگیں گھوڑی سے زیادہ مضبوط اور تیز ہیں۔“

میں نے ایک بار ادا صرا کیا اور پھر اس کی کھل کدورت کو دیکھ کر میں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ ایک فرلانگ آگے سڑک کے موڑ پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ اسی طرح خمیدہ، لالٹھی ٹیکتا، تیز تیز چلتا ہوا آ رہا تھا۔ سر پر صاف زہریلوں والے

”تلخ چہرے پر لال بھرداں داڑھی۔ مچی ہوئی خوشنک آنکھیں، ایک تنہا کھوٹا ہوا بوڑھا آدمی۔ اس وقت وہ مجھے ایک المیہ کر دار لگا۔

پہلے جھپٹے کھیانے کے گاؤں سے کچھ آگے ہم پر پڑے۔ کھو ہاریاں سے بس ایک کوس تھا۔ ہم نہ رُکے اور بڑھتے گئے۔ پرے پی کی پہاڑیوں پر بڑی موسلا دھار بارش برستی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہاں ابھی بونہا یا ندی ہی تھی۔ آسمان پھری ہوئی سیاہ گھٹاؤں کا ایک آتش کڑواہ بنا تھا۔ ہم کھو ہار میں داخل ہوئے تو بارش موسلا دھار بہنے لگی اور حیران کن پہنچتے ہم بالکل بھیگ گئے۔ یہ ایک سیلابی بارش تھی اور اس فطرت میں بھی جو بارشوں کے لیے مشہور ہے۔ میں نے آسمان کو اس طرح برستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب میں نے سوچا ہفتوں تک گاؤں کی گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں کچھڑ رہے گا اور ہر کوئی ہاتھ میں لائٹی لے لے اور اپنے تہ بند کو اوپر اٹھائے اپنے کام پر نکلے گا اور نہ ہریے میر یا کے ٹھیکر چھتوں میں پیدا ہو کر انسانی اور جانور کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

میں نے چوبارے میں کپڑے تبدیل کیے۔ نور سے فٹ کی انگلیوں میں پھونک مار مار کر آگ جلائی اور آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے بستر کو خشک کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ گاؤں پر خاموشی سی طاری تھی اور سوائے موٹی چادروں میں گرتی ہوئی بارش اور بجلی کی کڑاک کے اور کوئی آواز نہ تھی۔

میں اس بالکنی پر کھڑا ہو کر اس ہولناک بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک پی کی طرف بجلی کسی نامعلوم نہاں کے سروں کی شکل میں گوندی اور سارا آسمان روشن ہو گیا اور پھر ایک دھلا دینے والی گڑا گڑا ہٹ سے ایک چند عیا دینے والی روشنی کی

تمہاری نیچے پلکی۔ دس توپوں کی گولہ کی گولہ کے ساتھ۔

نور سے نے خوف سے کہا۔ ”میاں جی۔ گاؤں کے نزدیک کہیں بھلی گری ہے۔ اللہ رحم کرے۔“

میرا خیال ہے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد طوفانی بارش کے شور میں میں نے دو عورتوں کی آواز سنی۔ ”نی شریچو دے عبد اللہ بے چارے تے بھلی پئی لے۔“ دوسری عورت نے کہا ”ہائے ہائے نی بے چارہ۔ میں مر گئی۔ ہائے جلالہ ہی تھی۔“ میرا دل ٹھب گیا اور میں دعا کرنے لگا کہ میرے کانوں نے غلط سنا ہو بلکہ ذرا تھمی تو نہ اور میں باہر بھاگے۔ گلی میں بہتے پانی اور گارے میں شیشیا تے اور دیواروں کو پکڑتے۔ کھلکی میں پہنچتے پہنچتے ہمیں کچھ وقت لگا۔ کھلکی کے کونے کے پھونس کی چھت گری ہوئی تھی اور مشین کا انجن تو اسٹرا اور سیاہ اپنی آہنی پنجر نمایاں کئے پڑا تھا۔ چھ سات دیہاتی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ انجن اور مشین کے درمیان پٹے کے نیچے کھٹے کی طرح سیاہ، مسکڑا اور ٹھنسا ہوا حافظہ عبد اللہ کا جسم پڑا تھا۔ بالکل ناقابل شناخت۔

بعد میں روتی ہوئی شاماں نے مجھے بتایا کہ جب چھت کے گرنے کا دھماکا ہوا تو عبد اللہ اس کے منع کرنے کے باوجود یہ دیکھنے کے لیے بھاگا کہ اس کی مشین کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچا۔ پھر بھلی بڑے زور سے کڑا کی اور مشین پر گری اور عبد اللہ جاپانی آئی سے پاس کھڑا تھا بل نہیں گیا۔

اوہ! وہ کبھی جردیہاتی بوڑھیوں نے اپنے بازو لہر لہرا کر اس کی میت پر کیے! عبد اللہ کا جسم رضی اکبر کے گھر کے صحن میں چار دیو میں ڈھنپا ایک چار پائی پر پڑا

تھا۔ ارد گرد اس کی خالائیں، پھر پھیاں اور دوسری عورتیں سیاہ کپڑوں میں اکڑی بیٹھیں تھیں۔ ایک ایک اٹھتی اور سرے ہوئے شخص کی طرف ہاتھ بڑھا کر اور اسے مخاطب کر کے دنگلاز بنی کرتی۔ دیہات میں جب کوئی مرتا ہے تو اس کا مناسب نام کیا جاتا ہے اور گاؤں کے سب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

اور جب ہم شام کو اس کی میت کو اٹھائے دفنانے لگے تو ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر رنج و غم کے الفاظ اُسمائے ایک شخص کے۔ یہ اس کا تاراجی اکبر تھا۔ بوڑھے خدی آدمی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ بہا۔ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھ کودی اور خالی تھی۔ وہ کھرے تلخ لہجے میں موسم اور فصلوں کی باتیں کرتا رہا۔ ایک بار اس نے مجھ سے میری پڑھائی کے متعلق بھی پوچھا۔ ہاں جب میں نے مثبت ایزدی کا ذکر کیا تو وہ بھڑک اٹھا اور حقارت اور غرور سے عرض کیا "مشیت کا کرم ہمیشہ رضی اکبر کے گھر ہی ہوتا ہے!..... میں نے جانی لیا کہ اس کے لیے اب اس دنیا میں زیادہ دیر نہ لگی نہیں۔

خدا الرحمن خاموش ہو گیا۔ چاند کچھ بھیکا پڑنے لگا تھا اور پہلے مرحلوں کا انداز سنائی دینے لگیں۔

اسیے ایک آدمی کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں نے حافظ عبداللہ کو اس دنیا میں آنے پر دیکھا اور مولوی کو اس کے کانوں میں کلمہ پڑھتے سنا۔ پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے بچھی اور بلوغت کی منزلوں سے گزرا جس میں سے سب انسان گزرتے ہیں۔ وہ اس طرح بڑھا جیسے ایک بھول زمین میں سے نکلتا ہے۔ وہ جوان ہوا اور جوانوں کی طرح ایک لڑکی کی چارست میں دیوانہ ہو گیا۔ میں نے اسے اس کی شادی کے وقت



چادر پائی پر کھڑے مسکراتے اور سلام کر مائی قبول کرتے دیکھا۔ میں نے اسے ایک ذرا ملے  
 مرد بختے، گھر بساتے اور باپ بختے دیکھا اور پھر میں اس وقت بھی موجود تھا جب  
 اسے سونہ میٹھی کے نیچے آرام کرنے کے لیے ٹایا گیا۔ سب آدمی ان سب  
 منزلوں میں سے گزرتے ہیں اور آخر میں زمین ان کو اپنی کوکھ میں بلا لیتی ہے اور  
 وہ سائین کی طرح زندوں کی آنکھوں اور ذہنوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کے  
 سب خواب، ارمان پچھتاوے اور مستقبل کسا راوے ایک مشت خاک بن کر  
 ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں مگر ایک طرح وہ باقی رہتے ہیں۔ دوسرے انسانوں  
 کے سینوں میں۔ اس میں بڑی سچائی ہے کہ سب آدمی ایک دوسرے کے دست و  
 بازو ہیں۔ جب ایک مرتا ہے تو ہم سب اس کے ساتھ مرتے ہیں.....

پھر ہم پنج سے اٹھے اور اپنے اپنے خوابوں اور خیالوں میں کھوئے ہوئے  
 ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموش سرگ پر ہوسٹل کی صحت چل پڑے۔

(”فونی“ لاہور)



تو گاؤں میں روشنی پھیلانی پڑے گی۔ وہ یہی سوچتا ہوا بیٹے دفتر کے قریب سے گزر کر کشنی نگر کی طرف مر گیا۔ اس کا اصل وطن قراب کشنی نگر ہی تھا۔ انھیں گھیلوں میں کھیل کر بچپن گزارا اور وہیں جوانی آئی۔ بریلی کی تو شاید یہی کوئی یاد اس کے حافطے میں محفوظ ہو۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ وہ تو ابھی چوتھے درجے میں پڑھتا تھا کہ اس کا خاندان بریلی سے اٹھ کر پاکستان آ گیا۔ اس کے والد بریلی کی کچہری میں پیشکار ہوتے تھے۔ اب انھیں لاہور کی کچہری میں نوکری مل گئی اور وہ لوگ کشنی نگر میں گھر لالٹ کر آکر یہیں کے ہو رہے۔ گھر میں تو آدو بولی جاتی تھی مگر شار حسن خواجہ کی خاصی پنجابی بولنے لگا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی فصیح پنجابی بولنے والا ایسا لفظ بول جاتا کہ شار حسن کی ترکی تمام ہو جاتی اور وہ ششدر اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔

ایم۔ اے تک پہنچتے پہنچتے اسے محنت کی اچھی خاصی عادت پڑ گئی تھی خاندان کی مالی حالت بہت خوشحال تھی نہ ہوسکی اس لیے اسکول کالج کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی بیچ بیچ میں ملازمت کرتا رہا کبھی محنت میں کسی امیر آدمی کے لڑکے کی ٹیوشن پڑھا دی۔ کبھی اخبار میں ترجمے کا کام کر دیا۔ لیکن اب ایم۔ اے کے بعد تو اسے مستقل ملازمت کی تلاش تھی۔ چنانچہ اس نے ریڈیو پاکستان، انکم ٹیکس، خاندانی منصوبہ بندی، کسٹم اور محکمہ آبکاری میں درخواستیں دے دیں اور آخر کار نصیب محکمہ خاندانی منصوبہ بندی میں کھلا اور اسے ایک معقول تنخواہ پر اس محکمے میں ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ وقت صرف یہ تھی کہ ملازمت دیہات کی تھی لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا اور اپنی نئی ملازمت پر روانہ ہو گیا۔

ملازمت کا پہلا پڑاؤ ضلع کا صدر مقام تھا۔ لاہور سے دس گز جس ضلع میں اسے

کام کرنا تھا اس کے صدر مقام پر تمام نئے بھرتی ہونے والے افسروں کو بھرتی کیا گیا تاکہ دیہت میں بھیجنے سے پہلے خدا ان کی مناسب تربیت کی جائے۔ پہلا لیکچر ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے دیا جس میں اس عظیم کام کی اہمیت واضح کی گئی جو یہ سب نوجوان شروع کرنے والے تھے۔ اس مسئلے کو ملک کے لیے بہت جلد چیلنج قرار دیا گیا اور ان نوجوانوں کے دلوں میں اس کام کی عظمت اور اہمیت کے چراغ روشن کیے گئے۔ حکومت ان کے کام کی پشت پناہی کرے گی۔ کروڑوں روپے کا بجٹ اس کام کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ ان کے کام پر اس ملک کے مستقبل کا دارو مدار ہے۔ آنے والی نسلیں صحت مند، ذہین اور ذمہ دار ہوتی جائیں گی۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر واقعی گفتار کے غازی تھے پہلے لیکچر ہی میں ان نوجوانوں پر جا دو کر گئے اور اس تقریر کے بعد جب انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو محسوس ہوا کہ ہر شخص اپنا کچھ کرنا عظیم کام کے لیے میسر کرنے پر پوری طرح آمادہ ہے۔

پھر دو ہفتے تک ان کی تربیت ہوتی رہی۔ ڈاکٹروں اور جینیات کے ماہروں کے لیکچر۔ علم البدن کے پروفیسروں کے لیکچر، بچوں کی پیدائش اور افزائش نسل پر لیکچر۔ مائع حمل تدابیر پر لیکچر۔ آبادی اور اقتصادیات پر لیکچر۔ وہی معاشرت اور خاندانی منصوبہ بندی پر لیکچر۔ غرضیکہ یہ دو ہفتے علم کی گھاگھی اور نئے سائنسوں کے میل جول میں گزر گئے۔ کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ لاہور اور لاہور والوں کا کچھ خیال نہ آیا۔ نئے کام کی تربیت مکمل ہو چکی تو ان کے تبادلوں کے احکام آگئے اور مدہی روز میں نوجوانوں کا یہ گردہ چڑیوں کے چنبے کی طرح اڑا کر منتشر ہو گیا مثلاً جس کاظمی کی تعیناتی ضلع کے صدر مقام سے ستر میل دور ایک گاؤں میں ہوئی جس کا

نام تھا رکھاں والا۔

شرمیل کا یہ سفر کوئی چھ گھنٹے میں طے ہوا اس لیے کہ دس میل کے بعد کچی سڑک شروع ہو جاتی تھی اور اس سڑک پر ہر روز دھاری کے آنے جلتے سے سڑک کی مٹی پیسے ہوئے باریک میدے کی طرح ہو گئی تھی۔ لاری کے ٹائرس میں دھستے چلے جاتے تھے۔ پھر سڑک میں گڑھے بھی تھے مگر لاری ڈرائیور کسی نہجہ مشق علاج کی طرح جو ساحل چٹانوں سے بچا کر کشتی کو چھوٹے چھوٹے جزیروں تک پہنچاتے ہیں، لاری کو کمال احتیاط سے ان گڑھوں سے بچاتا ہوا رکھاں والا کی طرف لیے جا رہا تھا۔ لاری کی سفرز آیا دی میں تھا نے کا ایک سپاہی، ایک چھوٹے سے طرے والا زیندار جس نے گلے میں پستول لٹکا رکھا تھا اور شارسن کاظمی تھے۔ باقی آبدی عام دیہاتی عقلمند اور مردوں کی تھی۔ راستے میں دو تین مقام ایسے بھی آئے جہاں لاری نے اطمینان سے رُک کر آرام کیا۔ یہ راستے کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں بچوں نے گڑ والے چنے، عمرتوں نے بامی بگوڑے اور مستقل مالے زیندار نے کھوئے کے پیڑے خریدے جن کا رنگ سفید سے پیازی ہو چکا تھا اور اُس نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے دوکاندار سے کہا: ”اوتے بدینٹ نکھیاں تو جھلیا کر“۔ زیندار جس کاظمی نے بڑے درخت کے نیچے لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے نکال کر پانی پیا اور لاری پھر چل پڑی۔

کوئی دو گھنٹے بعد شاد حسن کاظمی نے لاری میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف نظر اٹھائی تو اسے محسوس ہوا کہ ان کے اندر حال ان کے چہرے کیسے تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ تازگی، جو سفر کے شروع میں چہروں پر تھی اب غائب ہو چکی تھی۔ گرد کا

ایک دیہلیک ہیرا لہا تھا کہ لاری کے ساتھ ساتھ اڑتا چلا جا رہا تھا اور دونوں طرف کی جھانگیوں اور درختوں کو آندھی کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جا رہا تھا۔ شاد حسن کاظمی ایم۔ اے فیملی پلاننگ آفیسر کھان مالاہر لحظہ اپنی منزل کے قریب تر ہو رہا تھا۔

رکھان مالاہر دیکھ کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر آباد تھا۔ شاد حسن کاظمی نے پتھروں سے گرمی تھیں جھاڑتے ہوئے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ مسافر لاری کی چھت سے اپنا اپنا سامان اتار رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھڑیاں سروں پر رکھے گاؤں کی گلیوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے اندازے سے پوچھا تھے ہوئے اس سے کیا۔ ”آپ خانقاہی منصوبہ بندی ....“

جی ہاں جی ہاں شاد حسن کاظمی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اسی ایک لفظ سے رکھان مالاہر کی ساری اہمیت ختم ہو گئی۔ ”تو چلیے میں آپ ہی کو لینے آیا ہوں۔ میں یونین کونسل کا سیکرٹری ہوں۔“

شاد حسن کاظمی اس کے ساتھ ہویا۔ لاری کے اڈے کے ساتھ ہی ایک جوہڑ تھا جس کے بند پانی پر لگری سبز کافی کی تہہ جم گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن پر مرغیاں چو نہیں مارا کر کوڑے کو چاروں طرف پھیلائے ہیں مشغول تھیں۔ اس کے ساتھ گاؤں کی مسجد تھی اور پھر پرائمری سکول تھا جس کی محراب پر عربی حروف میں لکھا تھا۔ ”ہر کہ خدمت کرد او نخدم شد“ باہر کے دروازے پر خوش آمدید لکھا تھا مگر بارش کی وجہ سے اس طرح پڑی تھی کہ ”آ“ ”مٹ گیا تھا اسباب صرف“ خوش امید“ ”باقی رہ گیا تھا۔ جس راستے پر وہ چل رہے

تھے وہاں سے چھوٹی چھوٹی ٹیرھی میزیں لگایاں گاؤں کے اندر چلی گئی تھیں جن کے دونوں طرف مٹی کے کچے مکان تھے جن میں بعضوں کی دیواریں پوتی لگئی تھیں مگر اکثر گھروں کی دیواریں لیمپ پیت کی محتاج تھیں۔

نثار حسن کاظمی کے میزبان نے اس سے کہا: ”اچھا ہے آپ گاؤں کے باہر ہی رہیں گے۔ ہم نے یونین کونسل کے دفتر ہی میں آپ کی رہائش کا انتظام کر دیا ہے“ یونین کونسل کا دفتر گاؤں کے پرانے مندر کی عمارت میں واقع تھا بندھنوں کے چلے جانے کے بعد سے اب تک یہ مندر اور اس کے ملحقہ کمرے دیباں ٹپے تھے۔ شروع شروع میں ہتک اور حصار کے مہاجر یہاں آکر ٹھہرے تھے مگر جب ان کو قریبی موضع میں زمینیں الاٹ ہو گئیں تو مندر پھر ویراں ہو گیا۔ اب یونین کونسل نے اس کی مرمت کرا کے یہاں اپنا دفتر قائم کیا تھا۔ اس عمارت کے ایک مختصر سے کمرے میں نثار حسن کاظمی کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کو ٹھوڑی سی ایک چارپائی تھی۔ ایک ٹمکتہ سی کرسی تھی اور ایک میز پر لائیں رکھی تھی۔ یونین کونسل کے سیکرٹری نے نثار حسن کاظمی کی طرف تھیں طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ”آپ شرعاً آدمی ہیں۔ ہم نے آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ کو اچھا کرہ پسند آئے گا۔“ نثار حسن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ بیٹھتے ہوئے رخصت ہوا۔ ”اب آپ آرام کریں۔ شام کا کھانا تو میں آپ کے لیے لاؤں گا اور کل صبح آپ کا کوئی بندوبست کر دیں گے اور ہاں کل ہمارے چیرمین صاحب بھی آپ سے ملنے آئیں گے۔ آج وہ پارکے ایک گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔“

نثار حسن کاظمی کا بستر چار پائی کی پائنتی پڑا تھا اور وہ اس سے ٹیک لگائے چھت کی کڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کا جھپٹا ہو چلا تھا اور سورج دریا کے دوسری طرف دوختوں کی لوث میں چھپنے لگا تھا۔ نثار حسن کاظمی جیسے گہرے خواب سے جاگ کر اٹھا اور مندر کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اس نے صدر دروازے پر لگا ہوا بورد پڑھا۔ "دفتر زمین کو نسل مکان والا" اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دریا کی طرف نکل گیا۔ صدر دروازے کی کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ پنج پچ ہی سیم اور نقور کی لکائی ہوئی بھر بھری سفید سفید زمین تھیں۔ سر پر آسمان کی چھت تھی اور دور دور تک کوئی چیز نظر میں شامل نہ ہوتی تھی۔ ہر شے خاموش تھی، خاموش اور ساکت۔ دریا کا پانی بھی انتہائی خاموشی سے بہہ رہا تھا اور ہر شے آہستہ آہستہ سرمئی اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ دھڑیلے پرگاؤں کی مسجد کے مینار اور پھیلے ہوئے کوٹھے ایک گہرے خباہت میں چھپتے جا رہے تھے اور خاموشی جو نثار حسن کے دل کے اندر تھی اور اس کے باہر تھی اسے ایک عجیب طرح کا سکون پہنچا رہی تھی جیسے جدائی کے زخموں پر مرہم کا کام کر رہی ہو۔

اگلے روز زمین کیسٹ کا چیرمین نثار حسن کاظمی سے ملنے آیا۔ اوپر تل کا ڈھیلا ڈھالا آستین کا کرتا۔ نیچے نیلے رنگ کا تہذہ سر پر چھوڑا سا چمکا جو اس طرح بانہا گیا تھا کہ اس کے تیل لگے ہوئے پٹوں کی چمک پر حاوی نہ ہو سکتا تھا۔ مرنچیں جن کے سروں کو تار دسے کر ڈاسا اوپر کی طرف اٹھا دیا گیا تھا اور سر پر تیل لگانے کے بعد وہی ہاتھ مرنچوں پر بھی پھیر دیا گیا تھا۔ عمر پندرہ تیس اور پچاس کے درمیان گھٹنی کا رنگ سفید جو مندر کے بیرونی صحن میں پیڑ تلے بانہ دہی گئی تھی۔ چیرمین کے



کنے سے پہلے گاؤں کے کافی لوگ کیٹی کے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ یہ سب لوگ علاقے کے معتبر تھے۔ نیز دار، یونیورسٹیوں کے ممبر، جج کے رکن، چودھری اور علاقے کے با اثر لوگ جن سے شارح حس کاظمی کا تعارف کرایا گیا اور اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کام اور اپنے فرائض کے متعلق انہیں تفصیل کے ساتھ کچھ بتائے۔ اب شارح حس کو اس طرح کی تقریر کرنے کا موقع مل گیا جس طرح پہلے دو ڈپٹی کمشنر صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کے لوگ خاموشی سے اس کی تقریر سنتے رہے مگر اس کو حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ تقریر کے بعد جو سوال پوچھے گئے ان میں سے بیشتر کا تعلق اس کے کام سے نہ تھا مثلاً آپ کی ذات کیا ہے؟ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کس خاندان سے آپ کا تعلق ہے؟ مہاجر ہیں یا مقامی؟ تعلیم کتنی ہے؟ شادی جو چکی ہے یا نہیں؟ اور جب یہ میٹنگ ختم ہو گئی اور مجمع آپس میں گھل مل کر منتشر ہو گیا تو ایک فقرہ جو شارح حس کاظمی نے دے دے دے لفظوں میں مدتیں مختلف لوگوں سے سنا تھا کانسی کے تھال کی طرح اس کے ذہن میں جھنجھٹاتا رہا ”پرچی چودھری صاحب جو مدح دنیا میں آتی ہے اسے بھلا کون روک سکتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کس کا دخل ہے؟ اور اسے یوں لگا جیسے یہی فقرہ اس کے سامنے کی سب سے بڑی کھائی ہے یا تو وہ خود اس میں گر جائے گا یا سمت اچھی ہوئی تو اسے پھلانگ کر نکل جائے گا۔

اپنی ہدایات تربیت اور حیرتیں کے شور سے شارح حس کاظمی نے باقاعدگی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ لوگوں کو اس کام کی اہمیت سے آشنا کیا جائے اور پھر اس کام کے پرچار کے لیے کام کرنے والوں کا

ایک پرنا دستہ گاؤں کی آبادی پر چھنڈ دیا جائے جو ہر شادی شدہ مرد اور عورت کو خانمانی منصوبہ بندی کے فوائد سے آگاہ کرے۔ شارح حسن کاظمی کی تربیت اور علم کے مطابق دیہاتی آبادی کے دو گروہ ایسے تھے جن کی صفت آرائی اس سلسلے کا اولین کام تھی۔ ایک گاؤں کی مائیاں اور دوسرے گاؤں کے حکیم۔ چیئرمین کے اختیارات کو استعمال میں لا کر یونیس کوئٹل کے سارے علاقے کی مائیں کو طلب کر لیا گیا اور شارح حسن کاظمی نے ان کی تربیت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آج ان کا پہلا لیکن پھر تھا۔ پلنے مندر کے بڑے کمرے میں جہاں آج سے ربع صدی پہلے تک محرومی اور دقت پھرتوں کی پر جا ہوتی تھی، آج شارح حسن کاظمی نے ایک نئی تدریس کی ابتدا کی۔

اس کے سامنے پچیس تیس دیہاتی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن میں بیشتر اچھڑ عمر کی تھیں۔ کوئی کوئی ڈھلتی جوانی کی تھی۔ جس نے جوانی میں بیوہ اور بے سہارا ہو کر دائمی کام شروع کر دیا تھا۔ چہرے سرے سے سب کی سب تجربہ کار اور بڑی پیرہنی معلوم ہوتی تھیں۔ شارح حسن کاظمی عجب غصے میں گرفتار تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔ سب سے پہلے اُس کے منہ سے نکلا۔ ”بھنو اور بی بیوہ“ پھر خاموشی چھا گئی پھر اُس نے سوچ کر کہا۔ ”میں اُسی کام کے متعلق آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو آپ برسوں سے کر رہی ہیں یعنی بچے کی پیدائش۔“ اس فقرے کے بعد جیسے شارح حسن کاظمی اپنے موضوع پر قائم ہو گیا اور اس نے پورے وقت اور علم کے ساتھ اپنی تقریر جاری کر دی۔ زمین کی گھٹی ہوئی پیداوار اور ادھک کی بڑھتی ہوئی آبادی۔ لمبے چوڑے خانمان کی معیشتیں۔ تعلیم کی ضرورت، اقتصادی برعالی اور خوش حالی کی وجوہات، مختصر کپے کے فوائد وغیرہ ایک دیرپا مذاکرہ آہستہ روی سے ہوتا چلا

جابر ہاتھ اور دیہات کی یہ دائیاں جبریں دبریں سے اس علاقے کی آبادی میں اضافہ کے خوش ہوتی اور مبارکبادیاں وصول کرتی چلی آئی تھیں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں کہ ان کے بظاہر نیک کام کے کیسے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ پھر اس نے گریزی انداز اپنی تقریر کا رخ آبادی کو کم کرنے کیلئے احتیاطی تدابیر کی طرف موڑ دیا۔ مافیہ حمل تدابیر سے پہلے ضروری تھا کہ وہ بچے کی پیدائش اور افزائش نسل کی ابتدا کا تذکرہ کرے چنانچہ اس نے طرح طرح کے چارٹ منبجھال کر سامنے لٹکا دیئے یہ دیکھئے نسل انسانی کا آغاز اس ایک جراثیم کے دوسرے جراثیم سے ملاپ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نے لمبی سی چھڑی اٹھا کر ایک چارٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نقشے میں عورت کا جسم ..... اور ابھی وہ فقرہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی دونوں عورتوں نے اپنے دوپٹے کا تپو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دوسری صف میں بیٹھی ہوئی تینوں عورتیں چارٹ پر سے نگاہیں ہٹا کر دیوار کی طرف دیکھنے لگیں پچھلے سے ایک عورت کی دلی ہوئی آواز ”ہائے ہائے میں یہ ڈاکٹر کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہا ہے۔“

کمرے کی فضا میں اب ایک ایسا لکچر اُپیدا ہو گیا تھا کہ تقریر جاری رکھنا منہ حسن کاظمی کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ گہرا کرکڑی پر بیٹھ جاتا گہرا سے اپنی تقریر کے لیے ایک اور سارے کا خیال آیا۔ اس نے پھر کہا۔ ”بہنو اور بیٹو! مجھے انصاف ہے کہ جو کام آپ ساری عمر کرتی رہی ہیں اس کے بیاہی پی آپ کو خواہ مخواہ بچکیا ہٹ جبریں ہے مالا مال آپ سب خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور آپ نے سن رکھا ہے کہ شرع میں مشرم نہیں ہوتی۔ یہاں

ایسا ہی مضمون ہوتا تو خدا کے کلام اور رسول اللہ کی احادیث میں بچے کی پیدائش کا ذکر نہ ہوتا۔ آپ جانتی ہیں کہ افزائش نسل تو ایک اعتبار سے خدا رسول کے حکم کی بجا آمدی ہے۔ اب کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا کھپاؤ ٹوٹ گیا۔ آنکھوں پر پڑتے ہوئے دوپٹے نیچے گر گئے، دیوار پر لگی ہوئی نظریں واپس چارٹ پائلز اور کچھیل دو سے ایک بڑی عمر کی دائی کی آواز آئی جو اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے مخاطب تھی۔ "اٹھیے ڈاکٹر ٹیکسہ ہی تو کہتا ہے شرح کے آگے کیا شرم جو چیز تم ساری عمر دیکھتی رہی ہو اس کی تصویریں دیکھنے میں کیوں شرماتی ہو؟"

خدا خدا کر کے شارس کاظمی نے اپنی تقریر ختم کی اور دائیوں کو اگلے روز صبح نو بجے دوسرے لیکچر کے لیے آنے کی ہدایت کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پورے اشارہ والی دائیوں کی تربیت پر صرف ہوئے۔ شارس کاظمی کا کام آسان نہ تھا۔ حدیثوں کے ترجمات ان کے دلوں سے دور کرنے تھے صرف علم ہی کافی نہ تھا۔ کرشماتی یہ تھی کہ وہ اس کام کی اہمیت سے واقف ہو جائیں اور اس کے اچھا اور ضروری ہونے پر ایمان لے آئیں۔ سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ اگر وہ خاص علمی انداز سے گفتگو کرتا تو وہ بیزار ہو کر بے تعلق ہو جاتیں اور اگر وہ انہیں ذرا ڈھیل دیتا تو وہ ایسی کھل کر باتیں کرنے لگتیں کہ کلاس روم کی گفتگو اور فقرے بازی بے حیائی کا نمونہ بن جاتی۔ ایک روز جب وہ نہایت علمی اور صاف علمی انداز میں مواد وحدت کے اختلاط کے وقت احتیاطی تدابیر کا ذکر کر رہا تھا تو ایک دائی نے ہنس کر کہا "ڈاکٹر جی آپ کی تو شادی بھی نہیں ہوئی، آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟" اور اس پر سب کی سب اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں کہ شارس کاظمی

کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

ہن سب مشکلات کے باوجود وہ خوش تھا کہ اُس کے کام کو آگے بڑھانے والا یہ میٹرو دستہ آہستہ آہستہ کام کی اہمیت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔  
 مانع حمل دواؤں اور احتیاطی تدابیر پر اُن کو مفصل یکپور دیئے گئے تھے اور شارح حسن کاظمی کو یقین تھا کہ جب یہ عورتیں تربیت مکمل ہونے پر سارے علاقے کے گھروں میں پھیل جائیں گی تو گویا اس علاقے میں خاندانی منصوبہ بندی کا پہلا سوجھ بوجھ قائم ہو جائے گا۔

خاندانی منصوبہ بندی کا دوسرا سوجھ بوجھ علاقے کے مقامی طبیب، حکیم اور سیانے تھے۔ چیئر مین نے یونین کونسل کے سارے ممبروں سے کہا کہ اپنے اپنے علاقے کے حکیموں کی فرمائش اسے بھیج دیں۔ یونین کمیٹی نے تمام حکیموں کو خط لکھ کر اپنے دفتر میں بلا لیا اور مقررہ روز سارے علاقے کے حکیم گھوڑوں پر سوار دفتر میں پہنچ گئے۔ قریبی موانع کے حکیم پیدل چل کر بھی آئے۔ غرضیکہ اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ شارح حسن کاظمی کو اپنے دعوت ناموں کا یہ ردِ عمل دیکھ کر انتہائی خوش ہوئی۔ وہ ہنس ہنس کر ہر ایک سے ہاتھ ملاتا۔ اس کا نام یہ اپنے رجسٹریس درج کرتا اور انھیں اپنے کام میں شریک کرتا جاتا حکیموں کا کام دایموں کی نسبت زیادہ آسانی تھا۔ دایماں تو دراصل ایک طرح کی فصقہ کالم تھیں جنہیں حکیم حضوں میں گھس کر بغاوت پھیلانا تھی مگر حکیم تو میدانِ جنگ تک گور بارود سپلائی کرنے والے دہشتے کا کام کرنے والے تھے اور پھر اس خدمت کے لیے اقتصادی مفادات

الگ تھے۔

شارح حسن کاظمی نے علاقے کے تمام حکیموں کو سمجھا دیا کہ یہ کار خیر ان کے تعاون کے بغیر نہ ہو سکے گا۔ احتیاطی تدابیر کے لیے لاکھوں روپے کا سامان دیہاتوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی فروخت اور تقسیم کا کام حکیم صاحبان کو سنبھالنا پڑے گا۔ پھر شارحین کاظمی نے اپنا کس کھولا۔ ”یہ دیکھئے اس ڈبیا میں جھاگ والی گولیاں ہیں اور میں گولیوں کی قیمت صرف چار آنے سے اور یہ بھی ربڑ، دمن پیسے کے بارہ۔ ضرر سے یہ چیز خریدیئے تو آپ کو صرف ایک کے عام آٹھ دس آنے پڑیں گے لیکن سرکار کی مرمانی ہے کہ آپ لوگوں کی مالی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اتنی کم قیمت مقرر کی ہے، یعنی دس پیسے کے بارہ۔ میری گزارش ہے کہ آپ ان دونوں چیزوں کا شاک اپنی اپنی دکانوں پر رکھ لیجئے اور ضرورت مندوں کو سپلائی کیجئے دونوں احتیاطی تدبیروں میں سے اگر ایک کا بھی استعمال کر لیا جائے تو کافی ہے۔“

تقریباً یہ حصہ سس کر حکیموں کے چہروں پر دلچسپی کی کوئی خاص اثر نظر نہ آتی تھی بلکہ وہ چیرٹیں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے خاموشی سے اس کو کہہ رہے ہوں کہ آپ نے آخر ہم کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا اب ہم سے ایسے کام لیے جائیں گے۔

اب شارح حسن کاظمی نے تڑپ کا پتہ بھید نکالا۔ ”جناب حکیم صاحبان اس کار خیر میں شرکت کے لیے ہم آپ کی تنویری بہت مالی امداد بھی کریں گے حکومت نہ صرف اس ملک کی بستی اور خاندانی منصوبہ بندی کی کامیابی میں دلچسپی لے رہی ہے

بلکہ آپ کی مالی بہبود بھی اس کے پیش نظر ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہو گا کہ آپ ہمارے پاس سے اگر دس روپے کا مال خرید کر اپنے پاس رکھیں گے تو اس کو بیچ کر ہیں صرف پانچ روپے واپس کر دیں گے باقی پانچ اپنی خدمات کے عوض منافع کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں گے۔

اب معزز حکیم صاحبان کی دلچسپی خاندانی منصوبہ بندی میں غزوں تر ہونے لگی اور ہر طرف سے اس تجویز کو غرضی آمدید کہنے اور اس کی کامیابی کے لیے مزید تجویز پیش کرنے کی پیش کش شروع ہو گئی۔ ایک حکیم صاحب نے فرمایا کہ مسجدوں کے خلیفوں سے بھی اس کار خیر میں شرکت کرنے کے لیے کہا جائے لیکن شاذ حسن کاظمی نے اس کی حامی نہ بھری۔ پرائمری اسکولوں کے مدرسوں کے متعلق خیال یہ تھا کہ جہاں تک اسکولوں کے امداد کا سوال ہے وہاں تک ان کا دائرہ عمل بچوں تک محدود ہے اسکول سے باہر البتہ اگر وہ چاہیں تو نئے خیالات کی ترویج میں کافی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بعض حکیم صاحبان نے ان احتیاطی تجاویز کو حفظانِ صحت کے لیے بھی مفید قرار دیا اور جب ان اشیاء کو اپنی دکان پر اشاک کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوتا تھا ہر شخص دوسرے سے بازی لے جاتا چاہتا ہے۔

شاذ حسن کاظمی نے کہا: ”جناب حکیم صاحبان سرکار کا حکم یہ ہے کہ میں پانچ روپے نقد لے کر دس روپے کا مال آپ کو دے دوں۔ یہ دس روپے کا مال بذاتِ خود چالیس پچاس روپے سے کم نہیں یہ تو صرف دیہات کی مالی حالت اور نئے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ایسے کم داموں پر آپ کو دیا جا رہا ہے لیکن آپ کے چیئر مین صاحب آپ پر مزید مہربانی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ آپ میں سے جو صاحبان ہم کو یہ حلف نامہ ملکہ دیں کہ وہ دس روپے کا مال ہم سے وصول کر رہے ہیں اور اس کو فروخت کر کے ہم کو پانچ روپے واپس کر دیں گے اور پانچ روپے خورد رکھ لیں گے اُن کو مال فی الحال بغیر قیمت وصول کیے دے دیا جائے اور قیمت صرف اسی وقت وصول کی جائے جب مال فروخت ہو جائے۔

اب حکیم صاحبان نے جھاگ والی گولیاں اور بڑا اس ذوق و شوق سے حاصل کرنے شروع کیے جیسے کچھ دار تاجر منڈی میں عام سستے دیکھ کر زیادہ سے زیادہ مال خریدتا ہے۔

اب دوسرا سوچ بھی قائم ہو چکا تھا۔ شارحین کاظمی نے اپنی کارکردگی کی ملامت پر پلٹ اپنے انسراں بالا کو یسین شروع کر دی۔ وہ اُس کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی کامیابی سے مطمئن تھا کبھی کبھی دیہات کی داییاں اس کے دفتر میں آکر اسے اطلاع دیتیں کہ کیسے ابتدائی مداخلت کے بعد گھروں میں مٹی چولہے کا کام کرنے والی عورتیں اب ان کی باتوں پر کان دھرنے لگی ہیں اور کبھی کبھی وہ خود اپنے علاقے کے دیہات میں آئی حکیموں کی مدد کا نل کا دورہ کرتا اور خدا اُن سے گشگو کے اپنے کام کے متعلق نتیجہ نکالتا۔ جب وہ اپنے دیئے ہوئے مال کی قیمت فروخت اُن سے وصول کرتا تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ حق بھگتا پر پختہ رہا ہے اور داییاں جو اس ہم کے ہر اہل دستے کا کام کر رہی ہیں نئے خیالات پھیلا کر حکیموں کے مال کی پکری کے راستے کھول رہی ہیں۔

شارحین کاظمی کے انسراں کے کام سے خوش تھے اور اُس کو ہدایات اور ہی



تھیں کہ اب وہ اپنے علاقے میں اگلا قدم اٹھائے اور قریبی شفا خانے سے مل کر احتیاطی مرمانہ آپریشن کے لیے بھی رضا کار مہیا کرے اور اگر ہو سکے تو اپنے علاقے کی عورتوں میں زیادہ مستقل احتیاطی تدابیر کو عام کرنے کی کوشش کرے لیکن نثار حسن کاظمی ابھی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اُسے ان کاموں کے لیے کس قدر سخت جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ گاؤں والے ابھی تک اسے ایک باہر سے آئے ہوئے اجنبی کی طرح مٹتے تھے۔ گاؤں کی زندگی اور طور طریقوں کو اختیار کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے اوپر جبر کر کے اپنے اندر دیہاتی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاؤں والے نہ اس کی عزت کرتے تھے نہ اس سے ڈرتے تھے محض اس لیے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پاس دراصل کوئی سرکاری اختیارات نہیں ہیں۔ ایک دن ایک دیہاتی نے اس سے پوچھا تھا۔ ”ڈاکٹر جی یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے سولہ جہتیں پڑھی ہیں۔“

اس نے کہا یہ درست ہے تو دیہاتی بے ساختہ بولا۔ ”پھر بھی آپ کو تحصیلدار کی نہ ملے گی؟“ نثار حسن نے کہا۔ ”ہاں مگر میں نے تو تحصیلداری کی کوشش ہی نہیں کی۔“ مگر دیہاتی نے فوراً کہا۔ ”یار ڈاکٹر تحصیلداری نہیں ملتی تھی تو گنداری کیلئے۔“ نثار حسن کاظمی جب میر کے لیے نکلتا تو گاؤں کی عورتیں جو سارا دن گاؤں والوں کے سامنے بغیر گھونگھٹ نکلتے ادھر سے ادھر پھرتی رہیں اُسے دیکھ کر فوراً گھونگھٹ پہنے کر لیتیں اور نثار حسن کو احساس ہوتا کہ وہ اس گاؤں میں باہر والا ہے۔ گاؤں والے اس کے پاس آکر یونی کو نسل کے جیڑ ہیں کو لاکھ لاکھ گالیاں دیتے

اُسے شکایت اور دستہ گیر کہتے لیکن جب اُس کے سامنے آتے تو اس کی خرابی بھی کہتے۔ اُس کے پاؤں بھی چھوڑتے اور گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے محض اس لیے کہ اس کے پاس اختیارات تھے۔ وہ بچہ بیس سے نفرت کرتے مگر قتلے کا ایک سپاہی بھی مگر گاؤں میں آجاتا تو گاؤں کا ہر شخص مذہب ہو کر اس سے بات کرتا۔

آہستہ آہستہ شاد حسن کاظمی پر اس کائنات کے اسرار و رموز کھلنے لگے تھے اور وہ سوچتا تھا وہیات میں کام کرنا کسی شہر والے کے برابر ذہانت کا آخری امتحان ہے لیکن اسے ایک بات کا ہمیشہ سہارا رہتا تھا اور وہ یہ تھی کہ اُسے اپنے کام کی اہمیت اور ضرورت پر ایمان تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے اس میں اُس کے ملک کی بھلائی ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس زندگی کی ہزار مصیبتیں برداشت کر تا جا رہا تھا اور اُس نے گاؤں کی زندگی کی اداسی کو بھی برداشت کر لیا تھا جو گھن کی طرح اُس کی روح کو کھائے جا رہی تھی۔

گیہوں کے کھیت پہلے سے بھورے ہو کر کھٹے شروع ہو گئے تھے اور فضا میں گرمی اور اداسی پھیلنے لگی تھی۔ فصلیں کھٹے لگی تھیں اور درگاہوں اور مزاروں پر عرس اور میلے لگنے شروع ہو گئے تھے۔

شاد حسن کاظمی برنیس کو نسل کے صحن میں روخت کے نیچے بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ساتھ کے گاؤں کا منبر دار اس کے پاس آیا اور دلاؤ دلاؤ کے لہجے میں اُس سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم اُس کی آواز میں غصہ بڑھنے لگا اور وہ اونچی آواز میں بولا: دیکھئے میں آپ کو بتاؤں گا کہ میں

ٹانگیں لے کر آپ کے اُس حکیم پر ٹوٹ پڑے گا اور اُس کا سر توڑ دے گا۔ آخر  
بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ؟

نثار حسن نے بنزور کو قتل دی اور بار بار یہ کہا آپ گھبرائیے نہیں میں خود آکر  
اس کی تحقیق کروں گا۔ آج ہی تحقیق کروں گا یہ بھلا ہو کیسے سکتا ہے یہ تو سرکاری  
مال ہے ؟

سرپرکز نثار حسن کاظمی اپنے گاؤں سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے قریبی گاؤں  
میں پہنچا۔ گاؤں کے میدان میں چھوٹے چھوٹے ٹکے، لڑکیاں کھیل رہے تھے۔  
دن بھر ٹوٹتی رہی تھی اور اب ٹوچنا تو بند ہو گئی تھی مگر مٹی کے دندے ہو ایں معلق  
ہو گئے تھے جس سے گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ میدان میں ہر طرف گرد اڑ رہی تھی اور  
گاؤں کے بچے دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیلوں میں مشغول تھے وہ  
گرد و غبار اڑاتے اور سر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ ان کے پاس آٹھ دس  
خبارے بھی تھے جنہیں کبھی وہ ہوا میں اچھالتے تھے اور کبھی فٹ بال کی طرح پاؤں  
سے ٹھوکر لگا کر اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک طرف کھڑا  
یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نثار حسن کاظمی نے اُسے محبت سے اپنے پاس بلایا۔  
”کیوں پتیر غبار سے تم کہاں سے بیٹے ہو؟“ ”حکیم جی کی دکان سے“  
اس نے بے لنگاہ جواب دیا۔ ”کتنے میں آتا ہے؟“ ”نثار حسن نے پوچھا۔ ایک  
آنے میں؟“ لڑکے نے کہا۔

نثار حسن کاظمی نے جیب سے ایک آنہ نکال کر اُسے دیا اور کہا۔ ”وہی شام بھی  
ایک خریدا۔“ لڑکا کتنی لے کر گلی کی طرف بھاگا۔ نثار حسن کاظمی جلدی جلدی قدم اٹھاتا

اس کے پیچھے چل کر گلی کے نوٹر پر ٹک گیا جہاں سے حکیم صاحب کی دکان صاف نظر آتی تھی۔ لڑکے نے ایک آنہ حکیم صاحب کو تھما دیا۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی صندوقچی کا ڈھکنا اٹھایا۔ اندر سے ایک بڑا نکالا اُسے کھول کر منہ کے قریب لے گئے۔ دونوں ہونٹ اُس کے اوپر رکھے اور پھیسپڑوں کی ساری ہوا پورا اندر لگا کر اس کے اندر بھر دی۔ نثار حسن کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ کمبخت چیز پھیل کر اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ اب وہ غباؤ پھیل کر ایک اچھے خلعے تر بوڑھتا بڑا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنی صندوقچی میں ڈال لی اور غبار سے پرہیز کر کے بچے کے سامنے کر دیا جہاں سے لے کر بھاگتا ہوا آیا اور باقی بچوں میں شامل ہو گیا۔ نثار حسن کاظمی میدان کے کنارے اپنا سر تھاڑے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کائنات میں ہر طرف غبار سمی غبار سے اڑتے پھرتے تھے۔ دس پیسے کے بارہ مگر آنے کا ایک ایک!

( " نقدش " لاہور )

## دُخُون

رات تھلیک تھی۔ مگر عودت راستے سے واقف تھی۔

سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتی گئی۔ تھکی سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ مگر دھیمی رفتار قائم تھی۔ اندھیرے میں اسے سامنے بی آربی نر کا ہانا پر دھالا پل نظر آیا۔ نقابست سے لڑتے ہوئے اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو تادموں بھرے آسمان کی ہلکی روشنی کو ایک مینار کا تاریک ہیولا کاٹ رہا تھا۔

یہ مینار نر کے غرائی کنارے پر ایک یاد گار ہے۔

یہ اس خون کی یاد گار ہے جو ایک عظیم مقصد کے لیے نر کے گھرے پانی اور سڑک کے سخت سینے پر خواروں کی مانند اُبلتا۔ محبت علی شاعر نے کہہ ہے کہ :-  
میں خون رنگ برنگ چمن ہے ..... خراب دہس ہے ..... ہر باپ کا بدن ہے ..... بھائی کا بائیں ہے ..... ہر ماں کے دل کی دھڑکن ہے ..... بچوں کا بھوڑ لپس ہے ..... کھیت کی پھین اور مزدور کی لگن ہے ..... یہ خون سرمایہ وطن ہے ۔“

یہ یاد گار زنجیروں کے حلیے میں ایستادہ ہے۔ گول فرش پر پہلی چوڑہ

جس کے ماتھے پر تھڑ بٹالیں کے متابع حیات نے والے شہیدوں کے نام  
گھدے ہوئے ہیں — چوتھے کے اوپر چوکر مینار فضا میں اٹھتا ہے۔ جس پر  
گندہ ہے

” اُن شہداء کی یاد میں ”

جہانک و بھارت جنگ ستمبر ۱۹۶۵ میں کام آئے  
اس راہ سے گزرنے والے ہر وطنیہ اسلام کے ان سپاہیوں  
کو خراج عقیدت پیش کرتے جاؤ جو اپنا سب کچھ قربان کر کے ہماری بقا کا  
سامان کر گئے۔

مینار کی چوٹی پر ایک گنبد ہے — مسجد کے مینار والا گنبد — اس ماحول کا فائدہ  
جس کی بقا کے لیے خون بہا — جوان جسموں کے جھپٹے مارے گئے — شہداء باؤنڈوں  
اور بھرپور رانوں کی قاشیں کٹ گئیں — فولادی ہاتھوں اور نمونائی پیشانیوں کے شفق  
رنگ ٹکڑوں نے توپوں کی پربول گھسی گرج کے ساتھ سرخ فضا میں ابدیت کا قریب  
کیا — جس سے سکھ ہو کر دشمن ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ عورت مات کی تار کی میں اس یا بنگا کے پاس آکر رکھی۔

وہ یہاں پہلی دفعہ نہیں آئی تھی — اپنے گاؤں سے سات میل فاصلہ پیدل چل  
کر وہ دو چار دفعہ پہلے بھی یہاں آئی تھی — کبھی ساتھ والے درخت کے نیچے بیٹھ  
کر قرآن پڑھتی رہتی اور کبھی حاشیے والی زنجیروں کو تمام کر چوتھے کو کھٹک باندھے  
دیکھتی رہتی جس پر دین کا نام دے دیتا تھا۔

دین اس کا ہمسایہ تھا — بچپن اور جوانی کا ہمسایہ — جو بعد میں فوج میں

بھرتی ہو گیا تھا۔

وہ کمیت پر اس کے لیے لسی لے کر جایا کرتی تھی۔ کیونکہ دونوں کی زمینیں ملحقہ تھیں۔ جب وہ اپنے بابا کے لیے روٹی لے جانے لگتی تو دینو کے گھر میں بھی جھانکتی۔  
 ”مامی، میں جا رہی ہوں ادھر۔ لسی دینی ہے تو دے دو۔“

اور مامی لگا تار دھانیں دیتے ہوئے اسے ایک پوٹلی اور مٹی کا برتن دے دیتی جو وہ اپنے لچکدار کولے پر لٹکا کر دھڑکتے دل اور لڑناں قدموں سے دینو کے آگے لے جا کر رکھ دیتی۔

یہ عورت ان دنوں مکی پھلکی تازک اور سبک تحصیل تھی۔ وہ دم حجم کر کے ملتی تو دینو کے دل میں برکھا ہونے لگتی۔ جو گاؤں میں گنکا کھیلنے والا پچھٹا تھا۔ کبڈی کا پھر تالا کھلاڑی تھا۔ اور چاندنی راتوں میں سریلے گلے کی اونچی تان پر ماہیا لگانے والا تھا۔  
 ان کا گاؤں سرحد کے پاس ہی تھا۔

پاکستان بنایا بنا تھا۔ اور ہجرت کی خون بھری داستانیں ابھی تازہ تھیں تانوں کے اٹھنے، معصوموں کے قتل اور بربریت کی گواہیاں ابھی لوگوں کی آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ مٹی ہوئی عصمتوں کی پتر مرہ راکھ ابھی سلگ رہی تھی۔ کشمیر کی جنگ جدی تھی۔ ایسے میں شام کے وقت لوگ حقے کے کش لگاتے ہوئے ذکر چھڑاتے کر شاہ ہندوستان ملکہ دے۔ اور ان کا گاؤں تو سرحد کے پاس ہی تھا۔

کیا وہ ڈرامہ پھر ہو گا؟ دینو غصے سے کھڑی کر سوچتا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اس نے ایک دن فرج میں نام لکھا دیا۔

”یہ مزیداری کرتے کرتے تمہیں فرج کی کیا سوجھی ہو گی؟“ چودھری نے

گلی سے گزرتے ہوئے پوچھا۔

”چودھری جی ! دینو نے بٹے جذبے سے کہا تھا۔ ہم لوگ مرنے کو تیار  
ہوں گے نو گاؤں کی بیٹیوں کی عصمت محفوظ رکھے گی۔ آئیں تو سی ہندوستانی  
ادھر۔ چمڑا نہ اڑھیر دوں اُن کا۔“

اور دروازے کی اوٹ میں چھپ کر سننے والی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے  
تھے۔ اب وہ کس کے لیے تھی بے کر جائے گی ؟  
دینو چلا گیا۔

لڑکی کی شادی گاؤں کے ایک اور نوجوان سے ہو گئی۔ اور جب ایک دن  
دینو دروئی پہنے گاؤں میں آیا تو اس نے بڑے دکھے ہوئے دل سے اس لڑکی کی  
شیر خمار بچی کو پانچ روپے اور ایک جھنجھٹا دیا تھا۔ اور بٹے بٹے بھاٹا  
گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ بچی کی ماں گہری آنکھوں سے جانے والے فوجی کو دیکھتی  
مہی۔ اور پھر مڑ کر بے اختیار اپنی بچی کو چوم لیا۔ جس کی حفاظت کے لیے اس نے  
دروئی پہنی تھی۔

وہ بچی سولہ سالہ شیار تھی۔ اور اس کی ماں ایک بھر پور عصمت تھی۔ جب ستمبر  
۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے واقعی حملہ کر دیا۔

مگر دینو کی ددوی نے دونوں کی عصمت بچال۔ اور وہ اس کے لیے سراپا  
تشرکتیں۔ اس لیے کہیں کبھار اس مینار پر فاتحہ خوانی کے لیے آتی تھیں۔ اور  
ایک دفعہ تو لڑکی بھی آئی تھی۔ مگر آج وہ عورت اکیلے تھی۔ اس کا خاندان جو ایک  
بڑے زمیندار کا مزارع تھا، پیچھے گھر میں تھا۔



یادگار کے پاس پہنچ کر اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ سخت تھکی ہوئی تھی۔ جب وہ میلہ کے پاس پہنچی تو ابھی ہوئی سیکیاں اس کے سینے میں طوفان مچا رہی تھیں۔ — زنجیر کی پردہ کیے بغیر وہ بھلا لگی — اور قریباًڑھکی ہوئی حیرت سے ملک جا پہنچی۔ — والہانہ طور پر اس نے اپنا چہرہ دینکے نام پر رکھ دیا۔ اور بندھ بیٹھا کہ اونسے مزید لٹی لگی۔

پہلے وہ لگتی سیکیاں ابھریں — پھر ہچکیوں کا تار بندھ گیا۔ — جس سے اس کا سارا جسم جھٹکے کھانے لگا۔

پھر چوتھے پر دونوں ہاتھ بے تابی سے پھرتے ہوئے ہوئی۔

”وینو..... تم کیوں مرے..... اگر اب بھی..... زمیندار.....“

سیکیوں کے سیلے نے اسے مزید نہ بونے دیا۔ تب اس نے لپٹی ہوئی چادر ڈھیل کی۔ — اور اپنی سو سالہ کنواری لڑکی کی خون آلود شلوار وینو کے نام پر رکھ دی.....

پھر وہ بک بک کر جھینسا نے لگی۔

ایک خون کی یادگار کو، دوسرا — بالکل مختلف قسم کا — خون آنسوؤں میں گھل گھل کر جگور رہا تھا۔

(”آپ لطیف“ لاہور)

## سامانِ شبنون

آہنکی فرش پر نوحہ کنواری کے گیلے پیروں کے نشان ہیں۔  
 جب جن کے سینے کی گرم ہوا انہیں بوسہ دینے کے لیے جھکے گی تو یہ نشان  
 خود بخود اس بوسے میں جذب ہو جائیں گے۔ اور سیاہ فرش پر سے ان کا نشان  
 یوں مٹ جائے گا جیسے مائع گیس پر کراپتا دھند کھودیتا ہے۔ پھر گیلے پیروں کا نشان  
 جن کا مسموم بوسہ ہی کرسیاہ فرش پر آگ برساتا احساس کے درختوں میں نکل جائے گا  
 اور کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ ہر سیاہ فرش پر کسی نہ کسی نوحہ کنواری کے پیروں کے نشان  
 ہوا کرتے ہیں۔

میری ساری عمر ایسے ہی نشانوں کے تعاقب میں گندی ہے۔ میں نے ماہ  
 کو اپنے سامنے حالتیں بدلتے دیکھ لے۔ ٹھوس سے مائع اور مائع سے گیس۔ میری  
 زندگی کا سیاہ فرش بہت چکنا ہے اور اس پر یادوں کے نشان بہت جلد مسموم ہوں  
 کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میرے کمرے کے سامنے ایک اونچا پیل کا پڑھتا۔ گریوں میں اس کی آخری  
 پیننگ پر ایک چیل کا گھونسلہ نظر آیا کرتا تھا۔ اس گھونسلے میں انڈہ سینے والی چیل  
 جن کی دھوپ میں میری طرح تھا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی مجھے اس چیل پر بہت

ترس آیا کرتا تھا۔ بھری دوپہر میں جب مجھے اہٹاس کے زرد خانوس روٹھکوں سے کوئل کی آواز آتی۔ سروٹس کوارٹھ کی جانب سے کوئل شوق بچہ پیسے کی آواز بند کرتا تو مجھے ایڑکنڈیشز کی مسلسل گھر گھر سے خوف آنے لگتا۔ ٹھنڈے کمرے میں بسی ہوئی ایڑخس شز کی خوشبو یوں کی طرح ناک میں گھسنے لگتی۔ پھر یکدم میری ناک بند ہو جاتی۔ میں سوں سوں کرتا کھر کی میں چڑھ بیٹھتا اور پردے کی جھری سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر دور دور تک تلخے کی طرح چمکتی روشنی ہوتی اور دیواروں سے پڑیلوں سے روشنیوں پر ایسا ہلتا ہوا پانی نظر آتا جیسا گرم سڑک پر دور سے ایک آبی سا سراب ہی جایا کرتا ہے۔

اتنی ابوکایہ کمرہ جس میں تین ٹی کا کور تھا، فرانسیسی وضع کا بیڈروم تھا۔ دیواروں کی جلد صاعب لوگوں کے فزائیدہ بچے کی طرح صاف، ملائم اور بے داغ تھی۔ سارا فرانسیسی فرنیچر ایمر ڈیڈ تھا۔ امی کی الماریاں ڈیڈ لیگ ٹیبل، شلف، چٹ آف ڈیڈ اسب سفید تھے، جن کی جلد نارنیکا کی تھی۔ چابی لگتے ہی الماریوں میں ہونے ہوئے گھنٹیاں بجنے لگتیں جیسے گلو کی گھڑیوں میں عموماً بجا کرتی ہیں مگر سے میں ہر طرف سفید پردے تھے۔ ابریشمی، آب دواں سے بے فرد پردے — اسی سفید کمرے میں میری سفید ماں آرش لسن کی چادر پر سفید پلاسٹرافٹ پیری کے بنے ہوئے ٹخنے ایک دوسرے پر دھرے گھنٹوں لیٹ رہتی تھی۔

میری ماں بڑی نازک عورت تھی — ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب کی طرح گرم و سرد سے بے نیاز، وہ آرائش، زیبائش اور نمائش کے لیے بنی تھی۔ کسی قسم کی زینائش سے اس کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد اس کا نازک جسم کچھ کم ہی بار آور

ہونے کا حوصلہ کر سکا۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن اس محبت کا اظہار ہمیشہ تجھے لانے تک محدود رہا۔ وہ نہ کسی کو بھیج کر سینے سے لگا سکتی تھی اور نہ ہی کسی کی دالہ نہ گرفت کی تحمل ہو سکتی تھی۔ میری ماں کو انسانی جسم کی خوشبو سے نفرت تھی۔ اُسے مجھ سے بُرائی تھی، طالعوں سے بُرائی تھی۔ اُسے میرے گنچے باپ سے بُرائی تھی۔ وہ سادھی اپنے جسم پر اپنے کپڑوں میں، اپنے بستر پر بدیسی خوشبو چھڑکتی رہتی تھی۔ میری ماں نے جب کبھی کسی سے ہاتھ ملایا، بعد میں اپنے نئے رد مال سے (جس پر اس کے نام کا پہلا حرف انگریزی میں کشیدہ کیا ہوتا تھا) اپنا ہاتھ ضرور پونچھا۔ میری ماں جس کمرے میں داخل ہوتی اُس کا پہلا سانس لیا اور انسانی ہاتھ کی طرح محسوس کرتا تھا۔ وہ اُس ایک سانس میں کمرے کے بعض، اس کی گھٹن اور اس کے رہنے والوں کی خوش ذوقی کا اندازہ لگا لیا کرتی تھی۔ اس لیڈی آف شیلڈ، اس ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب، اس پلاسٹک پیرس کی میڈونانے اپنی محبت کی شدت میں مجھے اس طرح پالا جیسے کسی سراپ کے خوف سے کوئی راج کنیا اپنا بچہ کسی مٹھ میں پال رہی ہو۔ مجھے اسکول جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرے تالیق گھر پر اگر مجھے پڑھاتے تھے۔

سوشلس کو اثر کی طرف قدم دھرتا تو درکنار ادھر دیکھنے کی بھی ممانعت تھی۔ اس طرح نیلے لمبو پر مقامی سیاہ لہو کی پڑچھائیں پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ ہمارے دشتہ واردوں سے ماں کبھی کی کٹ چکی تھی۔ وہ اب ایک ایسے سوشل سرکل میں مرتبی تھی جہاں سب دوزخ زدہ تھے لیکن کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ میری ماں کے ارد گرد غیر فردی مصروفیات کا کچھ ایسا جال پھیلا تھا جیسے گھنی المیر کی باڑ کر

امریل نے ڈھانپ رکھا ہو۔ وہ فرصت کے لمحوں میں بیمار رہتی تھی اور غیر ضروری مشاغل کے وقت چاق و چوبند۔ میری ماں اُن عہدوں میں سے تھی جنہیں عرب بدوی اتانا کہتے ہیں۔ کمزوری اور بیماری کے بدلنے انہیں ایک ایسی خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ پھر وہ نہ اپنے نہ کسی دوسرے کے کام کی رہتی ہیں۔

ابو گنجے تھے، خاموش طبع تھے اور دو تہہ تھے۔ ہر دن کے ساتھ ساتھ اُن کے گنجے بنے، خاموشی اور دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سردیوں کی لمبی تسکون میں وہ کبھی کبھی میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے۔ اُن کے ہاتھ میں ہمیشہ اُن کا بریف کیس ہوتا اس بریف کیس کے کئی خانے تھے اور ہر خانے میں ضروری کاغذات اور اہم چٹیاں ہوا کرتی تھیں، پھر وہ بپ کھول کر کچھ ایسے خط کال لیتے جن میں مختلف مشینوں کی بٹمیں موجود ہوتیں۔ اُن کا سر بیرونی ممالک سے آئے ہوئے خطوں پر جھک جاتا اور وہ خاموشی سے خط پڑھتے بہتے اور جب خط ختم ہو جاتا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ میں اپنے اُن کھلونوں کے انبار میں سے انہیں دیکھتا رہتا جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خدا جانتے کہوں میرا جی چاہتا کہ میں اٹھ کر ابو کے چکنے چکنے سر پر ہونٹ رکھ دوں لیکن اُن کے خاموش چہرے کو دیکھ کر مجھے عجیب سا خوف آتا۔

سردیوں کی طویل راتوں میں جب میرے کمرے میں سرخ میٹر جلتے اور گرم پانی کی بوتلی میرے پیروں کو چھوتی، بستر میں سے لیوینڈ کے پھولوں کی خوشبو آتی اور پیروں کی رضائی پر میری کاک کی کتابیں بکھری ہوتیں۔ ایسی راتوں میں جب اچانک کھر کی پریات کے وقت بھل کی چپک سے چاند ہو جاتا۔ میں جاگ اُٹھتا۔ سردیوں

کی بارش کھڑکیوں پر بجتی۔ گرم پانی کی بوتل ٹھنڈی ہو کر قالین پر لڑھک جاتی اور میں جاگن رہتا اور سوچتا رہتا۔

ہمدرد خزاں کے دل تکیوں اور پھولوں کی وجہ سے تکلیف دہ تھے۔ یہ مدفن چیزیں مجھے بہت پسند تھیں اور ان مدفنوں سے میں بہت خوفزدہ تھا ایک دفعہ میں نے ایک زرد رنگ کی تھلی پر ایک گلاس کے نیچے بند کر دی تھی۔ اس کا دل بھلانے کے لیے میں نے دو چار رنگیں پھیل بھی ساتھ مقید کر دیئے۔ یوں زرد تھلی کو محسوس کر کے مجھے عجیب فرحت سی محسوس ہوئی، لیکن جب میں دھیر کا کھانا کھا کر لوٹا تو وہ تھلی پھولوں کی قبر میں پسو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے پانی چلا کر زندہ کرنا چاہا تو اس کے پھول کا زرد براہ میری آنکھوں پر اتر آیا۔ اس کے خوش رنگ پر زندہ رہے لیکن وہ خود مر گئی۔ تنہائی کی موت!

میرے تجربے چھوٹے چھوٹے تھے جن کا تعلق روح اور ذہن سے بہت گہرا تھا۔ میں گناہ اور شراب کے چکر میں دوڑتا تھا۔ اتنا دھنسن گیا تھا کہ تھلی کے یوں اچانک مرجانے کو میں نے دوسرخ میں گھر بنانے کے مترادف سمجھا اور مدد تک پر اشیئت کے طور پر بھوکا رہا۔ یہ بیکاروں — یہ بیکار دانتیں یہ آسائش کے پالنے میں چاندی کا چمچ منہ میں لیے ساٹھی سی جلد والی چھت کو تکٹنے والا بچہ عجیب کرب کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف وہ تو گرمیوں کی لمبی دوپہر تھیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ایک امیر بچے کی گرمیوں کی سرودھ پیریا اسی پلاسٹک پیرس کے بنے ہوئے ٹخنے آپس میں جوڑ سکی جاسوی تھل بدل کر پڑھتی سو جاتی، اور میں کر لوں والا کروں چھوڑ کر نیچی چھت والے گرم کمرے میں

گھومتا رہتا۔ سارے کمرے کیساں طود پر آنا سنا اور گرم ہوتے تھے۔ سانس بھرتے تھے۔ کمرے میں قالینوں کی گرم جھک پر دونوں کے اندر عجیب سا ہوا کرتی تھی۔ پھر ان کمرے کو چھوڑ کر میں اپنے کمرے کے سامنے چھوٹے سے لائونج میں آجاتا جہاں بیرون دیوار ساری شیشے کی تھی۔ اس جگہ سے چیل کا گھونسلہ بڑی اچھی طرح نظر آتا تھا۔

ایک بار اس گھونسلے کو خوبصورت بنانے کے لیے چیل کہیں سے میری اتنی کی جال داد محرم اٹا لائی تھی۔ چیل کی آخری پھٹنگ پر کرخت تنکوں کے گھونسلے کے ساتھ فرانسیسی لیس کی محرم اگر کسی اشتہار دینے والی ایجنسی کو پتہ چل جاتا تو وہ اس گھونسلے کا کلور اپ ضرور لیتے۔ گھونسلے میں میٹھی ہوئی فرانسیسی میٹرن جیسی چیل عفتابی ناک اور پُر شکوہ پرستنی اور نیچہ دم ہوتا۔ گئی ہو یا سردی ہر بافوق قانون کے لیے۔ ہر موسم میں۔

میں اس گھونسلے کو دیکھتا رہا اور احساس کے ذرو خانوں میں مہیاہ سپیں بار بار کوکتی رہتی۔

ثوب ویل کے چلنے کی آواز آتی رہتی۔

کواٹروں میں بچے پیسے بجاتے رہتے۔

گھونسلہ دیکھتے رہنے کے بعد میں جب کہیں کمرے کے اندر دیکھتا تو میری نگاہوں کے آگے ایسے شعلے ٹوٹتے جیسے کمرے میں ویڈیو ٹیگ ہو رہی ہو۔ پھر میری کمزور اند بیامداد کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ آنکھ کر نھنے سے رومال سے منہ صاف کرتی ہایا ہاؤس کٹ پینتیں جس میں سنے سارے کپڑے اور بھی واضح طود پر نظر آتے۔ اپنے

کٹے ہوئے بالوں کو زرد مادہ بیکارنگائیوں سے سنوارتی ہوئی وہ مجھے تلاش کرنے لگیں۔  
گرم کروں یہ مجھ سے گرم نفا میں سانس لیتے ہر کرے کی خوشبو کا اثر المیہ  
لیتے ہوئے وہ مجھ تک پہنچتی۔

اتنی نے مجھے کبھی نہیں تھڑکا۔  
ابو مجھ پر کبھی ناراض نہیں ہوئے۔

ہم تینوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اس قدر اعتماد نہیں تھا کہ ہم اپنے  
دل کی بات کو الفاظ میں ڈھال سکتے۔

اتنی کو دلچسپی میں چپ چاپ اُن کے ساتھ رخصت ہو جاتا اور خوشی کے ساتھ  
کو لڑے لڑے میں پلنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری ناک بند ہو جاتی۔  
اتنی اب کی ہر اہم بات انگریزی میں بڑے برا کرتی تھی۔ جس طرح نئے سرے سے ٹوٹا  
مارک لگتی میں سے گری نکال لیتے ہیں اور پھیلکا رہنے دیتے ہیں اسی طرح اُن کی انگلی  
کا سارا مضمون میں پلنگ لیتا اور پھولگ رہنے دیتا۔

میں اس سفید کرشمی میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کسی ہسپتال کے INCUBATOR

— میں ستانہ بچے دن کاٹ رہا ہوں۔ ایسی زندگی نے مجھے بہت اذک مزاج  
بنادیا تھا۔ ہر موسم کی تبدیلی میری صحت پر اثر انداز ہوتی۔ میری غذا انہی تمام  
سے تیار ہوتی تھی۔ اس میں سے ہمارا دو بدل صحت کی خرابی کا باعث ہو جاتا۔  
بیماریوں کے خلاف قربت ممانعت پیدا کرنے کے لیے مجھے اتنے ٹیکے لگوانے  
پڑتے کہ جاں بلب رہنے کو اتنے ٹیکوں کی شادی ضرورت پڑتی ہوگی۔ ہمارے  
گھر کا سارا نظام گھڑی اور خوف کے تحت چلتا تھا۔ چوروں کا خوف —



بیماری کا خوف — بڑھاپے کا خوف — ملازموں کا خوف — اخبار پڑھ کر اُنہانے حادثوں کا خوف — بالآخر آسائش چھوڑ کر مرنے کا خوف اُن تمام غیر ملکی مشغل گھڑی کے تابع تھے۔ ہر غیر اہم کام گھڑی دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ یہاں ڈزپر جانے کی جلدی تھی۔ یہاں ڈزپر سے لوٹ آنے کی جلدی تھی۔ صبح اللہم لگا کر اٹھا جاتا تھا اور پھر اللہم بند کر کے عیند کی جاتی تھی۔ ملازموں کو مقررہ وقت پر ناشتہ لگانے کا حکم تھا اور پھر ناشتہ کی جگہ صرف گریپ فرنٹ کھایا جاتا تھا، ہر لباس احتیاط سے پہنا جاتا تھا اور احتیاط سے پہننے کے بعد اُسے اتار پھینکنے کی جلدی رہتی تھی۔ ہمارے گھر میں وقت کی سسٹم کی طرح قدر کی جاتی تھی اور سسٹم کی قدر اس لیے ختم ہو چکی تھی کیونکہ یہ مایا داس کا گھر تھا۔ اس میں جس چیز کو ہاتھ لگاؤ کھٹ سے سونے کی بن جاتی تھی۔

اکیل جیل سے متاثر ہو کر ایک بار میں نے بی پالنا چاہی تھی۔ ننھی سی سفید بی۔ وہ چھوٹی سی گلابی ناک والی بی خدا جانے کیوں کر ہمارے گھر آ گئی تھی۔ شاید اُسے جیل نے بھیجا تھا جو بھری دو پہر میں عقیابی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ گتھے دار دم والی ننھی سی سفید بی بڑی چٹوری اور بڑی کھلے ڈری تھی۔ پیروں اپنی دم کے ساتھ کھینچتی رہتی۔ گلابی زبانی سے اپنے پیچھے چاٹتی۔ رتی بھر مٹی لگ جاتی تو پیروں اپنا جسم زبان سے دھوتی۔ اس بی کو میں نے اپنی زندگی میں داخل کر لینا چاہا لیکن میری اتنی نے اس بات کی اجازت نہ دی کیوں کہ انہیں جانوروں کے باؤں سے پرندوں کے پردوں سے اور چڑھیوں کے گھونسلوں سے الرجی تھی۔ ایسی کوئی چیز کوٹھی کے اماٹے میں ہوتی تو انہیں چھینکیں اُسے لگتیں اور وہ بیمار پڑ جاتیں۔ جس

دوڑ نکلے سفید پتی کو بوردی میں بند کر کے چوکیدار روانہ ہوا میں سرور ہوا تھا۔

اگر میں جاگ بھی جاتا تو میرا رتہ عمل وہی ہوتا۔

اپنے گنجنے باپ کی طرح میں بہت غلطیوں میں مبتلا رہا۔

میرا انوکھے مرکبات ملتے رہتے تھے باوجود ان کے گننے پہ میں دل بہا

اضافہ ہو رہا ہے۔

ذہانت کی کمی کے باوجود صفائے کی دولت گوندنی کے بیڑ کی طرح لہی چلی جا رہی تھی۔

میرا باپ بہت ضعیف تھا۔ وہ جس کسی ملک میں جاتا میرے اور امی کے لیے

دہان کی جنگی ترین سوغاتیں لاتا۔ میرے باپ کے صحت کیس پر ان گنت ایئر ٹریول

کی پرچیاں چکی ہوئی تھیں۔ وہ دھاتیہ، بلغاریہ، مجیم، پولینڈ، روسی ترکستان کی

باتیں اس طرح کرتا جیسے کوئی بوردی بازار، بولشیا، کیٹ یا انارکلی کی بات کر رہا ہو۔

اس ماحول سے نکل کر جب میں بلاآخر سکول میں پہنچا تو میں نے اپنے ارد گرد

ایک ایسا احصار یا وقار تعمیر کر لیا تھا کہ ہم جماعت تو دیکھنا رستادہا۔ مجھ سے

الگ تھلک۔ جسے میں عافیت سمجھتے تھے۔ سکول میں مجھے کوئی ہم۔ علی ڈاکٹر ملا۔

کچھ مجھ سے اوپر تھے کچھ نیچے ٹانگ ٹونیاں مار رہے تھے۔ وہ چار ڈاکٹر نے

محبت کے برے لگا کر میرے دل کی تفصیل میں سوراخ کرنا چاہے۔ سوراخ ہو

بھی گئے، تفصیل ٹوٹ بھی گئی لیکن ان ڈاکٹروں کو علم نہ ہو سکا کہ کوئی نگرہ میں اپنے باپ

کی طرح خاموش تھا۔

خدا جانے اصل وجہ کیا تھی۔ لیکن جب سیریا اتنی ٹاکٹر کے مشورے کے

مطابق منی کے وسط میں مری چلی گئیں تو پہلی بار میں نے کھلی فضا میں سانس لیا۔

دلوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور پہلی بار اسی سے بچھڑا تھا۔  
 ہمارے گھر میں جہاں ہر طرف مادہ تھا داش ڈیوڈورنٹ اور ایئر فرشنز کی خوشبو  
 تھی ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔

اچانک، بلا تکلف اور آنا مانا۔

یہ پیداروں کی ہوا گھومتی تھی۔

ہراسے کی یہ لڑکی چٹکی کی طرح تکلف اور مزیدار تھی۔ اُس کا ہیرا لکڑی کی  
 آئینہ ٹامک کا محتاج نہ تھا۔ ہر وقت تھاں سا چہرہ گڑا حل کے چھل کی طرح سوخ  
 رہتا۔ چہرے سے کسی سپرے کی لڑکی لگتی تھی۔ جسم دیکھ کر کائنات دکھائی  
 دیتا تھا جہاں جہاں تھی کماں جیسی اودھ میر عمر ڈھیلے جھولے بیسی ہوا گھومتی ہے۔  
 چال ڈھال میں کنبہ کی چاشنی تھی۔ باتیں کرتی تو سر نہ ہوتی لگتی۔ چپ ہر جاتی قریب  
 لگتا بوسے جا رہی ہے۔

میرا دھندلایں دلوں تھرموس سے مشابہ تھا۔ ایک بار جو بھی جذبہ اٹھال  
 کر لڑک لگتا، دینک اُس جذبہ کی جدت و حرارت ویسے ہی برقرار رہتی تھی  
 تھرموس میں سب سے پہلے میں نے گلو کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کا گرم گرم  
 لاوا بند کر لیا۔

گلو بیرے جانا دھواں کی بہن تھی اسی ایک ماہ کے لیے جب جانا دھواں کی  
 ٹامک کو پستری لگا تھا، بیرا گیری پر سامو۔ ہوتی تھی۔

غالباً اُس سے زیادہ اُچھا گنوار اندبے تیز بیرا پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلے ہی دن جب وہ میز پر غلط سلط برتن لگا کر ٹوپ لٹا تو رکھنے رکھانے

میں اُس نے آدھا سوپ کھو پرا دھا سوپ اپنے اوپر اُٹھال لیا۔  
میرے لیے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ سوپ کبھی گرہی سکتا ہے میں اس کے  
لیے تیار نہ تھا میں نے ابھی سر ویٹ تک ہاتھ پہنچایا ہی تھا کہ وہ اپنے دوپٹے کی  
گدی سے بنا کر بڑی بے تکلفی سے میری قمیص اور پتلون پر نچنے میں مشغول ہو گئی۔  
”تم رہنے دو۔۔۔“ میرے گنجنے آیا بولے۔

”کوئی بات نہیں جی میرا دوپٹہ گنرا ہے۔۔۔“  
یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔۔۔ گنرا ہے رہنے دو؟ میرے امیر آؤ بولے۔  
وہ لمبے ہنسی۔ کھنکھانے کی کوششیں اس نے اب کی جانب دیکھا اور پھر از سر نو  
پھر کی طرح چاروں طرف غور کر سوپ سکھانے میں مصروف ہو گئی۔  
ٹھوڑی آنکھیں ہاتھ مبارک کی آنکھیں تھیں۔ میں لمبی کینٹینوں تک چری ہوئی۔ کچھ  
غوابدہ سی، کچھ محتاج جیسی۔۔۔ اُناں ہوتے ہوئے ذرا فدا سکھانے  
والی آنکھیں مجھے ان آنکھوں کو قریب سے دیکھنے کی ایسی شدید تمنا کا سامنا کرنا  
پڑا کہ میں پوچش پر غفلت اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

اس عمر کی محبت میں انسان بہت زیادہ پُر اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد کی  
کیفیت اس گیس بھری بوتلی سے مشابہ ہے جس کا کالک ابھی کھولا نہ گیا ہو۔ ساری  
تھرموس نقطہ احساس لذت سے بھری ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کا احساس، کسی کو  
خشیت سے چاہنے کا احساس، سارا ماحول موسم باتیں ایک پُر نرم سے دکھائی  
دینے لگتی ہیں۔ اپنا کھانا کھانے کے آگے ایک نرم فزولگ جاتا ہے اور ہر چیز  
بر لمبے محبوب کی شکل اختیار کر کے کھٹ سے آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔

پہلے ہی دن جب میں کھانا کھائے بغیر مزے سے اٹھ آیا تو گھر میرے کمرے میں آئی۔ خدا جانتے وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی کہ چھوٹی، ہر کیفیت قدرہم دونوں کا برابر تھا۔

”آپ کا کھانا یہاں لا دوں گی — صاحب جی؟“

جس طرح کچھ لوگ عجیل کھانے کے بعد دودھ پینے سے ڈرتے ہیں۔ میں اسی طرح اُس کی محنت سے آشنا ہو کر اُس کے وجود سے خوف کھانے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے نفی میں سر ملایا۔

”خاناں مجھے ناراض ہو رہا ہے جی — لا دوں گی کھانا؟“

میں نے احمقانہ سے کانٹہ کی کتا میں چسپاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھوک

نہیں ہے —“

”وہ جی — مجھے ناراض ہو رہا ہے جی خاناں —“

”اچھا ہے آؤ۔“

گھر کمرے میں آتی تو میں چوکیں جانور کی طرح اپنا سدا بوجھ پنجوں پر محسوس کرتا۔ وہ چل جاتی تو میں دینک اُس خواہش کو دباتا رہتا جو مجھے اس کے پیچھے جلتے پر اسکاٹی رہتی تھی۔ مری میں میری اتنی اپنی صحت کو درغلانے کے لیے بہت جتن کر رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کے بل اور کرنے، کیسٹوں کی دکانوں کے چکر کاٹنے اور اپنے نظام زندگی پر تاسف کھانے میں اُن کے وہ بسر ہوتے تھے۔ میں سارا دن اُس قلمی کام کی طرح جو بھوس پشایک جاننے کی راہ دیکھ رہا ہوا اندر ہی اندر میٹھے رس سے بھرا جارہا تھا۔ میرا رنگ زرد واد میرے ہاتھ پیر

جلنے لگے تھے۔ اُس کی آہٹ پا کر ہمیشہ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں اُس ایل چٹے کی طرح تھا جو ابھی اکیل مرے کی عمر کو نہ پہنچا ہوا اور خواہ مخواہ لڑنے کی آرزو میں مرا جاتا ہو۔

یہ دن یہ راتیں عجیب طرح بسر ہوئیں۔

فریج جاعت کا پہلا عشق — مومن سونے بادش کا پہلا ریلہ۔ دُکس کے ڈنشل میں اولیں پھول میمنے کے منہ میں دودھ کی پہل دھند۔

گلو تیرے کی بس تھی۔ اُس کے میرے دو میان لا محدودا صلے تھے اور سب سے بڑا نامہ اُس حجاب کا تھا جو تقدتی طور پر مومن ہمیشہ ہوتا ہے۔ میں چپ چاپ دم سادھے مہاتما بُدھ کی آنکھیں دیکھتا رہتا اور میرے منہ سے کبھی کوئی بات نہ نکلتی جیسے میں بندوق کی بلی پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور بندوق داغنے کی ہمت نہ تھی۔

پھر اچانک ایک دن اس بلی پر بوجھ پڑ گیا۔ آپنی۔

میں امی کے کمرے میں کبھی نہ جاتا تھا۔ لیکن اس روز میں ہاتھ ساٹ لینے امی کے کمرے میں گیا تو میں دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ گلو ڈینگ ٹیل کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر گرے سرخ رنگ کی لپ تلک تھی اور وہ اس وقت امی کی ایک لمبی سی مالا پہننے کے عمل میں تھی۔ یہ لمبی سفید مالا امی کبھی کبھار سلک کی فیروزہ ساڑھی کے ساتھ پہنتی تھیں۔ اس مالا کے نیچے بڑا سا فیروزہ لاکٹ لٹکا کرتا تھا اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ یوں گہرائی جیسے جھاڑ بندر کھینٹے بڑی گئی ہو۔ وہ دوپٹے سے لپ تلک پر نکلتی میری طرف بڑھ آئی۔ ”صاحب جی خدا کی



”میں جی ————— یہ کالا ————— اُس نے مٹی میں لاکٹ بچھ لیا۔  
 اُس کا چہرہ حیرانی، خوشی ”جا بھڑکا“ قسم کے جذبات سے گلناری ہو گیا۔  
 ”جی ————— سے مل میں —————“  
 ”نہ ————— جی ہمیشہ کے لیے —————“

نقل سفید موتیوں کو اپنی انگلیوں سے بوسے دیتی وہ بھاگ گئی امد میں رہی  
 کھڑا رہا۔

یہ میرا اور گلہ کا دعائ تھا۔ اسے میں نے اس لیے تفصیل سے بیان کر دیا  
 ہے تاکہ وہ الزام آپ کی سمجھ میں آ سکے جو سامانے نجد پر لگایا۔  
 گلہ مجھے پیر نظر آئی۔ شام کو اُس کا بھائی جاندار ڈیوٹی پر موجود تھا اور وہ  
 واپس ہزار سے جا چکی تھی۔

میرے دل کے آجروں پر غم کنواری کے پیروں کے نشان پڑ گئے  
 امد پھر روز مرہ کی زندگی اسے گرم ہوا میں کر چاٹ گئی۔

میں اس واقعے سے کچھ ایسا محنت ط، کچھ ایسا خود مس، کچھ ایسا اذیت پسند ہو گیا  
 کہ پھر کبھی کسی لڑکی کے قریب ہونے یا کسی لڑکی کو اپنے قریب کرنے کا حوصلہ نہ  
 پڑا۔ قیوں ساری زندگیوں سے بھاگتا میں۔ ————— بزنس کی چار دیواری میں محبوس  
 ہو گیا۔ دولت کو میرے والد نے جس روحانی انجمن کی پیڈ سے جمع کرنا شروع کیا  
 تھا میں نے اس کی زندگی میں راکٹ کی قوت سموی میں راجہ پایا۔ اس بھاگیا جس  
 چیز کو ہاتھ لگاتا، سونے کی بن جاتی۔ میرے بیوی پر نٹ، میرے چلن، میری سیکر  
 کو دولت کی بددعا لگ چکی تھی۔ میں گھاسٹے کے سودے کرتا اور وہ چند سوچند



منازع کی صورت میں مجھ تک لوٹ آتے۔ خدا جانے میرے پاس کتنا لیا کا وہ  
 مشین کہاں سے آگئی تھی جو ہر لمحہ سونا اگھتی تھی۔ مادہ کو پولک طرح میری ہر سکیم کا سبب  
 اور سونے میں ملتی تھی۔ میں کامیابی کا سبب، خوشدلی کا آئیڈیل اور عشق کی معراج تھا۔  
 یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ممی ڈیڈی کی وفات کے بعد میں پہلے بار پید  
 یہاں میری ملاقات سوشل لیڈ کی پڑھیں ہوئی سارا سے ہوئی۔ سارا کا والد  
 میرے مرحوم باپ کی طرح بہت امیر آدمی تھا۔ اور اُس نے سارا، اپنی اکلوتی  
 بی بی کی بیٹی کو بہت لائے پالا تھا۔ وہ اپنے نام کو ہمیشہ انگریزی میں لکھتی تھی اور  
 ایچ کے ساتھ ختم کرتی تھی جس طرح باپس میں حضرت اسحق کی بیوی کا نام لکھا ہوتا ہے۔  
 ہماری شادی کراچی کے ایک ایسے ہوٹل میں ہوئی تھی جس کی نقوش کشاکش  
 سات منزلیں چڑھتی آرتی تھیں۔ ہماری شادی کراچی شہر کے لیے عرصہ تک ایک  
 ٹاپک بنی رہی۔ ہماری شادی کی تصویریں مختلف نیشنل ایبل رسالوں میں چھپیں اور ہم  
 اپنی سوانح میں مری چلے گئے۔

آمنش کے ہاٹ ہاؤس میں چلے ہوئے دو گنی پگ —

شادی کی پہلی سات جب میں ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو میری دلہن  
 فرل ورنائیٹی پہنے پگ پر اندھنی لیٹ تھی۔ کمرے سے ماؤتہ واٹش، سپرٹ،  
 اسیڈیٹرز کی مل جل خوشبو آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اسی باد آگئیں۔ آغٹھ کی  
 چھری سے اُس نے میری جانب دیکھ کر کہا — ”ایکس کیوزی — میری  
 عقل داڑھ نکل رہی ہے ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔“

نہایت غیر دماغی طریقے سے میں نے اُس کا منہ کھلایا اور عقل داڑھ

کی پھولی ہوئی تحصیل شادی کی روشنی میں دکھیں۔

یہ ساری رات سارا ہائے ہائے کرتی رہی اور میں اس کی تیار داری میں مصروف رہا۔

بہن سون شادی شدہ جوڑے پر معاشرے کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ وہ انسان جو راکٹ کی سی تیزی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہوں انہیں بار بار ٹھکرانے کی ترغیب دینا شکست و ریخت کی داستان مرتب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ شروع شادی میں آڑ چینی شادی کو مقفل کرتی ہیں، مکمل آزادی سے اس مشک تانے کی خوشبو غائب ہو جاتی ہے۔ ایک طرح سے ہمارا بہن سون بھی ہر بہن سون کی طرح پہلے پختے میں ہی فیل ہو گیا اور ہم اس سے بائیں آئیں ہیٹ نہ بنا سکے جس کی توقع بے کہم دونوں مری گئے تھے۔

مجھے سارا کی ہر بات سے اتفاق تھا اور خدا جانے وہ کیوں سمجھتی تھی کہ اعتراض نہ کر کے میں اس کے ساتھ محبت کے فقدان کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہوں اسی لیے ہم نے محبت کرنے کا ایک ایسا اسلوب ایجاد کیا جس میں اذیت دینے اور اذیت سے خطا اٹھانے کی قوت تھی۔ جو نہی بنی ماں کی اکثر تھی سارا، باپ کی لاٹھی، دولت کی پردہ یہ محسوس کرتی کہ میں اس کی طرف متوجہ نہیں اور ہماری باتوں کا اسٹاک ختم ہو رہا ہے۔ وہ میرے پاس گرہ پائی سکتی تھی۔ اس کے جسم سے خاص کر اس کی آستینوں کے قریب سے نیم کے کیسے پتوں کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اسی جینا سے ہر قسم کے (DEODORANTS) سے مشتق تھا۔ وہ مجھ پر جھک کر انگریزی میں پوچھتی تھی — ”آپ کے خیالوں کے لیے ایک بہن —“

”میں چپ رہتا۔“

ساری زندگی یوسپ میں گزار آنے والی کنواری پرچھتی — ”بتائیے ناں  
کون یاد آ رہا ہے —؟“ بولیے —  
”کچھ بھی نہیں سارا۔“

میں نے گھر کے بعد زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو قریب سے دیکھا تھا۔  
جب میں نے سارا سے شادی کی تو یہ ایک بزنس میں کی شادی تھی لیکن رفتہ رفتہ  
آہستہ آہستہ سب کچھ میں نے سارا کی تحویل میں دے دیہ لیکن سارا اُن لوگوں  
میں سے تھی جو Octopus کی طرح اپنے محبوب کو اپنی گرفت میں لے لینا  
چاہتی ہیں جو آدم خود درخت کی طرح جھانکی لہو سے سیر نہیں ہو پاتیں۔ وہ میرے  
نئے خیالات پر بھی پرے بٹھانا چاہتی تھی جو نہاتے میں، مات پرش کرتے وقت،  
جوابیں پھینٹے ہوئے میرے دماغ پر بدلی بن کر چھایا جاتے تھے۔

میں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی کوئی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ میں وہ  
محبت بھی حاصل تھی جس کی کتابیں لوگ گھل گھل کر مر جاتے ہیں۔ لیکن اس محبت میں  
بھی خلی کی اک صورت موجود تھی۔ اس محبت کو بھڑکانے کے لیے ہمیشہ اذیت  
کی دیاسلانی روش کرنا پڑتی۔ سارا کے ٹھنڈے سنگ مرمر جیسے جسم کو ڈنگرے  
کی طرح دبھانے کے لیے مجھے ہمیشہ اُسے ذہنی طور پر اپنے آپ سے کتر ثابت  
کرنا پڑتا۔ اُسے ایسے دکھ عطا کرنے پڑتے جن پر وہ علیحدگی میں رو سکے جس کی  
بدولت وہ اپنے آپ پر ترس کھا سکے، اپنے آپ کو بد نصیب کچھ سکے۔

یہی ہمارا اسلوب محبت تھا جسے میں نے مجبوری کے تحت اختیار کر لیا

تھا کیونکہ سارا ملک پہنچنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔

میراجی چاہتا کہ میں گلا وہ بھر کڑا سے اپنی گود میں بٹالوں اور اس کی ہنس کی بڑی پاپا کال رکھ کر ہمیشہ کے لیے منجھڑ جاؤں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہم دونوں پھرتے زمانے میں پہنچ جائیں اور ”ڈال تاملور“ جیسے ناپید جانوں کی طرح ہمارا شمار بھی ایسی فوج انسانی میں ہو جائے جس کا اب سراغ بھی نہیں ملتا۔ ہم دونوں دو ساتھی کی طرح جڑے ہوئے ناپید جانور۔

لیکن سارا سب روکس کی طرح بے قرار رہتی تھی وہ کرکسٹیل کی طرح ہمیشہ آبدیدہ اور خوفزدہ رہ کر خوش رہ سکتی تھی۔

اُسے اپنے قریب لانے اور قریب تر رکھنے کے لیے میں نے اذیت کا ایک ایسا باب کھول دیا جس کے انجام سے میں خود بھی بے خبر تھا۔

”بتائیے کیا سوچ رہے ہیں آپ۔ آپ کے خیالات کے لیے ایک مہی ۴

اُسے اپنے کڑے پر دلانے کے لیے میں اپنے سابقہ عشق کی لکڑی کی گھڑت داستان شروع کر دیتا۔ اس داستان کی جینے کے لیے مجھے ایسے ایسے الفاظ تلاش کرنے پڑتے، ایسی ایسی تفسیہیں، ایسے ایسے استعارے وضع کرنے پڑتے جن کو کسی کر سدا کے کان میں اُٹھتے۔ میں اُس کے کان کی لور سے اپنے ہرنٹ لگا کر کہتا۔ ”وہ دینس کے مجھے کی طرح سڈول تھی۔ اگر اُس کے کندھوں پر چاند ڈال دی جاتی تو عرب عورتوں کی طرح یہ چاند صرف اُس کے سینے اور سر پر کر چھوٹی اور باقی جسم کے کسی حصے کو نہ لگتی کیونکہ اُس کا سینہ اور

کہلے اس کے جسم سے بہت درد نکلے ہوئے تھے۔

سارا بٹے اپنے جسم کی لڑکی تھی مجھے اُس کا دُلا پتلا جسم پسند بھی تھا لیکن یہ بات سُن کر اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ دکھ کے ساتھ اپنے بازوؤں پر ہاتھ مل کر کہتی — ”اُس کے بعد... تو... اس کے بعد...“

.... آپ کو میں بہت بُری لگتی ہوں گی — ہے نا —“

میری جانب سے اب شدت کا اقرار ہوتا اور اُس کی جانب سے شدت کا انکسار۔ اسی شدت سے محبت کی شمع جل اٹھتی اور ہم مالا مال طوبہ پر ایک دوسرے کی جانب بڑھتے۔ وہ میری کچلی محبتوں کی خلائی کونے کے لیے حسن کی دیوی ہی جاتی اور میں اُس سے اُٹلی محبت قائم کرنے کے لیے دکھ دے دے دے کر اُسے اپنے پاس لاتا۔

سارا کے آنسوؤں نے، اُس کی اذیت پسندی نے ایک دم سبھا سا چنے والی لڑکی کو بستر کی زینت بنا دیا۔ وہ پیروں لیٹیں رہتی۔ خدا جانے ان لمحوں میں اُس کی نظروں کے سامنے وہ بیلے ڈانسز قسم کی قدآور عورتیں گھومتی رہتی تھیں جو مجھ سے عشق کر چکی تھیں یا وہ اپنی بد نصیبی اور محرومیوں پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ ہر کیفیت یہ بھی جانی دور ہم دونوں کے لیے عجیب و غریب تھا۔

اپنے آپ پر ترس کھاتی سارا کا چہرہ مدقوق سا ہو چلا تھا۔ وہ یورپ میں رہنے کے باوجود کنوارے جسم اور کنوارے دل کی مالک تھی۔ اُسے کھو بیٹھنے کے خوف نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ایک طرف میں اُس کی محبت کو سکس مار مار کر اٹھا اٹھا کرتا اور دوسری جانب اُسے لیٹا دیکھ کر مجھے اتنی کوفت

ہوتی تھی کہ سارا سے مجھے بچے کی خواہش بھی باقی نہ رہی تھی۔ اسی سٹاؤ میں اسی کھینچا کھینچی میں فیمل پلاننگ کے مفتے مناتے ہوئے ہماری شادی کو چار ماہ گزر گئے۔ ایک دفعہ میں کالا شاہ کاکو سے واپس لوٹا تو سارا قالین پر اندھی بیٹھی تھی۔ قریب ہی امریکی رسالے بکھرے تھے۔

میں نے فائیلوں کو اس کے پاس رکھا اور اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا اس نے جدید ترین فیشن کے تازہ تازہ بال سیٹ کروائے تھے اور اس سے نیم کے پتوں کی کسین کسلی خوشبو آ رہی تھی۔

”تم پھر رو رہی ہو سارا۔“

”کچھ نہیں“ اس نے چہرہ پر ہنچ کر کہا۔

”تنبیں کیا تکلیف ہے سارا۔“

”کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ کوئی تکلیف نہیں۔۔۔“ وہ انگریزی میں بولی۔

روتے چہرے پر سکراہٹ نے دھوپ بھاؤں کا سامنظر پیدا کر دیا۔

”خوش تو ہوں۔۔۔ خوش تو ہوں لیکن۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ کوئی

اور بھی تو ہوا اس گھر میں۔۔۔ میں سارا سارا دن۔۔۔ کھڑکی میں کھڑی

چیلوں کے گھونسلے نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ مجھ سے تو وہی خوش نصیب ہے

۔۔۔۔۔ انٹے تو صحتی ہے چاہے دھوپ ہی میں میٹھی رہے۔۔۔“

اس رات میں نے عجیب سا دکھ محسوس کیا۔ چیل کے گھونسلے کو کھتے رہنے

کا دکھ۔ اسی احساس تھے پہلے میں نے سارا کو ایک ٹرک کبل میں لپیٹا۔ پھر اس کے

ٹھنڈے پیر اپنے سینے سے لگا کر اسے گلو کے متعلق بتایا۔ اس رات سارا کی

آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ جھلایا۔ وہ بت بنی گلو کا ذکر سنتی رہی اور پھر کیے  
 پر اوندھی لیٹ کر سو رہی۔ پہلی بار میری داستان کا رتہ عمل اُٹا پڑا۔ اُس پر  
 وہ محبت کا شدید دورہ نہ پڑا، جو ایسی باتیں سننے کے بعد اُس پر پڑا کرتا تھا۔  
 وہ ساری رات جب بھی جاگتی بند بندھی آہ بھرتی اور پھر کیے میں منہ دے دیتی۔  
 دو چار ماہ جب سارا گھر دفن تھی، ہماری زندگی کے بہترین دن تھے۔ ہم  
 دونوں آسائش کے پالنے میں پوٹل کتوں کی طرح سیر چمکی کے ساتھ ایک دوسرے  
 پر تھوٹیاں جمائے پڑے رہتے۔ وہ سارا دن چھوٹے چھوٹے پالنے، نخی نخی  
 فراکیں، ٹوٹے ٹوٹے قسم کی کڑھائی کے کپل چادریں، نیل ارگنڈی سے مڑھے ہوئے  
 کرب پلاسٹک کے ٹب، فلائیں کے پونڈے اور رنگ برنگے کھلونے خریدنے  
 اور اُس بچے کا کمرہ سجدانے میں مشغول رہتی جس کی آمد میں ابھی بہت دیر تھی۔ کٹے  
 ہوئے بالوں والی سارا زندگی میں پہلی بار اس قدر بارونق زندگی بسر کر رہی تھی۔  
 بچے کے کمرے سے نکل کر وہ دن میں کئی بار ونڈی تو لے والی شیش پر چڑھ جاتی  
 اور بار بار کہتی — کچھلے، مچھتے میرا ونڈی ایک سو سولہ پونڈ تھا۔ اب ایک سو  
 ساڑھے سولہ پونڈ ہے۔ پورا آدھا پونڈ ونڈی بڑھا ہے بے بی کا۔“  
 بچے کی کائنات میں کھو کر وہ میرے عشق کی داستانیں بھی بھول چکی تھی  
 لیکن کبھی کبھی مجھے شک گزرتا کہ جب میں اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہوتا تو وہ  
 آنکھوں کی چھری سے مجھے دیکھا کرتی ہے۔ ایسے جیسے جہاز میں سوار دور  
 ہوتے ہوئے جزیرے کو دیکھا کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک لمحے میں نے اُسے  
 پکڑ لیا — ”تمہارے خیالات کے لیے ایک مینی —“

”کچھ نہیں، میں دیکھ رہی تھی کہ تمہاری شیو بہت بڑھ گئی ہے۔ تمہیں دن میں تین مرتبہ شیو کرنا چاہیئے۔“

”ہج نہیں بولو گی مجھ سے تو میں تمہارے بے بی کو کبھی نہیں اٹھاؤں گا۔“ وہ بچہ کا واسطہ عد میاں میں برداشت نہ کر سکی۔ آہستہ سے اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہنے لگی۔ ”پتہ نہیں لگتا کہ باتیں کس کر مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میرا کہتیں چاہتا ایک PUTILE EFFORT ہے۔ میں۔۔۔۔۔ تمہاری زندگی میں ہمیشہ دوزخ رہوں گی۔۔۔۔۔ ایسا گھوٹا جو فٹ آنے والے گھوڑے کی گردن کے ساتھ پہنچتا ہے۔۔۔۔۔ میں بڑی حامد عورت ہوں۔۔۔۔۔ میں نے زندگی میں آج تک کوئی چیز کسی کے ساتھ SHARE نہیں کی۔۔۔۔۔“

پھر ایک دم جیسے اپنے خیالات کو کسی پر ظاہر کر کے اُسے خدامت سی ہوئی۔ جھٹ انگریزی میں بولی۔ ”لیکن اب تو میرا بے بی ہو گا۔ میں لگتا کی کیا پروا کرتی ہوں۔ اپنا بے بی تو میں کسی کے ساتھ SHARE نہیں کر دوں گی۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔“

میں کہتے میں اگیا۔ اس سارا سے میں ناواقف تھا۔ وہ تو بڑی بے ضرر قسم کی بوجھ نہ اٹھا سکنے والی لڑکی تھی۔

اس واقعے کے باوجود میں سمجھ رہا تھا کہ ہماری شادی میں تخریب کا کوئی ٹائم بم چھپا ہوا نہیں ہے حالانکہ اندر ہی اندر فیوجی پامہ پھاڑ میں لاوا جمع ہو رہا تھا۔



خاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اگر ایک رات اچانک سارا کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی۔

باہر بارش کے آثار تھے۔ سارا آتش دان کے پاس بیٹھی بے بن و دل کے ساتھ ایک لمبوتری سی ٹیپنی بٹن رہی تھی پہلے وہ کر وٹیں بدلتی رہی پھر نیم دراز ہو گئی اور جب اُس سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو وہ لب کاٹنے اور ٹیٹیاں بھینچنے لگی۔

”کیسی طبیعت ہے سارا۔“

وہ خاموش رہی۔

”تم ٹھیک تو ہو سارا۔“

وہ آنسوؤں سے بہت قریب تھی۔

”میں ڈاکٹر کو بلوؤں۔“

میری باتوں کا جواب دیئے بغیر وہ چپ چاپ کمرے سے چلی گئی۔ جب میں اُس کے تعاقب میں تھوڑی دیر بعد اُس کے کمرے میں پہنچا تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ درست کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے پرس اٹھایا اور آہستہ سے بولی۔ ”کار نکالیے۔“ مجھے ہسپتال جانا ہے۔“

اتنی سرخ لب شک اور ایسی بھرپور سرخی کے باوجود اُس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

”سارا۔“

”جلدی چلیے۔ میں اور میرا بچہ ..... ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے ہیں۔“

میں اُسے ہانڈوں میں لے کر بولا۔ اچھا ہی ہے سارا۔ تمہارے ہاں کبھی بچہ نہیں ہونا چاہیے ..... کبھی نہیں ..... کبھی نہیں ..... میں تمہیں کسی کے ساتھ SPARE نہیں کر سکتا۔“

استقامتِ حمل کے دوسرے دن جب ابھی اس کا چہرہ ANESTHESIA کے اثرات تلخ تھا، ہم دونوں ملاقاتیوں کسانیت میں ملے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ بڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”آپ کو ڈاکٹر نے بتا دیا ہے؟“

”ہاں۔“

”پھر؟“

”پھر کیا۔۔۔ کچھ نہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ روئے لگی۔ ”ڈاکٹر کم از کم دو چار دن ٹھہر کر مجھے بتا سکتا تھا۔ میں ..... پتہ نہیں تعلیم یافتہ امیر لڑکی کو لوگ اس قدر پتہ دل کیوں سمجھتے ہیں ..... یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شاید ..... وہ بھی اچھے اور جاہل عورت کی طرح ADJUST ہونے کے لیے وقت چاہتی ہے۔“

”سارا۔۔۔ مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ امیر گھرانے میں بچہ ہمیشہ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اُسے عجیب عجیب COMPLEXES چمٹ جاتے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔

سپرٹ کی خیریتوں سے راجھل ٹبری لمبی خاموشی طاری نہی۔ پھر وہ مسکرا کر بولی۔  
 ”آپ کو گتو یاد آ رہی ہے ناں؟ — وہ صحت مند لڑکی تھی ناں۔“

ہسپتال سے واپس آ کر سارا کاچی چلی گئی۔ اُس کی صحت اتنی گر چکی تھی کہ ڈاکٹروں کے مشوروں کے پیش نظر میں مدافعت نہ کر سکا۔ سارا کے جانے کے قریباً دو ہفتے بعد مجھے سارا کا خط ملا۔ اُس میں اُس کے وکیل کا خط بھی ملحوظ تھا۔ جس میں قلع کے جملہ کوائف اور شرائط لکھی ہوئی تھیں۔ سارا کے خط میں مرقوم تھا :

”میں آزادی چاہتی ہوں۔ کسی باخجہ حودت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک بار اور مرد کے ساتھ اپنی زندگی گزارے۔“

اس کے بعد میں نے مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔ وہ مجھ سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ وہ میرے خطوں کا جواب نہ دیتی تھی۔ صرف اُس کا وکیل نہایت پابندی کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاتا تھا۔

طلاق وصول کرنے کے بعد مجھے جو خط سارا سے ملا اُس میں لکھا تھا :

”آپ کے پاس گتو ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ یہ جی کے وہ کپڑے جنہیں وہ پہن نہ سکا۔ خدا جانتا ہے میں نے آپ کے سب AFFAIRS سنے اور کبھی ایک دن بھی مجھے اُن عورتوں پر رکھ نہ آیا۔ اٹل میں نے اُن پر ترس کھایا۔ لیکن گتو کے وجود کے ساتھ میں صلح نہیں کر سکتی وہ اور میں ایک ہی گھر میں نہیں رہ سکتے۔ اُس کے ہوتے ہوئے میں محروم رہوں گی۔ سارا“

میری زندگی میں صرف ایک محنت آئی اور بانجھ ہو کر چلی گئی۔

یہ جنگ کے دنوں کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں ایک بہت بڑے ہوٹل میں مقیم تھا۔ بزنس جنگ کی وجہ سے کچھ متعلق سا ہو چکا تھا۔ سارے شہر ایک جذبہ ایک دلولطاری تھا۔ اخبار اور ریڈیو کے علاوہ اور کسی چیز سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ میں سارا دن کمرے میں مقید رہتا اور سوچتا رہتا کہ کاغذ کوئی کم اس ہوٹل پر گرے اور میں اس تحائی سے چٹکا راپالوں جو ہر لمحے مجھے حکمت میں کستی رہتی سے گیارہ ستمبر کی رات کو پچھلے پیر سے فون کی گھنٹی بجی کسی نے مدد ہم سے آواز میں کہا۔ ”کیا آپ کمرہ نمبر گیارہ میں آسکتے ہیں۔“

”گیارہ۔۔۔؟“

”جی ایک ایک اور دو گیارہ۔۔۔ دو گیارہ۔۔۔“

مجھے جرائم سے پُر وہ امریکن فلمیں یاد آ گئیں جو میں ہمیشہ خرق سے دیکھتا تھا۔ وہ جاسوسی ناول نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے جن میں قتل و غارت کا باب کھلا رہتا ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ جی میں سوچا زندگی کا تو ویسے ہی کچھ بھروسا نہیں کم از کم مرنے سے پہلے ایک ADVENTURE سے مجھے بھی دوچار ہونا چاہیئے۔

تین بار کمرے پر دستک دینے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ضرور کوئی قتل کا واقعہ ہو چکا ہے تو میں نے لوٹ جانے کے لیے قدم موڑے سلفٹ تک پہنچنے کے بعد خدا جانے کیوں میں لوٹ گیا اور بغیر دستک دیئے میں نے ایک طاقا کھول دیا۔

اندر سارا ڈبل بیڈ پر آٹھ سے ستر لیٹی ہوئی تھی اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں  
میری بعض چیز تیز چلنے لگی۔

”سارا۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔۔۔“

”میں نے تمہیں لفٹ سے اترتے دیکھا تھا۔ کل شام۔۔۔“ وہ اُسی

طرح لیٹی رہی۔

کمرے میں اتنی ساری خوشبوؤں کے باوجود کڑے نیم کے پتے تیز رہے تھے۔

”تمہاری نئی شادی کیسی رہی۔۔۔؟“

”۔۔۔ سو۔۔۔ سو۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تمہارے میاں کہاں ہیں؟“

سوئیٹر لینڈ گئے ہیں کسی بینک سے گفت و شنید کرنے۔۔۔“

”اچھا۔۔۔ پھر؟“

”اگر جنگ نہ کوئی قہمت صورت اختیار نہ کی اور۔۔۔ ہمارا اثاثہ پاکستان

میں ہلاک ہو گیا تو ان کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔“

”تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرا تو سب کچھ پاکستان میں ہے اور میں تو

اپنا بیگ بلیکس کہیں تبدیل نہیں کرانا چاہتا۔۔۔“

اُس کی نگاہوں میں بڑی غمخیزی دھنکت تھی۔

مجھے ڈر لگتا ہے دیکھیے۔۔۔“

اُس کے چہرے کو دیکھ کر خدا جانے کیوں ایک دلی سی ہسکی میرے سینے میں اٹھی۔ میں اُس پر جھک گیا اور اُسے چھوئے بغیر بولا۔ "تمہیں معلوم ہے سانا کہ..... نہ تم سے پہلے اور نہ تمہارے بعد..... میری زندگی میں..... میں نے کبھی کسی عورت کو چھو کر نہیں دیکھا۔ اور تم جانتی ہو اس کی وجہ کیا تھی؟۔"

"نہیں۔"

"جب دنیا کی ہر نعمت مجھے بلا قیمت مل گئی تو میں نے خود اپنے آپ کو محروم کر لیا، کوئی انسان احساسِ محرومی کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا یہ احساس خوشی سے زیادہ ضروری ہے۔"

اُس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔

"مجھے تمہارے برابر کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی بد قسمتی سے۔"

"اور گلہ؟.....؟"

"وہ تو تازہ ہوا کا بھونکا ہوا تھا۔ زندگی کا آدھیں احساس تھی۔"

وہ امریکن ایکٹرسوں کی طرح ٹانگوں کو بل دے کر بیٹھ گئی۔

"اگر ایک مینی دو تو میں تمہیں بتاؤں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

اُس نے ہلکا سا سر ہلایا۔

"میرا ایمان اتنا مضبوط نہیں کہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے سے اجتناب کر سکے۔ جس پر وہت کے بنائے ہوئے قانون کا بھی ایسا احترام نہیں کرتا کہ ایک معمولی مطلق نامے کو اہمیت دے سکوں۔"

ساترا کا سینہ احساسِ گناہ کی لذت سے تن گیا۔

”کبھی کبھی تنہائی میں میں سوچتا تھا کہ اگر سارا مجھے ملے، اگر وہ کسی دوسرے کی بیوی بن کر مجھے ملے تو کیا اُس کا جسم میرے لیے اجنبی ہو سکے گا۔ کیا میری نگاہیں کپڑوں کے تار پار نہ دیکھ سکیں گی۔ کیا ہماری نگاہیں اُس خلوت کی غمازی نہ کریں گی جو ہم دونوں کے درمیان ایک بوسے کی طرح شیریں رہی ہے۔“

سارا کانپنے لگی۔

”کیا ہم ایک دوسرے کے لیے کبھی بھی اجنبی ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے، نہیں پہنانتے۔“ وہ خاموش رہی۔ ”میں نے صدیوں کی تنہائی کاٹ ہے اور تم نے سارا مجھے باعصمت ہونے کا کیا بدلہ دیا۔ میں جانتا ہوں تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ تم احساسِ گناہ پیدا کرنا چاہتی ہو۔ جب تک تمہیں کوئی غم اندہی اندر نہ خمی نہ کرتا رہے تم خوش نہ رہ سکو گی۔“ اُس نے نظریں جھکا لیں۔

”تم اور میں..... اور ہمارے جیسے سب امیر آدمی..... ہم من و سلوی کھاتے کھاتے تنگ آچکے ہیں۔ ہمیں خوش رہنے کے لیے غم چاہیئے۔ لیکن یہ غم بھی ہمارا خود ساختہ ہونا چاہیئے۔ اس پر ہمارے ذاتی کارخانے، ہمارے اپنے مل کی ضرورتیں چاہیئے۔ امیر آدمی SELF - PITY کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا..... اتنی ساری آرائشیں، اتنی ساری راحتوں کا ایک ہی جواز ہے.....

SELF - PITY

سارا گہرا کھرمی ہو گئی۔

”تم پاکباز اور با حیا عورت ہو..... لیکن خوش رہنے کے لیے ایک دھک

پالنا چاہتی ہو۔ احساس گناہ کا دکھ۔“

یکدم میں نے اپنے جلتے ہوئے غورٹ اس کے کنارے پر رکھتے ہوئے کہا  
— ”اور میں تمہیں خوش نہیں دیکھتا چاہتا کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔  
جو دکھ میں نے اپنے لیے وضع کیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنا صحیح دکھ کبھی  
تلاش نہ کر سکو۔ تم بھٹکتی رہو غموں کی تلاش میں اور غم سے گریزاں رہیں۔“  
وہ دواڑے کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ ”مت جاؤ....  
مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”مجھے جانے دو سارا۔ مجھے بھی سینے کا حق پہنچتا ہے۔ میں بھی  
تمہاری طرح امیر آدمی ہوں، مجھے بھی اپنا خود ساختہ دکھ چاہیے۔“  
اُس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔

”میں بھی دکھ کا میرا حق تو تاپا پالنا چاہتا ہوں۔ میں بھی احساس شکست اور  
احساس محرومی کی تلاش میں ہوں میں بھی اپنے فرصت کے لمحوں میں اپنی خوشیوں  
کے بازو گدگد کر اُن میں پھینتا دوں گا سر نہ بھرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی ہوائی جہازوں  
میں سفر کرتے ہوئے سوچا کروں۔ سب کچھ مجھ سے بالشت بھر دوں تو میں  
ہاتھ بڑھاتا تو سب کچھ میری گرفت میں ہوتا۔ میں امیر آدمی ہونے کے باوجود  
با حیا اور با عصمت آدمی تھا۔۔۔۔۔ کبھی دکھ کی بات۔۔۔۔۔ تم مجھ سے میرا دکھ  
کیوں چھیننا چاہتی ہو۔؟ بھلا دکھ کے بغیر خوشی کا احساس کیوں کر رہے،  
بھلا دکھ کے بغیر زندگی کا احساس کیوں کر ہو؟“

اپنی سترکہ بیوی کے عشق کو رومال دالی جیب میں عین سینے کے اوپر رکھ کر



میں باہر نکل آیا۔ اب مجھے موت کی خواہش نہ رہی تھی۔  
 وہ دیر تک مجھے کانٹیدر میں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔  
 پہلی بار اس کے چہرے پر آنسوؤں کے باوجود خوشی چھائی تھی۔  
 وہ جینے کا قرینہ سیکھ چکی تھی۔

(”فنون“ لاہور)

# کوری کوری۔ گوری گوری

(۱)

جھڑ بوندی کے دن کل ہی ختم ہوئے تھے کیونکہ مواد میں مکمل کر برس چکی تھیں۔ اب  
اوپر آسمان کی طرف، جدھر بھی دیکھو، نیل ہی نیل پھیلا ہوا تھا۔  
ایکھ کی زمین جتاڑنے پر مزید تیار کی جانے والی تھی۔ تار مکمل کی لمبی سڑک  
کے آخر میں کوئی نصف میل کے فاصلے پر صدوں والی گاؤں تھا جہاں پکتے گڑ کی  
خوشبو پھیل رہی تھی اور میل کے دھنولے سے دھڑاں ٹھک ٹھک نکل رہا تھا یہاں  
ڈنگمار میں نصیبو چوہان کی باری آئی ہوئی تھی۔

نصیبو چوہان اتنا عاقل تھا کہ اس نے اپنا جھیرک مواد ٹوں میں آلا نہیں ہونے  
دیا تھا۔ تو اسی لیے گڑ کی پکائی بھی جھڑ بوندی ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ تار مکمل  
کی لمبی سڑک کے آخر آمد دکن میں جو سوانے کا سوانا لمبی بالوں والے گیہوں سے  
بھرا کھڑا تھا جہاں میں سے ہر ایک میں پچھتر بڑے بڑے دانے تھے، اس کے بدلے  
دینے کی ابتدا بھی نصیبو چوہان نے ہی کی تھی۔ آج مواد میں گھٹنے کے بعد ٹھنڈی  
ہوا کے جھیرنگوں میں اس لمبی لمبی بڑے بڑے شرجی دانوں والی بالوں کے ہٹھنار  
ٹپنے جلنے سے جو خوشگوار سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی وہ چھوٹی بالوں کے ہٹھنار  
ٹپنے جلنے سے کہیں نہ پیدا ہو سکتی۔

نصیبو چوہانہری سردوں والی میں وہ تنہا کسان تھا جس کے اپنے نہ تھے  
تھے اور وہ گویہ کہ بطور کھاد استعمال کرتا تھا۔ بڑگٹوں میں جو مویشیوں کی تلاش  
ہوتی تو اس میں اسی کے بکھرے اور بھینس نے انعام پائے تھے۔

لیکن باوجود اتنا جانہ ہونے کے وہ اپنی ہنسوکڑ، ہمیشہ لٹک کر چلنے  
والی، کتاب رو، بھری جوانی والی لڑکی حدود کوتوالوں میں نہ رکھ سکا تھا۔ پھیلی جاتوں  
میں جب پانی چڑھ ہوئے تھے، یا غلوں میں ٹپکے کے آموں کی گدگد ہو رہی تھی  
اور گاؤں میں زیادہ برکھ سے جنگ پڑناؤں کی وجہ سے دور دور پڑ رہی تھیں، شاخ  
بید ایسی لچکلی اور کیری کی کھل ایسے پھیلنے سفید گھبائیڈ سے والی حدود بڑوں پپ  
کے سونے لٹریے بابو کے پاس ڈرائی اور بھونائی رات میں گولی پینے کے لیے  
جوتیاں ہاتھوں میں لیے، کپڑے بھگوانے آکر گھاہ لٹاتے ہوئے کہنے لگی تھی :  
”ارے صمد، میں تو تھکاتی تھکاتی پانی ماں سے نکل کے آئی ہوں۔ گولی گئے! تیں  
آپ سرکھی سوکھی کوٹھڑی ماں کیسی زال کی جگہ گیس کی لالٹیں بالے سو رہا ہے۔ بتا  
کھسنے جانے میں کتنی سوؤں؟“

”گولی گئی! تیرے واسطے تو میرے دل کی چند کھڑکیاں کھل ہوئی سے“ چاہے  
جہاں آئی بیٹھ۔ صمد نے اسے جواب دیا تھا۔

”ارے میں تو تیرے صدمہ کے جانیاں، میں تو صدمہ آئی ہوں، بیٹھیں نہیں  
آئی۔“

”تو پھر سو بھی جانا، پہلے کپڑے تو دوسرے پہن لے۔“ بیکیا کہہ رہی تھی، میں  
تیرے صدمہ کے جانیاں؟“

”راجہ پنجابی ہمارے گھر کے رے ٹکے ہوئے ہیں، جنھوں نے ہمارا لگ  
کاٹیکہ لیا ہمارے، ان کی چھوکر یاں اور بدلا کے میری گیت گایا کریں ہیں۔“  
”تو تجھے یہ بول چھو گئے؟“

”بہت اچھے، جدی تو یاد بھی کر لیے۔“

جب حدود بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر صمد کا تہنہ اور سینہ ٹھنسن بنیاں  
پہننے لگی تو صمد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”تیک تو لیے سے پٹہ خشک کر لینے  
وے، پھر سینہ۔ اور تو نے یہ کسیری کے رنگ ایسی کرتی تو آثار بھیٹکی، ست خنسی  
انگی میں آثار ٹالوں؟“

”ارے گدا رو کھنسی آئی ہے۔“

”آئی نہ ہو پر اس میں آئی تو ضرور ہے۔“

”ارے بدیت! ابھی اتنی اور صیں نہ جان، میں تو سمجھوں تھی تیں ہنسی کر  
رہا ہے۔ یہ کہے بھی ہاتھ آگے تو نہ پکلا، نہیں تو تیری میری منجے جائے گی۔“  
”تیری میری تو روز ہی مشتاق رہتی ہے۔“

”ارے میری منسا اس طرحوں ٹھننے کی نہیں۔ تیری میری لام باجی (لہجہ ہندی)  
ہو جاگی۔ جھگڑا، راسا، جنگ، کلیں، غورہ، پھو جدارسی۔ اپنے یار کے منہ پہ  
کاٹ کے پکتا ڈال دوں گی۔“

”چاہے تیرے ساتھ پانی پت کی تیں لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں میں جب بھی  
نہیں مانوں گا۔“

اب صمد کی لمبی کی گھٹل کمرے ہم رنگ پتلیوں والی آنکھیں ملطف، مزے اور

اور صحت میں آکر مرنے کے اس پانی کی طرح جھلک کر نہ لگیں جسے چودھویں کے چاند نے  
چاندی بنا کر دکھا کر۔ پھر وہ صلابت کیسے دکھائی۔

بے لباسی میں وہ گھڑ چڑھی اور ٹشک پڑا کہ سی، لقمہ تر معلوم ہوتی تھی گھڑ  
چڑھی وہ اس لیے معلوم ہوتی تھی کہ قدیم قزاقستان کے گھڑ چڑھوں کی طرح  
سے اس کا کمر سے نچلا جسم بہ نسبت بالائی حصے کے زیادہ تو منہ تھا۔ رانیں  
اور پنڈلیاں قد سے زائد بھاری بھاری، قصائی کے تپے کی مانند چکارا سی تھیں۔  
قدیم قزاقستان کے گھڑ چڑھوں کا یہ حصہ جسم اس لیے تو منہ ہو جانا تھا کہ پچھنے  
سے اس پر سواری میں مشغول ہو جاتے تھے جبب زیادہ مشق اور مشقت میں رانیں  
اور پنڈلیاں ہی آتی تھیں۔ محمد کو حسین زیریں قدت نے بلا مشق و مشقت ہی حیات  
کر دیا تھا اس کی رانیں ضرورت سے کچھ زیادہ لمبی، قزاقا اور بھری بھری دکھائی دیتی  
تھیں، کمر اور پیٹ سختی اور ملا غر سے۔ یہ جانکاری صرف صد کمری تھی، ورنہ اس  
کی لپٹ دیکھ کر ہر ایک اسے اجلا پری کہتا۔ وہ کم عمر تھی، لیکن لمبھڑ۔ اس کے  
منہ پر چڑھتی جوانی کے دو ہمارے بھی نکلے ہوئے تھے اور اس کی یہی چڑھتی  
جوانی اس کی گات سے ٹپس پڑتی تھی۔ اس کی باہوں میں کپڑے کی چار چار پانچ پانچ  
سیاہ چوٹیاں تھیں۔ ناک میں سونے کی کرک دار تختہ، جس کا قطر ایک سوا انچ ہو گا۔  
محمد کا چہرہ رنگت میں اس کے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے بدن کے مقابل  
بیشا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے لوٹوں سے دو چار ہونا پڑتا تھا۔ اس کے ڈھکے  
ہوئے بدن میں انرنگی سفیدی تھی اور اس میں انرنگی خوں موجود تھا۔

جب محمد اس ٹکی پرتے پھرنے لگا تو کبریٰ کی بھل ایسے پھسلنے سفید پنڈے

کی تاب نہ لا کر گیس کی خراب جوتی ہوئی لائیں کچھ دم پر ٹکڑاٹھانے سے لگی تھی محمد نے اس کی رانوں اور پنڈلیوں کو توڑیے سے خشک کرنے پر ہی بس نہ کی تھی۔ وہ تو بلا ضرورت انہیں گویا ہلکے ہلکے سلاہاتھا اور حمدو لطف لے رہی تھی۔ لیکن جب دیر ہوئی گئی تو اس نے کہا: ”پانی تو سوکھ گیا اب کھڑے جانے کھن سکھاتا چلے جے بے پورے“

پھر وہ وصلہ ہوا صاف تہنہ اور سینڈ ویش خیاباں پس کے چرخانہ کبیل میں اس طرح سے آدہ کی جیسے کوئی نئی نئی جوانی میں آئی ہوئی گنیا گھاٹ پر نہانے جاٹے اور کسی شہسے کو کھڑا دیکھ کر اچانک کپڑے سے آنکھ سے بغیر ہی پانی میں کر دیتے۔ حمدو نے کبیل اس طرح سے لپیٹا ہوا تھا جیسے اسے تپ لڑھ چڑھ رہا ہو اور وہ ”ہوں ہوں“ کرتی ہوئی کانپ رہی تھی۔ یہ سب یار کو سمجھانے کے لیے تھا۔

حمدو نے واقعی یار کو اتنا سمجھایا تھا کہ باہر پٹرول پمپ پر ایک بیجنی کار ہارن پر ہارن سے رہی تھی کہ کوئی آکر ٹکی بھرے لیکن صمد مہمان کو اتنی دیر کے لیے بھی تھپوٹنے کو تیار نہ تھا۔ بھرکار کے مالک نے جو پٹرول پمپ کابھی مالک تھا، کو ٹھڑکی کے دروازے پر دم دم کی تو جاتر باپ کی چاتر، طبیعت دار اور چرنیکل ٹکی نے ایک دم سے آنکھ کر گیس کی لائیں بجھا دی۔ صمد اسی کی نقل میں رہوں ہوں، کرتا ہوا باہر نکلا تو مالک کی آواز آئی: ”صمد تجھے کیا ہوا؟“

”میاں صاحب جاڑے سے بنجار چڑھا ہوا ہے“

”تو پھر یوں باہر کیوں نکل آیا، کچھ اوڑھ لے؟“

وہ اندر گیا اور حمد کے اوپر سے اپنا چوخانہ کیسل آنا سنے کی کوشش کی لیکن اس مخفی ہائی نے کیسل کو اپنے اوپر ایسا تان رکھا تھا کہ اسے چھوٹتی ہی نہ تھی۔ ہانگ نے پکارا: ”کیسل کوئی کپڑا نہیں ملتا؟“

”میاں صاحب اندھیرا جو ہے“

”گیس کی لائٹیں کیا ہوئی؟“

”بجھ گئی تھی، اور بجے ہوئی نہیں تھی کہ پھر چلا تا۔“

حمد نے کار کی کھلی پٹرول سے بھری نو ترشح ہو رہا تھا۔ ویسے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا لیکن آسوں کے باغوں میں لائٹیں اس طرح سے پھرتی ہوئی نظر آرہی تھیں جیسے شہابے پھر رہے ہوں۔ پیٹرول پیپ کے ذرا ختمی میں واقع آل جنجال جنگل تاروں بھری رات کو مات کر رہا تھا کیونکہ وہاں بے انت جگنو تنگلوں کی طرح ٹٹٹا رہے تھے۔ آل جنجال کے مغرب میں مولسری کے درختوں کا گنج تھا جس کے چرگروہ کانٹے مار بٹا پر کندری کی بلیں پھیل ہوئی تھیں۔ مولسری کے پھولوں کی سیاسی دور دور تک پھیل رہی تھی۔ مغلوں کی بنائی ہوئی اچھی سے اچھی بارہ دری میں سادہ کی ایسی ٹھنڈی ہوا زلگتی ہوئی جیسی یہاں۔

ادھر تو ہانگ کی کار نے مغرب کی طرف شہر کا رخ کیا، جو یہاں سے پچیس میل ہو گا، اور ادھر حمد نے جا کر کوٹھڑی کھولی۔ اب یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پشت پھیرے ہوئے چل میں رہیں ہوں کہ رہے تھے، گویا دونوں ہی کو تپ لڑہ چڑھا رہا تھا اور سخت سردی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد پیٹرول کی آبخ سے مجبور ہو کر حوروں نے ہلکتے ہوئے منہ حمد کی طرف پھیر لیا اور کہا: ”میری کمر تو

پیرٹائے نہی ہے۔“

”منا اسی لیے دوسری طرف پھرا ہوا تھا؟“

”تیں داب دیتا تو ہاتھ ٹوٹ جاتے؟“

”پرٹی کوٹ لے لے داب دوں گا۔“

”دا کوٹ تو ٹھک گئی۔ ارے میں تو تیرے سے مٹا چھوڑن والی ہوں۔ پڑیسی

بلدا کی آس کیا، آج نہیں ٹوٹل گی۔“

”تو اسی واسطے مٹن کسے کر دو ہے رکھ اور جتنی مرادیں اس سے اچھی ہوں

اچھ لے۔ برصا کا کرپ ڈاکو ڈھا کہ میں دکی لگائے بیٹھا ہے، کیا خبر کب خوشیوں  
کی ڈھونڈی پٹا دے۔“

”چپ رہ، چپ رہ۔ میری گردن مروڑ دے پڑیسی باتاں نہ کر۔“

پھر فوٹا نوٹشی کا اندر شروع ہو گیا۔

وہ ایک دوسرے کے جسم سے گرنی، لطف اور آسائش حاصل کرنے کو

ایک دوسرے کی اس طرح سے اکوڑا بھر رہے تھے جیسے ایک دوسرے میں

سراپت ہی نہ کر جائیں گے۔ رات بھر کسل تو ایک تھا پر اس میں جی دوتھے۔ اور

تمام رات ہی بچلی کی چمک، بدلوں کی گڑگڑاہٹ اور بوند باندی کے ساتھ سادوں

کی گدگدائی اور ستم گر ہوا چلتی رہی تھی۔ صمد جو ساکھے پر ساکھا اور خجور پر پستی کر

رہا تھا تو بعض دفعہ حوروں کو دیکھ رہی تھی: ”ارے جھٹے نے باجوں (نٹے) باندوں

کی طرح کیا چسکیاں لگا رہا ہے؟“ پردے میں لڑکیاں دھو رہا ملا کہ اہرا لگا رہی



تھیں اوسان کے تازہ تازہ گلوں سے نکلے ہوئے بوتلوں کو ٹھنڈی پرن کا ہر ایک جھکواڑے چاؤ کے ساتھ اپنے میں رہائے لیے آ رہا تھا۔ ساتھ کسے ساتھ مونسری کے پھولوں کی سباس بھی آ رہی تھی۔

(۲)

صبح کے وقت جب باغوں کی دلی کوئل کی کوئل گھیری میں افندی افندی آنکھوں کو پروری طرح سے کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے حوری بولی: ”اے اب تیں مجھے کہاں ٹکا دے گا۔ اس تیرے کٹھنر مان تو بڑا چاند نا ہوا جا رہا ہے۔“

”تو تیری مرضی یہ تھی کہ سو دج بھی نہ بچھے۔“

”نہ بچھے تہ تے تے دکھن مان میلوں پھیلے ہوئے کلاے آسوں کے باگوں باغوں کی آڑ لیتا ہوا چلا جاوے۔“

آخری فقرے کے آخری بول ابھی حورو کے چھوٹے سے منہ میں ہی تھے کہ اس کا باپ نصیبو چوہان جو جیل خانے کے داروغے ایسا تھا، ٹانگی لیے ہونے داخل ہوا۔ حورو نے اس کی جلا داند صورت دیکھتے ہی چیخ ماری: ”ہائی!“

نصیبو چوہان اس پر ٹانگی چلانے کو ہوا تو حورو کبل سمیت پھیل اتری کھڑکی میں کود کر ہاتھی سوئڈے سے چھپا ہوا اکیست عبود کر کے آں جنال میں جا لکی، جو آڑ کباڑ درختوں، جھاڑیوں اور بیوں کا چھوٹا سا ایک مزاج میل گھٹا جھل تھا۔

جب یہ سسواہن ایسے پچھلے بدن والی اپنے مٹھی بند ہاتھ ست خمی گیا تک اٹھائے کو لامارتی ہوئی کتر داں چال سے بھاگی تو بہت سے سوہ بھی حروا حوسی میں بھاگنے لگے۔

جس اڑا ہے میں حدود داخل ہوئی تھی برسات کے دنوں اس میں گھٹتے ہوئے  
 بھی ڈرتے تھے کیونکہ یہاں بھڑوں، تفتیوں ایسے مزدوروں کے چھتے تھے اور  
 ہر وقت ان کی بھیس بھیس ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ نومبر کا چھپا کہتے ہوئے  
 مددکاری کہتے اس میں چلے گئے تھے تو وہ نکلاتے ہوئے نکلے اور تھوڑی دور  
 جا کر ڈھیر ہو گئے۔ اسی طرح سے عرصہ ہر افیترا ڈاکر جتنا پاریا حبیب مردوں  
 والی پر حملہ آور ہوا تو کرنل فوٹ اور بیگم فوٹ موسیٰ گنج میں سادوں کے مزے  
 لے رہے تھے۔ کرنل نے جو ٹاگلا سنا تو پیدل پیش کے درجن بھر داخل برادر  
 گودے پر دوسے میں بھیجے اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر نڈا بھڑ پھیندا۔ گورے اس  
 وقت آئے جب ان کے سامنے کونا کر بندی کرنے والے کسی ڈاکو نے کین گاہ سے  
 گولی مار کر ختم کر دیا تھا۔ گورافوج کی ان دنوں بڑی دھمک تھی اس لیے ڈاکر بھاگ  
 کر آل جنبال میں جا چھپے۔ پھر ایک بٹالین نے جنگل کا گھیرا لیا اور جو بھڑوں  
 تفتیوں کھایا ڈاکو باہر نکلتا گورے اسے سنگینوں سے قید بنا ڈالتے۔ فقیر یا اندر  
 ہی پھیرا اور ڈنگوں کی تاب نہ لا کر آل جنبال میں ہی مر گیا۔

کرنل کی وفات کے بعد بیگم فوٹ گنج میں ہی پھیری رہی، یہاں تک کہ اس نے  
 نصیبو چوہان کے کسی بزرگ سے پول بڑھا لیا۔

توانائی جانوں کے لیے اڑا ہے میں بہت ہی خطرے تھے۔ لیکن نصیبو  
 چوہان پھر بھی اندر داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر میں باہر آ گیا کیونکہ اسے واقعی جڑی  
 ادرتیتے پٹے ہوئے تھے۔ جب حدود کا باپ عاجز آکر منہ ڈنگوں سے سجائے  
 لیکن جھکیا یا ہوا پر دوسے کی طرف چلا تو وہ ابھی گونوارہ میں ہی تھا کہ مغرب میں

جہتی ہوئی برساتی ندی کے کنارے ڈنگر چرانے کے لیے گھر میں سے آتے ہوئے  
 لڑکے اسے دیکھ کر کھلی بازی میں چکر یا بچانے لگے : ”ہو دورا، ہو دورا،  
 ہو دورا۔“

اس وقت گاؤں کے ہرے ہرے سوانے پر گھمبیر اور ٹپکاؤ گھٹائیں چوکھٹ  
 چھائی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں سخی ایسے زرد پھولوں والی پنوار، کہیں لال یا زرد  
 گل عباس، کہیں باتے کے سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ امریوں میں کونٹیں  
 کوک نہری تھیں۔ بہت سے بے پینی سارکے خوراد کھلاڑ پرندے موسری کے  
 کنچ میں جگمگ زنگری کا پورا منظر ہرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اتنا اندر مچایا  
 ہر انٹا جیسے اس سر پھٹوں میں بھی لہولہاں ہو گئے ہوں اور اس پر دے  
 کے وہ ہزاروں مود، جن کی حفاظت یہاں حرم کے کبوتروں کی طرح کی جاتی تھی،  
 کھیتوں میں فارغ البال شہزادوں کی طرح خامان خرامان پھرتے ہوئے بادل کی  
 گرج پر ایک ساتھ جھنگا رہے تھے۔

مردوں والی کے چوگر وہ چاندوں پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں مردوں کا شکار یا  
 گزند سامان منع ہے۔ برطانوی احمد میں کسی انگریز ضلع افسر نے برساتی ندی کے  
 پل پر ایک مور مار لیا تھا تو پردے والوں نے اس کے وہ لٹھے مارے تھے کہ اسے  
 شکم میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔ پھر جب مردوں والی پر پانچ ہزار اجتماعی  
 جواز ہوا امداد میں مال مویشی تک جانے لگے تو ایک ہزار کی بندھی رقم میرہ کر دل  
 فروٹ نے دی تھی جس کا نصیب چوہان کے کسی بزرگ سے پہلے تھا۔ اور اس انگریز  
 عورت کی نسل تھی۔

جب ریح کی فصل گھٹنوں گھٹنوں سے کم ہوتی تھی تو پرسکون سولے میں ہزاروں  
مردوں کا پھرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن آج چوراسہ میں ان کا جھگڑنا اور بھی اچھا لگتا تھا۔  
پراٹھوں سوجے نصیبو کی تو اس طرح کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ جب وہ پڑے  
پہنی تو بشیش ریشے کی دکان پر اسے دیکھ کر کتے بھونکنے لگے تھے اور ساتھ کی ساتھ  
کاٹا ریل بھی پڑ گئی تھی۔ حمد کو کبیل نے موزیل سے بچایا تھا۔

بعد عشاء جب لاشینیں باغوں میں شہابوں کی طرح سے پھرتی ہوئی معلوم  
ہونے لگیں تو پھر کبیل تو ایک تھا، پر اس میں جی دو تھے۔ اہ جب سادوں کی گدلی  
گدلی جاندار اور ستم گر ہما چل رہی تھی، آسمان پنٹ گھور ہو رہا تھا، گھاؤں کی ہڈیاں  
دھیا مار گارہی تھیں تو نصیبو چوہان کی دہلیز میں پچاٹا جڑا ہوا تھا۔ اس نجات  
میں گئے ہوئے پانچ ہی آدمی تھے: نصیبو چوہان، اس کا بھائی بیبا چوہان،  
پٹواری رحیم بخش اور حور مل کے دونوں ماموں۔ بھکت یہ چھڑی ہوئی تھی کہ  
پپ مالے سے کیسے بد لیا جائے۔

اُدھر ایک ہی کبیل میں دو جیروں گھس گھس کر رہے تھے: ”ارے صدرا  
تیں بھی بڑا مٹھو چنڈا کاٹھ کا اُلو ہے۔ نصیبو چوہان تو کھوٹی جھوٹے نوں مارنے  
کا پنچا تھی ہمالا لیسٹوں تیرے اس چاکی برگے چھلتے ماں گھپونے آنا ہو گا۔“  
”تو تو پٹر دل پپ پر آنا جانی کیوں نہیں چھوڑتی؟“

”یو کی بھکت چیوڑا نہیں مانتا۔ اس کی ہر بھکت بوہی رٹ ہے۔“ وہیں  
پہل، وہیں پہل، ”سورج چلکا مٹھوڑے گا تو میں بیاں آنا مٹھوڑے دوں گی۔“  
”جو اس نے نہ چھوڑا تو نہیں؟“

”نہیں، نہیں۔ یوں کہہ پڑو! پیپ پر جم جم آ، اندھیرے آ، اجالے آ۔“  
 ”تو آ کے نت ہمیں رہے بے، کبھی گھر نہ جائے۔ اب تو خوش ہے۔“  
 ”گھس ہوں۔ جو میں گھر بیٹھے ہوئے سوچا کروں ہوں، پڑو! پیپ پر  
 جاؤں گی، تو میرے دل ماں گھسیوں کے سوزنا چین لاگیں ہیں۔ ہمدرد تیرے  
 دھندلے آؤں ہوں تو یوں لگا کرے ہے جتنے سامنے سونے ماں سوز ہی ہمدرد  
 ناپاچ رہے ہوں۔“

اور جد میں تیرے دھندلے سے جاؤں ہوں تو یوں لگا کرے ہے جیسے  
 ہرے ہرے دھانوں میں کھجور کی کھار ہی ہو۔ جیسا گھیس کرے ہے بس ابھی آج  
 ساتھ لیکھا چمکا برابر کرو۔ یہ چھتیس بھوجن اور پنج پکوانی کل کے واسطے کیا دھندلا  
 کیا پتا کل دن چمکے نہ چمکے۔ جو کچھ ہے آج سپڑاؤ پھر ملنا ہوتا ہو تیرے بتاؤ میں  
 ٹھنڈے سی ہوں تجھے دیکھا ہمدرد بھراؤ۔ جو کوئی کسی کی ڈھیر دیر سے باٹ دیکھ  
 رہا ہو پھر وہ آجادے ہے تو بڑی قدر ہو ہے۔“

”میرا تو ہر لمحہ ہی تیرے انتظار میں گزرتا ہے۔“  
 ”جس بچہ نے بھڑوں کھا یا نصیبو چہاں پوٹوں جیسے گال بتائے ڈھکھا سا  
 گھر میں آیا تھا اس رات تجھے کیوں فیندا گئی تھی، آسک تو چاندنی رات ماں ٹیڑھوں  
 کی طرف جاگا کریں ہیں۔“

”میں تو تیرے پسنے دیکھنے کے لیے سر گیا تھا۔“  
 ”دیکھے بھی؟“

”ہاں، جانے تیرا میرا بیاہ ہمدرد ہا ہے۔“

”بس تیرا میرا بیاہ ہو گیا۔ سینا اٹھ ہو ہے۔“

”تو تیرا میرا بیاہ نہیں ہو سکتا؟“

”یہ تو میں کہہ ہی نہ کہوں گی پر سینا اٹھ ہو ہے۔ پر دیکھ نہ مجھے نصیب چچاں  
اچھا لگے نہ کوئی دوسرا لگا سکا۔ سعل کھائے، چچا جھپیوں میں ہی سامنے رہے  
ہے۔ جو فواج پڑھی کھڑی ہوں تو میری فوج ہی نہیں ہوتی۔“

”نماز کیوں نہیں ہوتی؟“

”تیں فواج پڑھیں مے تو ہو۔“

”کیوں؟ کیا میں تجھے ہنساتا ہوں؟ میں تو تیرے گدگدیاں بھی نہیں اٹھاتا۔“

”فواج پڑھتے ہوئے میرے سامنے داما ہو ہے جو ٹھالی بیٹھے ہوئے

بھی نہ ہوتی۔“

”کیا؟“

”بس پر چچاں کہتے۔ ارے اللہ ماہ سلاٹو ہے، کالیے، بہ محاس!

تیرے آپرے ہونٹ پر غصہ ہی غصہ ہی سی مونچھاں پھوٹی لالگیں پر تیرا منڈا پھٹ

گیا۔ جو بات تیں کہہ سکے ہے ہر بات نہیں کہہ سکتی۔ میں بڑی گناہگار ہوں جیسی

نیت دلیا لیکن اب کے رہ جائی آیا، میرے رو بے (روزے) نہیں ہونے

کے۔ جو میں دل میں تیرے دھورے آئی تو روجا کہاں کھر پانچوں کھبت (وقت)

کی نماجاں پڑھوں تیرے دھورے آ کے ایک بھی نہ پڑھی جاتی۔“

”میں روکتا ہوں؟“

”تیں کیا روکتا۔ بس پڑھی ہی نہ جاتی۔ جہ میں تیرے کئے آیکروں تیں

روٹھ جایا کر۔ مناؤں تو مٹا نہ کر۔“

”کیوں؟ تو ہی دوس جایا کرنا۔“

”میں ہنسو کر ہوں، مجھے تو مٹانی آئے گا۔“

”تو تیرے خیال میں میں بڑا کڑھوں۔“

”کڑھ تو مٹ ہی ہے۔ میں ہی تیرے پاس آئی ہوں، اتنی تو میرے لیروں (لیجے)

کہ جی پر دوسے کی ڈھب ڈھائی گدم (قدم) بھی نہیں بڑھایا۔“

”وہاں بلا کے میرا اس فرنگی جیسا حال کرنا چاہتی ہو گی جسے شکرم میں ڈال

کے ہسپتال لے گئے تھے۔“

”اُسے میں تو تیرے ساتھ لیروں ہی گلیج ماری ہو رہی کھاں کہہ رہی تھی۔

میں اپنے کالے لٹریڈ کے لیروں بھوری جھینس کے دودھ کی کھیر لاؤں گی جس

ماں پستہ پر ام پڑا ہوا ہو گا ہمد ڈھیر سی ملائی، پر لالے! چھپیاں ساتھ ہوں گی۔

ہاتھ نہ تیں سانے نہ میں۔“

”میں تجھے سو روں پھرتے ہر لالے کھیتوں میں دور سے آتی ہوئی دیکھوں گا۔

تو ریشم کے ست رنگی اینڈے پر کھیر رکھ کے لاؤں گی۔ راجہ اندر کے

اکھاڑے کی رفا صبر سز پر ہی ایسا گو کھرو جڑا جھول دار کا کاہی لینگا اور ست

خصوصی انگلیا بہنے ہوئے۔“

”میں تو کھیر کٹور دان میں لاؤں گی۔ جو ہنڈ بھر کے لاتا ہوتا تو پھر گنڈو دی

کی چاہنا تھی، ہو رہی تو رات فوں آؤں گی، ایسے ماں پٹ بیمنوں کا چاندنا ہو

تو رہو، تیں مجھے دودھ سے آتی ہوئی کیسے دیکھے گا؟“

”ڈیٹھناں دیکھ لیتے ہیں۔“

اس کھٹے میٹھے مذاکرے کے بعد ان میں دوسری قسم کی خلا ملا ہونے لگی۔  
گیس کی لالٹیں چاہہ بری تھیں بجائے زنجنتا میں دیکھنے کے بس بچہ جائے، لیکن  
اس گیس کی لالٹیں کے چاہنے سے کیا ہوتا۔ وہ انھیں اپنی دن ایسی روشنی  
میں سینہ بہ سینہ ہوئے نئے نئے کھیل نکالنے اور ہل چل مچانے سے کیسے  
روک سکتی تھیں۔ آج بھی وہ ایک دوسرے میں گویا سرایت ہوئے جا رہے تھے۔  
آسمان ریٹھے ایسا کالا چوک ہو رہا تھا۔ برساتی ندی کے طوفان سے  
جوبل میں حبیب جھانپیں پیدا ہو رہی تھیں پٹرول پمپ کے دونوں دھم اس  
کی گنجائش رہے تھے۔ ایک مربع میل کے آل جہاں جنگل پر تاروں بھری رات  
کا دھوکا ہو رہا تھا کیونکہ وہاں بے شمار جنگل چنگوں کی طرح اڑ رہے تھے۔  
جنگلوں نے شور مچا رکھا تھا۔ جھینگ بول رہے تھے اور ٹھنڈی پون کا ہر  
ایک جھکورا گاؤں میں دھو دیا طار کا لہرا لگاتی ہوئی روکیوں کے بولوں کو بڑے  
چاؤ کے ساتھ اپنے میں مائے لیے آ رہا تھا۔ ساتھ کے ساتھ کچھ سے دوسری  
کے پھولوں کی لباس بھی آ رہی تھی۔ جرنیل سڑک پر جو مزدور ٹرک میں میٹھے ہوئے  
گزر رہے تھے ان کے گیت کا یہ ٹکڑا آسمان پر روٹی کے پیل ایسے بادل کی  
طرح فضا میں مٹا رہ گیا تھا :

سہ سہ پیسے کل سہے، آدھی رات تو کوک

میں داری کرتا کی، اٹھے یکھے ہوک

گیت کے اس ٹکڑے پر حوروں کی آنکھوں میں آنسو ڈھبائے جنھیں صد



نے اسی کے موتیوں ایسے رخصتوں سے پھیلنے ہوئے دیکھا۔ پھر اسے منہ کے  
سے رنجیدہ خیالات کی مداخلت بے جانتا گوارا کرنے لگی۔ خوشی کے لمحوں کا  
قصر اسے پسند نہ آیا۔ وہ ایک نعت اس طرح سے کھٹکھٹا اٹھی جیسے کوئی بچہ  
خند میں رو رہا ہو، اسے خند کی چیز مل جائے تو وہ قہقہے لگانے لگے۔ اس نے  
ٹھٹھک ٹھٹھک کر گانا شروع کر دیا :

میری ٹوٹی نقشب کی گونج

بدیسیا سے اب نہ بولوں۔ سلام

پھر بوندیں اُتر آئیں۔ جھکا ہوا بادل جو زور سے گر جاتا کوئی ہزار مورا ایک  
ساتھ بولنے لگے۔ سارنگی کے لہرے ایسے دھندلے یا طار کا کوئی بول اب بھی  
سناؤ دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ جھم جھم، جھم جھم، دھڑ دھڑوں برسا کر گاؤں  
میں جنگی پرندے جھیتوں کا پانی خالی کرنے سے قاصر ہو گئے، جو منڈیروں پر سے  
پر نکلا۔ جرنیلی سرگ پانی میں ٹوب گئی تھی اور چرخانے کیل کے دو جی ایک دوسرے  
کو جیت رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جان لٹا رکھی تھی۔  
اس اشغال میں تو چور سینہ دھلکا کر ان کی ہر چیز کا صفایا بھی کر جائے تو ان میں سے  
کوئی بھی غل نہ ہوتا۔

(۳)

چوپائے کو تو کوئی کھونٹے سے باندھ کر یا پھانک کر ناراڑ گڑے میں بھی رکھ  
کر رکھ سکتا ہے لیکن دوپائے کا روگنا بڑا کٹھن ہے۔ دھوپ لاساں ہر یا بھونری  
رات، یہ جنم بگڑی آپوگ پر ٹول پیپ پر جا کر مٹا مٹت بازی کرتی تھی۔ اسے

’کوئل گار ڈنگ کے ذریعے روکن ناممکن تھا۔ اب تو وہ چسپا چسپی نہیں کھلا کھیل رہی تھی۔

پٹواری نے ایک مرتبہ بڑی مناسب تجویز پیش کی کہ محمد اور محمد کا نکاح پڑھایا جائے لیکن ایک ڈپو ڈسٹر اور مردہ سے گنبد، دوسرے سے لمبھڑ میناس والی مسجد کے امام ملاشر نے ڈانٹ دی: ”یہ دونوں تو مگسار ہونے کے قابل ہیں، ان کا نکاح نہیں پڑھایا جاسکتا۔ اس مستانی لڑکی نے سلیم خورش کا نام خوب روشن کیا ہے؟“ احمد ملاشر کے فتوے کو کوئل مسترد کر سکتا تھا۔

دراصل اس پاکباز پر سے کاکوئی بھی مردہ و ایسی لڑکی سے نکاح پڑھانے کو تیار نہ تھا، اور تیار تھا تو صرف پٹواری دیکھ کا کڈھیلڈ جنگیرا۔ یہ اس لیے تیار تھا کہ اس کی شادی کہیں نہیں ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنی ماں ہی کی طرح کالا کالا تھوڑے کم قد تھا، لیکن بلاکالاقت دور۔ پر یہ سب جانتے تھے کہ وہ ماں باپ کی طرح سے بھنگی ہے اور اس کا باپ اب بھی جتنا پار کے موضع متگل پورہ میں چربانوں کے گھر کاتا پھرتا ہے۔ اس کے منہ میں ہر وقت حقہ رہتا تھا اور پیچھے کتا۔

ایک بھرساؤں کے سانچے میں، جب برساتی ندی ناگوں ناگوں ناک بہہ رہی تھی اور ٹل کے پہاڑی جنگل سے بہتے بہتے بھر گئے گویا پل کے کھولتے ہوئے پانی میں دیواروں سے ٹکرا کر صیب آوازیں پیدا کر رہے تھے، پٹواری دیکھ مع نصیبو چربان، اس کے بھائی جیسے چربان اور محمد کے دونوں ماموں پٹول پمپ سے دو فرلانگ فاصلے پر، جانب غرب، شریے جانے والی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ جب یہ پانچوں شہر جانے والی بس میں بیٹھے تو خوب اندھیرا ہو چکا

تھا اور دھواں دھار قسم کے گاڑھے بادلوں سے ٹم ٹم بوندیں پڑ رہی تھیں۔  
 مردوں والی کے مسافر شہر بعدِ عشر پہنچے۔ گو بادل اس وقت تھا ہوا تھا  
 لیکن زمین پر چھٹی ہوئی گھٹا سے اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ انھیں بس نے کہیں باغ  
 کے پاس آکر رہا تھا۔ یہاں سے کئی گنبدوں والی کوٹھی، میاں جمعیت کی رہائش  
 گاہ، آدھ میل جنوب میں تھی۔

جب یہ دیہاتی کوٹھی کے پاس بھاگ پر پہنچے تو اس کے زبردستی آہنی  
 کواڑوں کے پاس جا کر چوکیدار کو آواز دینے کی قدرت کسی میں نہ تھی۔ چوکیدار نے  
 کچھ سرسراہٹ سی محسوس کر کے آپ ہی ان کی طرف ریوڑ سے گاڑ کی لالٹیں ہنسی  
 روشنی پھینکی۔ جب انھوں نے اپنا دم چوکیدار سے بتایا تو وہ ان کا میاں جمعیت  
 سے ملنے کے لیے معاون ہوا۔ میاں جمعیت نے اپنے ملازم صدر کی کہانی بگوش  
 ہوش سنی اور جب ہی مردوں والی کے لیے اس طرح روانہ ہو گیا جیسے کوئی  
 منغل اعظم اپنے باغی صوبہ دار کو سزا دینے کے لیے نکلا ہو۔ بڑی لمبی کار  
 میں ڈرائیور کے پاس تو میاں جمعیت بیٹھا تھا اور پیچھے شکایت کنندگان۔

جب یہ کار پٹرول پمپ پہنچی تو اندر تلامچ بچ چکا تھا لیکن تاحال صدارت  
 حدود و ہرے پر اسٹے کی حالت میں ہی تھے اور ان میں یہ محبوبانہ گفتگو ہو رہی تھی:  
 ”اسے ڈورے، کالیے، آجی مونجھ نکے! جو پر اسٹے کے دونوں پڑھیں  
 یوں ہی جڑے ہوئے ایک جگر ہیں تو اچھی بات ہے۔“

صدر: اچھی ساعت زیادہ دیر نہیں صبر کرتی۔ جس طرح سپی کا منہ تھڑی  
 دیر کو موتی بنانے والی بوند کو لینے کے واسطے کھٹے اور پھر بند ہو جائے وہیں اس کا

قیام اتنا ہوتا ہوگا۔ اور سنی، تو میں مجھے کالیا نہ کہا کر۔

حدود: سبحان اللہ! کلمے نے کالا کہا کر دیا، گور سے نے کالا کہا، سنس دیا۔ سنارے گوریے۔

مسجد: تو مجھے گوری یا بھی نہ کہا کر۔

حدود: تیں چارے ہے میں تجھے سانولا سانورا سانویا کہا کر دوں۔ تیں فی با تھا مجھے سیام ہرنی بڑا ہی اچھا لگے ہے۔

معلوم نہیں بول چال کے پشتگو نے کب تک کھلتے رہتے کہ میاں جمعیت نے کواڑ دھڑ دھڑائے: ”مسجد، کواڑ کھولو“ چاتر باب کی چاتر اور چوکسل بیٹی نے گیس کی لائٹیں بجھا کر شمالی کھڑکی کھول دی جدھر کھیت میں ہاتھی سونٹا آگیا تھا۔ ایسا اس نے اس خیال سے کیا تھا کہ مالک پوچھ گچھ کرنے لگے تو وہ کھڑکی سے باہر کو دکر دیوار کے پاس چھپی بیٹھی رہے۔ ابھی مسجد نے چٹنی نہیں کھولی تھی کہ کھڑکی کی طرف سے پانچوں دیہاتی اندر داخل ہو گئے۔ پڑوسی نے آگے بڑھ کر چٹخنی کھول دی اور میاں جمعیت نے ٹارچ کی روشنی میں کیری کی بجلی ایسے پنڈے والی کو اپنے غلام کے ساتھ اور پری حالت میں دیکھ لیا تھا۔

پھر میاں جمعیت مسجد کو کار میں بٹھائے ہوئے شہر کی طرف لیے جا رہا تھا۔ کار برساتی ندی کے پل سے گزرتی تو پار سڑک کے دو جانب ڈیڑھ میل تک مسجد کے میناروں ایسے سفیدے کھڑے تھے۔ ان سے مسجد کا جی زیادہ ہی خراب ہو گیا کیونکہ اسے مہر مہر میں مینار سی لڑکی یاد آنے لگی۔

وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اب پڑول پمپ پر جانے کے خیال سے کسی کے

دل میں خوشیوں کے سور نہ ناچیں گے بلکہ وہ تو پیر ہیٹ کر مرجائیں گے۔ اس کی آنکھیں رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر جی شہر کی طرف سے ٹک آیا جس میں مزدور گارہے تھے :

کھٹے اُدر میں کھڑی، سبز کبوتر جائے

سیٹی مار بلائے لوں، جوڑا بچھڑا جائے

یہ سن کر اس کے ہر چھوٹ گئی اور ٹپکس کے سبب اتنے گرم گرم آنسو ٹپکے کہ جلد ہی اس کا دامن بھیگ گیا۔ ددر گئے کی آس جوتی ہے، اسے اتنی آس بھی نہ تھی۔

اُدھر حمد کو مری پانچوں دیہاتہ علی علی بوندوں میں گاؤں لے جاتا چاہتے تھے جیسے کوئی پہاڑ سے تازہ آئی ہوئی قربانی کی دہی کو مریشی منڈی سے خرید کر گھر لانا چاہ رہا ہو اور وہ آگے کو نہ چلتی ہو، تو یہی حال اس شاخ پیدا سی ٹپکلی گیری کی بجلی ایسے پنڈے والی کا تھی۔ بجائے حسبِ عادت ٹھک کر چلنے کے وہ تو کھڑی ٹپک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے تو گودے گویا بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔ وہ مجبور ہو کر حورو کو پروے میں اٹھا کر لے گئے اور دات بھر اس پر گویا بکٹ کا پرہ بیٹھا رہا۔ اس نے صبح کو گائے کے کھن سے بسنی کھا کر ٹھنڈی لسی نہیں پی جیسا کہ ان کے گھر دستور تھا، کیونکہ صبح ہی سے جلیگر اگڑھیلڑ جھاڑ جھٹلاسا دیکھنے کیڑے پنے ہوئے ان کی ریلیز میں بیٹھا سخت پی رہا تھا تاکہ اس کا نکاح حمد سے پڑھا دیا جائے۔ اس کا کتا ہر آنے جانے والے کو بھونکتا اور کلٹنے کو لپکتا تھا۔ حورو کے گھر والے اسے دھاڑ کے دے رہے تھے۔

جب ملا شہر نے اس نجس لڑکی کا نکاح پڑھنے سے انکار کر دیا تو نزدیکی گلاؤں  
بھرد سے والد سے ایک لالچی کٹ ملا بلوایا گیا اور دو بول کے بعد حوروں پر طحور  
میں بھیٹی ہوئی پل سے گز رہی تھی۔ اس دہن کے نہ ہاتھ پیسے تھے نہ اس کے  
پاس زبرد تھا، نہ یہ بھی وجہی تھی۔ جسے ہر ایک دیکھنے والا ٹال کی ٹوٹی کتا آج پال  
کی کی نظر آ رہی تھی۔ نکاح کے وقت جب اس سے پوچھنے گئے: ”تجھے جنگیرا  
قبول ہے؟“ تو وہ اسی طرح لا تعداد بار ”نہیں نہیں“ کہتی رہی تھی جیسے کبھی  
صمد کے ساتھ۔ لیکن اس پہل نہیں اور اس بعد کی نہیں میں یہ فرق تھا کہ وہ نہیں  
مگسے پی، چکنس بازی اور چوچلوں بھری ہوئی تر ترم خیز تھی اور یہ نہیں کہتے  
ہوئے وہ بول نہیں رہی تھی بلکہ بلک رہی تھی۔

شرعاً و قانوناً یہ نکاح جائز نہیں تھا اس لیے پڑاری اور کڈھیلہ جگیرے  
نے نئی دہلی کو قابو میں رکھنے کے لیے سن کے درتے رکھے ہوئے تھے۔ ان  
دستوں کی ضرورت انہیں کبھی نہ پڑی۔ اس اتحاد کی میں اس سے بھاگا کاں جاتا  
تھا۔ وہ تو سسکیاں لے رہی تھی۔ پل کے نیچے کھولتے ہوئے سے طوفانی پانی  
میں دیواروں سے لگ لگ کر بھر لٹے مہیب آوازیں پیدا کر رہے تھے۔  
خاندانوں کی جگہ حمدی کی شادی میں یہ باجہ تھا جگیرے کی دہلی کی آنکھیں تو  
رودر کر ٹیسوی ہو رہی تھیں اور کھلوان چہرہ جھلایا جھلایا سا، جس کی تمام  
جکاجوت اڑ چکی تھی۔

اس پانی پیتے ہوئے میں یہ میل جمنکے لائٹسے پل کو عبور کر کے ریڑھوں پر  
کی جھلسی ہوئی سیاہ منہ پہاڑوں میں پہنچانے والے تھے جہاں کبھی سلطانہ اور

فقیر یا جیسے ڈاکوؤں نے اپنی آماجگاہیں بنائی ہوئی تھیں، جہاں انہماجوں میں آماج اس بھوڑ میں صرف باجرہ ہو سکتا تھا، پھولوں میں پھول لگا پھول کاغذ و پھول اور دانوں میں آواز گیدڑوں اور کھٹکھٹوں کی۔

کچھ دن بعد معدوں والی میں کسی نے آکر کہا کہ نصیبو چوہان کی وہ گجرا سی بسک ہنسنی ہلا سی پری مرگئی ہے جس کے منہ میں پٹرول پیپ سے لٹک کر نہ ایک بھیل گئی تھی نہ ایک قطرہ پانی۔ دہلا سی اپنی دلس کے لیے لالہ بدال میں عروسی پڑے کے کر گیا تھا لیکن دلس نے نہ کھلے۔ اس کے پرانی جگہ سے نے کلیسر کی منہ جھلسی پھاڑیوں میں نکال دیئے تھے۔ ریشمیر مرداس کے سناٹا پہلی ہی رات شام سے طاقت آتا تھا۔ ویسے جگہ سے نے محبت اور لٹ پیار کی باتیں کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن عرو کے منہ سے ہر گھڑی بس ”نہیں نہیں“ ہی نکلتا رہا تھا۔ پھر گویا اس کی کانپ اس طرح سے توڑ دی گئی تھی جیسے چڑی کے ٹنڈے کے کو پدی پر سے توڑیں تو شوق سے دو ٹکڑے ہو کر الگ الگ جاگے۔ تکی کمر میں ہی بڑا نقص ہوتا ہے۔

اچھا ہی ہما جو نصیبو چوہان کی کرم پھوٹی جانی زبردستی کے شوہر کے زور ظلم سے ایک ہی رات میں مر گئی۔ عورتیں کو سنا دیا کرتی ہیں: ”اٹھی، تو لہما تے جائے!“

صمد سے بچھڑ کر اس کا زندہ رہنا تو بہر صورت محال تھا لیکن تجربہ کرنے سے لہما تے گزر جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

(”سوریا“ لاہور)

## تیاری

اللہ داد جب تیا صاف سر پر لپیٹے۔ اعلیٰ قمیض اور دھوٹی پہنے پاؤں میں سرخ پٹھوہاری جوتا ڈالے صحن میں آیا تو خدیجہ کو فوراً بات کھٹک گئی مگر بندوٹی جیت سے بولی ”چاچا کہیں جا رہے ہو؟“

اللہ داد نظریں ملے بغیر بولا ”ہاں بیٹی یہ اپنے ملک جی ہیں نا۔ ماشا اللہ ان کی بیٹی کی کل رات ہے بس وہیں جا رہا ہوں۔“

”بلاوا آیا تھا؟“ خدیجہ نے انہماں ہی کر پوچھا۔

”ہاں بیٹی۔“ اللہ داد نے ذرا ڈھیلے پن سے سر ہلایا تو خدیجہ سر ہو گئی

”سبح بتاؤ چاچا کیسا بلاوا تھا؟“ اللہ داد قد سے سٹ پٹا گیا، پہلے اثبات اور

پھر نفی میں سر ہلا کر بولا ”دراصل وہ قناتوں کے باسے میں پوچھنے آئے تھے

میں نے کہہ دیا کہ بھائی اپنے سامنے گلوں گا تمہارا کیسے اگر کہیں کسی بوٹے

میں چوب گاڑ دو تو۔“

”تمہیں کیا کہیں گاڑیں چاچا۔ پر تمہیں تو خادری والے گھروں کے گرد

منڈلاتے رہنے کی بری عادت ہے۔ بھلا یہ بلائے بھی کوئی یوں کرتا ہے؟“

خدیجہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔



”اوہ! بیٹی! اللہ داد کھیلنے پر سے سر ہلا کر بولا ”رفیق میلہ دیکھ لینے سے کسی کا کیا نقصان ہو جاتا ہے اپنا دل بہل جاتا ہے ذرا خوش ہو لیتے ہیں لاڈلیوں کو دے دو انہیں یہی تماشا دکھاؤں“

”ہر جسے دو چا چاہیہ کوئی پھک منگے نہیں ہیں“ خدیجہ نے منہ بنا کر کہا۔  
 ”تو کیا میں تمہیں بھر چاؤں ان سے مانگ کر کھاتا ہوں....“ تجھ پر تو ایک دانہ بھی حرام سمجھو! اللہ داد کو عقد آگیا اُس نے ایک جھٹکے سے گھٹنوں سے پیشی نیلی کو پرے دھکیل دیا۔ ”سٹ سے بے معاش تو بھی“۔ اس نے پیلو کو بھی پیچھے ہٹایا اور تیر کی طرح باہر نکلا چلا گیا۔ پیلو ماں سے ندامت منہ مسورتا پیچھے آیا اور ڈیڑھ گھنٹہ میں آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر خدیجہ بھی نیلی کو کولے پر لا کر آئی اور پیلو کے ساتھ کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگی۔

اللہ داد اپنے لیے باندھ کر آگے پیچھے تھلاتا سامنے گاؤں میں جا گھسا تھا اور سفید برقع کپڑوں کے باوجود تھائیں لگانے والوں میں گم ہو گیا تھا۔ خدیجہ نے پیلو کا ہاتھ پکڑا اور بولی: ”چل سے۔ اندر چل۔ کسی کا بیاہ اور بتا شے کوئی بانٹے۔ وہ قلاب دونوں نظر نہ آئے گا۔ دکان بھی نہ کھولے گا۔ گنجی میں سے پیسے نکال کر تمہارے مال مدنی کھا رہے گا۔ چل تو اندر چل اسے تو بیاہ دیکھنے کا سودا ہے۔ جہاں لال پیلی جھنڈیاں نظر آئیں وہیں کا ہو رہا۔ تو بھی اس کے ساتھ سودا ہی ہو جائے گا۔ چل اندر چل! وہ اسے گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

اس وقت اللہ داد تنہا ہوئی قاتلوں کے نیچے خالی گراؤنڈ میں اپنے ہاتھ خدیہ پشت پر باندھے گھوم رہا تھا۔

اور کلاڑے میں جب اللہ داد اپنی دکان داری اُجاڑ بیٹھا اور اس کی جیب خالی ہو گئی تو وہ لوگ جو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتے تھے وہ بھی غائب ہو گئے۔ اب وہ خالی دکان پر بیٹھا کھینچاں مارا کرتا اور ان لوگوں کے لیے ترسا کرتا۔ کبھی میٹھے میٹھے سے محسوس ہوتا جیسے کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

”اللہ داد تیرے لیے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈی ہے پر تین سو روپیے لگیں گے۔“

”تین سو روپے کی کیا بات ہے میاں تم بات چلاؤ۔“ وہ مڑ کر دیکھتا اور اپنی اکین آواز کی گونج سنتا۔ شادی کے بہانے لوگوں نے اس سے خوب روپیہ بٹور لیا تھا اور اسے دودھ کے کٹورے پر رُخا دیا تھا۔ مگر وہ قراب بھی دھو کا کھانے کو تیار تھا۔ مگر اب اس کی خالی جیب سے کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے دکان بند کی اور اپنا گلی اثاثہ درمی میں لپیٹ کر لاہور آ پہنچا۔ خوش قسمتی سے وہ ٹھیک اس دن لاہور پہنچا جس دن چودھری منگھو بیٹھی ممبر منتخب ہوا تھا۔ اور گلی کے جواں اسے کندھوں پر بٹلے بٹلے ہڑے ہڑے کے نعرے لگاتے گھر کی طرف لا رہے تھے۔ اور گلی کی ساری فضا چودھری زندہ باد اور مخالف ممبر کی مردہ باد سے گونج رہی تھی۔ درمی میں لیٹے اپنے گل اٹانے کو سر پر رکھے اللہ داد نے یہ سارا تماشا گلی میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ پھر جب شیخ جی کے گھر کے سامنے چودھری کو دستار بندی کے لیے کندھے سے اتارا گیا تو وہ دل میں اپنی بلاوری کے اس ہونہار سپوت پر صد آفریں کہتا گھر کے اندر اُبل ہو گیا۔

بے حد مضطرب مگر خوش خدیج نے اس کی آمد کو نیک غافل سمجھا۔ یوں بھی دل کی وہ اچھی تھی اس لیے فوراً ہی برادری کے اس اجٹے پچڑے بے یارو مددگار آدمی کو چاہا کہ خطب سے نواز دیا۔

یوں وہ یہاں آباد ہوا۔ ڈیوڈ سمی سے متعل ایک کمرہ اسے دے دیا گیا جس کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ اسی کمرے میں چودھری سے سو روپے ادھار لے کر اس نے پرچوں کی دکان کھول لی۔ اگلا حصہ دکان کا تھا اور پچھلے حصہ میں اس کی کھاٹ، بستر، چند المونیم کے برتن، ایک چھوٹا سا ٹین کا بکس رکھا تھا۔ اس کے آنے سے چودھری اور خدیج کو بڑا آرام ملا تھا۔ ایک طرف سودا سلف لانے، بچوں کو کھلانے بہلانے کا انتظام ہو گیا تھا۔ دوسری طرف چودھری کی مہیری کی تشہیر کا ذریعہ بن گیا تھا۔ چودھری سے بالا بالا وہ اس کی مہیری کا رعب محلے والوں پر آتا تا رہتا تھا۔ ہر بات شروع کرنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہتا :

”بھئی ہم تو حکومت کے آدمی ہوئے۔“ اور اسی رعب میں اس نے گلی اور گلی سے متصل کوئی پندرہ سولہ گز چوڑی اور بیس گز لمبی گراؤنڈ پتیضہ حوالہ جمار کھا تھا۔ گراؤنڈ کو موجودہ شکل بھی اسی نے دی تھی۔ پہلے یہاں وصول اثر تھی۔ اور گرجوں کی غلامت بھری رہتی تھی۔ ٹھنڈی دالے دیں لڑکے گیند بے پیڈ اور دستانے لیے وہاں آجاتے۔ ان کی گیندوں سے نہ راہ چلنے والوں کے سر محفوظ تھے نہ مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازے کے شیشے۔ کئی بار تو گیند اس کے پاس سے یوں دتا ٹٹنے سے گزرتی کہ وہ اپنی ناک ٹوٹتا رہ جاتا۔ بھرپور تاش

کیسے والوں کی منڈیاں بھی جتنی بھیتیں جو اپنی آواز میں گالم گلوچ کرتے،  
 بڑی بیوقوفی سے ہنستے تھے۔ مگر اب یہ سارے سلسلے بند ہو گئے تھے۔ اب  
 گراؤنڈ میں سبز خلیں گھاس کا فرش کچھ گیا تھا۔ پھولدار پورے لہلہانے  
 لگے تھے۔ اور موٹی باڑھ کے گرد نوکدار تار لگا دیئے گئے تھے۔ اب لوگ  
 گرمی کی شاموں میں اور سردی کی مدھپوں میں وہاں بیٹھے سولیاں اور سنگڑے  
 تک لگا کر کھاتے اور گنڈیریاں چوستے تھے۔ اب تو کرکٹ اور تاش کیلئے دالے  
 اللہ دال کے دشمن ہو گئے تھے وہ ان سے کئی بار نبرد آزما ہو چکا تھا۔  
 وہ کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے حقہ پی رہا ہوتا کہ کوئی لڑکا چپکے سے کان  
 میں آکر کہہ دیتا۔

وہ چاہا گراؤنڈ میں تاش ہو رہی ہے پر تم آج ادھر نہ ہی جاؤ تو اچھا  
 ہے صبور خان بہت غصے میں ہے۔“

آخری فقرہ محض اسے چیلنج کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ خاطر  
 خواہ نکلتا۔ اللہ داد فوراً اٹھ کھڑا ہوتا۔ اپنا کھیس کوڑا اور ٹوپی اتار کر کھاٹ  
 پر رکھ دیتا۔ پھر وہ بے قدم گراؤنڈ کی طرف بڑھتا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور  
 قد کی نسبت بازو بہت لمبے تھے چلنے میں وہ بول آگے پیچھے کی طرف جھرتے  
 کہ کبھی تو اس سے بہت آگے نکلتے نظر آتے اور کبھی بہت پیچھے رہتے  
 دکھائی دیتے۔

کرکے قدم سے خمیدہ ہو جانے سے اس کا قد باڑھ کی اونچائی کے برابر رہ  
 گیا تھا۔ یوں اندر بیٹھنے والوں کو وہ اس وقت تک دکھائی نہ دیتا جب تک وہ

بقی کے سے قدموں سے چلتا اسی کے سروں پر نہ جا پہنچتا۔  
 ”کیوں بے حکومت کے آدمیوں کے سامنے یہ کام کرتے ہو دس دس سال کے لیے اندھ کروادوں گا۔“

لڑکے بونے کو یوں آٹا آٹا سروں پر چھایا دیکھ کر گھبرا کر کھڑے ہو جاتے  
 امدعاً طور پر مزاحمت کی بجائے مصالحتہ رویہ اختیار کرتے۔

”پاچا پا صاف کر کھیل جا ہر اسے آدمہ گھنٹے بعد اٹھ جائیں گے۔“  
 ”اب بے حکومت کے آدمی کو جھانسنہ دیتے ہو۔“ اللہ داد جھپٹ کر پتے  
 ہاتھ میں دلیر لیتا۔

”جادو گھروں میں ماؤں کے پاس بیٹھ کر کھیلو وہاں کیا ڈر ہے۔“  
 اب کسی نہ کسی لڑکے کو طیش آ جاتا اور وہ لپک کر اللہ داد کے گریبان میں  
 ہاتھ ڈال دیتا۔

”آج تو حکومت کے آدمی کی ایسی کی قسمی ہی کر دوں گا۔“  
 ”ابے جا۔“ اللہ داد آگے کو گھٹنٹا سہا ہاتھ چلاتا۔ دو چار دھولیں کھلتا  
 کچھ ہاتھ مارتا بھی۔ پھر اس دوران وہ بندر کی طرح اس طرح چھٹتا چلاتا اندھ شہر  
 چھاتا کہ لڑکے بدحواس ہو کر اسے چھوڑ دیتے اور باڑھ پھلانگ کر باہر نکل جاتے۔  
 پھر اپنی اس کم ہمتی پر شتمل ہو کر خوب گالیاں دیتے۔

”خزیر کے بچے، کیسے کسی دن اپنے ہاتھ سے تیرا جنازہ اس گراؤنڈ میں  
 گاٹوں گا۔“

دوسرا کہتا۔ ”چند صری کا لحاظ ہے نہیں تو اختریاں ڈھیر کر دیتا۔“

تیسرا پھینکارتا۔ ” بڑھا خبیث مرتا بھی نہیں مجھے بھر کو آگے لگا رکھا ہے۔“  
چوتھا مذاق اڑاتا ” ابھی کیسے مرے ابھی تو یہ سُنہ کی اولاد دلسن ڈھونڈ  
رہا ہے۔“

پہلا پھر پیٹ کر جواب دیتا ” اس مردود کی دلسن اب موت بنے گی اور مردوں  
کا نکاح میں چڑھاؤں گائیں۔“

اللہ داد مگر یہ ہاتھ رکھے خاموشی سے یہ باتیں سنتا اور ناتواں مسخرے مسکراتا۔  
یہ مسکراہٹ لڑکوں کے لیے چیلنج کا اثر رکھتی وہ دانت میں پسینے میں کرگایاں دیتے۔  
” کل نئے تاش لے کر آئیں گے دیکھیں گے کون ہوکتا ہے ہمیں۔“

” تو تاش کیا لائے گا تیرے تیرا مکے تنہو بھی یہاں کاٹنے نہ دوں گا۔“  
اللہ داد مسکرا کر کہتا۔

” اے جانمخوس نہیں تو ابھی تیرا بڑھنق کر دوں گا۔“ لڑکا دور سے مڑاتا۔  
یہ تو سکار لڑکوں کے ٹل جانے سے ختم ہو جاتی۔ اللہ داد مالکانہ انداز سے گراؤنڈ  
کے دو چار چکر کاٹتا پھر اپنی کھاٹ پر اکریٹھ جاتا اور حقہ پیتے ہوئے خود بخود  
ہنستا رہتا۔ ” ابھی تو دد بیسی عمر ہوئی ہے ابھی کہاں مروں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے  
اونچی آمازمیں بڑبڑاتا۔ قریب لڑکوں کی ٹولی کھڑی سُن لیتی تو کوئی لڑکا چھیرنے  
کو کہہ دیتا۔

” چاہا قبول کرتا ہے تیری عمر دد بیسی نہیں ہو سکتی۔“  
” پھر کیا ہو سکتی ہے۔“ وہ حقے پر ہاتھ رکھے آنکھیں کھیر کر لڑکے کی  
طرف دیکھتا۔

”یہی کوئی چار بیسی ہوگی“

”کر لو بات“ وہ حقے پر جھک کر بے لفظی سے سر ملاتا۔

”میرا بھی خیال ہے چایا تمہاری عمر زیادہ نہ ہوگی ابھی تو تم بالکل جوان نظر

آتے ہو بس تم جلدی سے شادی کر لو تو سب کی زبانیں بند ہو جائیں۔“

اللہ داد بڑے انداز سے مسکراتا۔

”اسی وجہ سے تو وہاں سے بھاگا تھا۔ بیسیوں لوگ پیچھے پڑے تھے۔ کوئی گستا

دوسر۔ کوئی گستاخیں سو۔ کوئی گستاخانہ سو وہ شادی کر داریں۔ میں نے بھی خوب

پسند کیا۔ پر اتنی لڑکیوں سے کون بیاہ کرتا یہاں بھاگ آیا ہوں۔ پیچھے ڈھونڈتے

پھر رہے ہوں گے مجھے۔“

”پھر اب کیا ارادہ ہے چایا کوئی لڑکی وڑکی ڈھونڈی یا نہیں۔“

اللہ داد بے پردہی سے حقے پر جھکا حقہ گڑا گڑا مارا۔ پھر بغیر سر اٹھائے

کہتا۔ ”پیلو کی ماں سے کہہ رکھا ہے۔ وہ کوشش کر رہی ہے۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔“

”ہاں چایا کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا ابھی ایسی جلدی بھی کی ہے۔“ لڑکے

ہنسی سے بے تاب ہو کر ادھر ادھر بکھر جاتے اور وہ حقے پر ہاتھ رکھے اپنے

ڈھلکے پوٹے اٹھا کر انہیں پیچھے سے دیکھتا اور سوچتا۔ ان لڑکوں کے بیاہ

کب ہوں گے۔

حقے کے تقریباً سارے لڑکوں کا حساب لگا رکھا تھا اور جب کسی لڑکے کے

سانے سبز، سرخ جھنڈیاں لگنی شروع ہوتیں۔ تو اس کے پاؤں خود بخود زمین سے

اوپر اٹھ جاتے۔ اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے کندھوں پر بڑا بھاری

آئے ہیں اور وہ چڑیوں کی مانند ہکا پھیکا ہو گیا ہے۔ اس کی نگاہوں میں دوڑتا ہوا سر و خون بھی گرم ہو جاتا، اس کے چہرے کی تجھریاں دھکنے لگتیں۔ جب سے گراؤنڈ میں قاتلین لگانے سے پہلے لوگوں نے رسمی طہ پر اسے اطلاع دینی شروع کی تھی، تب سے اس کی اہمیت خمد اپنے آپ میں بڑھ گئی تھی۔

اس دن بڑا جاکڑا بڑا تھا۔ موسم بھی ابراؤد تھا۔ اور سہ پہر میں ہی شام کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

اللہ داد پرانے کوٹ پر موٹا کھیس لیٹے اور سر پر ادنیٰ ٹوپی پہنے دکان کے اندر چمکی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جسے تین تانگے آگے پیچھے کھڑکھڑاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے اور گھوم کر گراؤنڈ کی پرلی طرف چلے گئے۔ اللہ دانے چونک کر سر اٹھایا پھر ٹوہ لیٹنے کے لیے وہ گردن اونچی کر کے سامنے دیکھنے لگا۔ تینوں تانگے گراؤنڈ کی پرلی طرف کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔ امدان میں سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی سواریاں اتر رہی تھیں۔ اللہ داد آج دن بھر دکان سے باہر نہ نکلا تھا اور بغلوں میں ہاتھ دبائے بیٹھا اونگھتا رہا تھا۔ اب اسے حیرت سی ہوئی۔ اس مکان کے سامنے کافی چیل پیل سی نظر آ رہی تھی۔ مگر کچھ پیکسی پیکسی اور بے جان سی۔ مردوں کی دو تین ٹوئیاں مکان کے آس پاس کھڑی تھیں۔ چند بچوں نے ایک چھابڑی دلوے کو گھیر رکھا تھا۔ اور وہ اس سے بونگ پھلی ریوڑیاں اور شکر قندی خرید رہے تھے۔ چند عورتیں بچوں کو کولہوں پر دلوئے دبوانے میں اور چند یاہر نکل کھڑی تھیں۔ اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسری سے باتیں کرنے کے علاوہ خریداری میں بچوں کی لڑھنائی بھی کر رہی تھیں۔ اللہ داد



آنکھیں جھپکاتے ہوئے سامنے دیکھتا رہا۔ کچھ دنوں پہلے اس مکان میں نئے کرایے دار آکر رہے تھے۔ اور اس نے اس گھر سے صرف ایک سفید براق سی وارڈر لی اور پٹن والے آدمی کو نکلتے دیکھا تھا۔ وہ آدمی خالچ زدہ تھا۔ اور چند بار چوڑی کی چال چلتا اس کی دکان کے سامنے سے بھی گزرا تھا۔

’لوٹ کی کامیاب ہوگا‘۔ اللہ داد سوچتا ہوا کچھ بے چین سادکان سے باہر نکلا اور باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ایک سمت میں چکر لگایا پھر وہ گراؤنڈ کے اندر چلا گیا۔ گھاس مرسم سرسای کی وجہ سے بھوسلی ہو چکی تھی۔ نو عمر اونگے بونگے سے پردے بھی بے برگ کھڑے تھے۔ اللہ داد نے پاؤں سے ردھڑھوں کو اِدھر اُدھر لٹکایا پھر کچھ ٹوٹی ہوئی کانٹے مارٹینیوں کو اٹھا کر باڑ کے پاس پھینکا دیا۔ پھر وہ گراؤنڈ سے باہر نکل آیا۔ اچانک عورتوں اور بچوں کی میٹر کی ہیر آئی اور پرانی طرف نکل گئی۔

پھر ایک آدمی بڑا سادہ لپٹا اٹھا نئے گھر کے اندر چلا گیا۔ اللہ داد شک کر سامنے دیکھتا رہ گیا۔

اس دیکھے میں لاپٹھیوں اور موٹی تہ دار ملائی والی میٹھی چائے کیے گی۔ اور خستہ باقر خانبوں کے ساتھ پی جلے گی۔ اس نے گھر کے اندر عورتوں بچوں کے ہجوم انسان کے خروش کن شور کو اپنے تصور میں دیکھا اور سنا۔ پھر اس نے اس گرنی کو محسوس کیا جو انگلیشیوں میں دہکتے کوئلے پیدا کر رہے ہوں گے۔ پھر اس نے ہندی اور گوتے کی خوشبو کو سونگھا۔ پھر اس نے ان عورتوں کے متعلق سوچا جو چھوڑے گدگد سے بچوں کو گرم کپڑوں میں پیٹتے ایک دوسرے میں گھسی میٹھی گپتیاں اُٹا رہی

ہوں گی۔ اچانک ڈھونک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اس  
 ہو گئی۔ اس نے سردی سے کپکپاتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ اس بھری پری کائنات  
 میں بے حد اکیلا اور تنہا ہے۔ مگر دوسرے لمحے اس نے اپنی اداسی کو جھٹک دیا۔  
 اور سردی رونق اور گرما گرمی کو اپنے اندر محسوس کیا۔ ساری بات تو روح کے اندر  
 کی تھی۔ اتنے میں پیلو باہر نکل آیا اور بولا: ”چاچا سردی میں کیا کر رہے ہو؟“  
 اللہ داد نے چپک کر اسے کندھوں پر بٹھایا۔ پیلو نے بھی چپل پہل کر  
 محسوس کیا اور بولا۔

”چاچا وہ کیا؟“

”بیابان۔“ اللہ داد نے سرگوشی کی۔

”اور تمہاری چلم کے لیے بڑے بڑے سرخ انگارے۔“ دونوں ہنس  
 پڑے باڑھ کے ساتھ اس نے پیلو کو دو تین پکر دیئے پھر جب اس کی سانس  
 پھول گئی تو پیلو کو نیچے اتار دیا اور بولا۔

”تم یہیں کھڑے رہنا ابھی کوئی قاتل کو پوچھنے آئے گا میں کپڑے بدل  
 کر آیا۔“

وہ دکان کے اندر گیا اور دو روٹہ بھیر لیا۔ جب وہ دوبارہ باہر آیا تو پیلو  
 نے بغور اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اچلے پڑوں پر وہی پرانا کٹا اور کھسکتا۔  
 ”چاچا تیرا بیابان کب ہو گا؟“ پیلو نے معصومیت سے پوچھا۔

اللہ داد ہنس پڑا ”اپنی ماں سے کہو تا تو راجلدی کام بنادے۔“

”اچھا چاچا۔“ پیلو نے اثبات میں زور سے سر ہلایا۔

سات کا اندھیرا تیزی سے اترتا آ رہا تھا۔ اور گھر کے سامنے ابھی تک روشنی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا نہ ہی کوئی دوسرا سامان دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ مکان سے باہر مردوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔

معاذ اللہ داد کو جھگی کیلر کے گھنے اور پھیلے ہوئے درخت کی اوٹ میں ٹرک کی باڈی دکھائی دے گئی۔ ”اچھا تو سامان ٹرک میں آیا ہے۔ پھر تو ابھی ساری تیار ہو جائے گی۔ قتاہیں، کرسیاں، میزیں سب کچھ لگ جائیں گی اور روشنی بھی ہو جائے گی۔“ اس نے پُرسرت اضطراب سے سیلو کے ایک وصول لگاؤ۔ ”سُن دینا، جب تیرا بیاہ ہو گا تو اس گراؤنڈ میں تیرے بیاہ کی قتاہیں میں لگائے گا۔“ اسی پر ابھی میں بازو دھونے لگا۔ اور گھوڑی پر بھی میں ہی تجھے بٹھاؤں گا، ستا تم نے؟“

پیلو اللہ داد کی اس قیاسی پر جمینپ گیا پھر احسان چکانے کی خاطر ہلا۔

”چاچا جب میں دولہا بنوں گا تو اپنا شہ بالا تجھے بناؤں گا کیوں چاچا؟“

”ہاں... اللہ داد نے قہقہہ لگایا ایک اور بچانے نکلا اور جوان قہقہہ جس کی آواز بلاشبہ گراؤنڈ کی دوسری طرف سنی جاسکتی تھی۔ مگر ادھر ہلکا ہلکا شہرا پھر رہا تھا۔ اور جب اللہ داد نے قہقہہ لگا کر سامنے دیکھا تو اس کا منہ کھلا دہ گیا اس نے ایک ایسی چیز دیکھی جسے وہ سنائے میں دیکھتا رہ گیا ٹرک اب گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ خالی تھا بالکل خالی۔ اور گھر کے دروازے میں سے کوئی چیز بہت سے سروں کے درمیان نہایت خاموشی سے باہر لائی جا رہی تھی۔

شام کا دھند لگا اور سات کی تاریکی گئے مل رہے تھے۔ اور دھندلے کی وجہ سے واضح طور پر کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

”چاچا کیا ہوا۔“ پلور اس کے اچانک خاموشی ہونے پر حیرت سے بولا،  
 پھر وہ بھی اسی سمت دیکھنے لگا۔

”ٹرک“ وہ اس کی توجہ کا سراغ لگا کر خوشی سے بولا اور اپنی انگلی اسی  
 سمت میں اٹھا دی۔ مگر اللہ داد خاموش رہا۔ ادب بچک جھپکے آنکھیں پھاڑے  
 اُدھر دیکھتا رہا۔ بہت سے سردوں کے درمیان وہ چیز ٹرک کی جانب ریگ  
 مری تھی تب اسی لمحے اس نے اس تاریک خاموشی میں سے ایک وحشت ناک  
 چیخ کو ابھرتے سنا، ایک آدمی گیس لیپ کو لیے جمع میں شامل ہو گیا تھا۔ اور  
 اس کی زبردروشنی میں آنکے کو متحرک چہرے پر ہراسہ اور ہیبت ناک دکھائی دے  
 رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ وہ آواز تھی، ٹھنک سے چور لہنتی آواز جس میں  
 ساری کائنات کا دکھ مشاہد تھا جو شاید جیتے دنوں کی خوشیوں پر فوج خواں تھی۔  
 جو راضی کی آواز تھی اور جس کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ جو ہر ساریس کے ساتھ کی  
 جدائی کے غم سے کانپ رہی تھی۔ جو زانو پٹی تھی نہ پٹی تھی جو ایک ہی کمرہ دار  
 لڑناں سر میں گلے سے نکل تھی، اور ٹوٹ گئی تھی۔ ایکلی اور تنہا آواز جیسے کوئی  
 موت خود اپنی موت پر رونے ہو۔

اللہ داد نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اس کا سر جھک گیا۔  
 اس وقت اس نے محسوس کیا جیسے اس کا وہ بے فکر اور ادنیٰ تعلقہ خلا میں  
 معلق ہو گیا ہے اور وہ اس کی روح کو پامال کر دینے والی بے سُرک آواز کو اب  
 اور اس کے بہت بعد بھی سن سکتا ہے۔

”ماہِ نو“ (کراچی)

## ڈیپٹی کمشنر

انہوں نے یہ تمام سفر ایک تقریبی رنگ والے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں طے کیا تھا۔ اس طرح وہ سفر کی تمام دقتوں سے بچ گئے تھے۔ بھاری سامان تو خیر ٹرک کر دیا گیا تھا۔ البتہ ایک ہولڈال، ایک سوٹ کیس جس میں کچھ کپڑے اور زیورات وغیرہ تھے۔ ایک ٹفن باسکٹ اور ایک ٹوکری جس میں مختلف قسم کے پھل وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس ہی رکھ لیے تھے۔ ہولڈال نے مسعود جمال کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ وہ جب بھی سفر کی طوالت سے گھبرا جاتا اور زحمت کی باتیں بھی ختم ہو جاتیں تو وہ دھیرے سے اٹھتا اور ہولڈال میں ٹھس جاتا۔ گھستے ہی بچانے اس کے ذہن پر کیسا جادو سا چھا جاتا کہ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں۔ پوٹے خیند کے بوجھ سے بھاری ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ خوابوں کی طسائی واوی میں نکل جاتا۔ زحمت کو تو کبھی سفر کے دوران نیند آتی ہی نہ تھی۔ چنانچہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سوٹ کیس کھول کر دیکھ لیتی۔ پھر پھولوں کو ٹوکری میں سے کوئی گلداسا اور ڈنکال کرا سے گھری کی مانند کترنے لگتی۔ اور ٹفن باسکٹ کے استعمال کی جگہ سے سفر میں نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ چونکہ ان دونوں کو سفر میں بھوک کم ہی لگتی تھی۔ بھاری سامان جو ٹرک کر دیا گیا تھا:

بڑے بڑے بھاری ٹرکوں اور ایک کڑی کی بڑی سٹی پر مشتمل تھا۔ ان ٹرکوں میں سے آدھے ٹرک کتابوں اور تصویروں سے پر تھے۔ بقیہ ٹرکوں میں گرم کپڑے، لحاف اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تھیں۔ کڑی کی سٹی میں پانچ نو بند تھا۔ اس قدر کتابیں اور تصویریں مسعود جمال نے بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔ اس کی آدھی تنخواہ اسی پر خرچ ہوتی تھی۔ اسے کتابیں اور تصویریں جمع کرنے کا جنون تھا۔ وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور ہر قسم کی تصویریں جمع کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی کتابوں کے ذخیرے میں سینفوکے مجموعوں اور ارسطو کے مقالات سے لے کر ہر قسم کے کوک شاسٹر تک شامل تھے اور اگر تصویروں کے انبار میں مائیکل اینجلو کے شاہکاروں سے لے کر گھٹیا قسم کے امریکن رسالوں کی اشتہاری تصویریں تک بل سکتی تھیں، تو یوں بھی ہوا تھا۔ مائیکل اینجلو کی بنائی ہوئی ایک شائع شدہ تصویر حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی پوری تنخواہ خرچ کرنا پڑی تھی۔

وہ بہادر لڑکھو کر میرٹھ کے لیے اپنے پیچھے بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ یہاں ہوتے وقت مسعود جمال نے حسبِ عادت اپنے سرکاری چپڑاسی کو بہت سا انعام دیا تھا۔ اور اس کے لیے آئے ہوئے معزز میزبان اور سرکاری افسران سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ معاقد کیا تھا۔ جب اس سال سے ڈھیر سارے حلے اور انبار خریدے گئے تھے۔ اور پھر گاڑی چلنے پر وہ ریٹنگ کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا اپنا سفید رومال ہلاتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب بہادر لنگر کا زردانیٹوں والا ٹیشی بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور پیٹ فارم پر پڑتے ہوئے انوار می ہاتھ اندھلا رہا تو اسے رنگ برنگے رومال بھی دکھائی دیئے بند ہو گئے۔ تب بھی وہ

کیڈٹنٹ کے دروازے میں کھڑا اپنا ر حال ٹھہراتا رہا۔ لہذا تاربا۔ اور آخر تک ہار کر واپس اپنی بوتھ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے سانورے ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس کے چہرے کی تشنگی اور چمک دمک میں اضافہ ہو گیا۔ اور پھر ہنستی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیوی نہرت کے شعلہ و شبنم آسا چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو کھڑے ہوئے پھول کی مانند اس اور اس دکھائی پڑ رہا تھا۔ ”یہ میرے خوابوں کا چہرہ غمزہ سا کیوں ہے؟“ یہ پوچھنے کے لیے وہ لبوں کو جنبش دینے ہی والا تھا کہ نہرت بول پڑی۔

”یہ تم اتنے رسالے اور اخبار بھلا کیوں خرید لائے؟“

”چونکہ میں ان کو خریدنا چاہتا تھا۔“

”سفر بہت لمبا ہے؟“

”ہوں۔“

”کیسے کسے گا؟“

”میں تو اتنا طویل سفر میں اسی خوشی میں کاٹ لوں گا کہ کل آنے والی صبح تک میں اس ضلع سے بہت دور نکل چکا ہوں گا۔ اور کل کا سو رنج جیسے اس ضلع کے فضول اور ذیل قسم کے لوگوں میں اُلجھا ہوا نہیں پائے گا۔ نہرت نے کوئی جواب دیا۔ اور وہ اٹھ کر باقاعدہ درم میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے ایک مسکراہٹ مل گئی۔ اور دوبارہ کیڈٹنٹ کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ کبھی کبھی مڑ کر نہرت کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مسرت آگین مسکراہٹ بکھر کر جاتی تھی۔

اور جب ان کی ریل نے دریائے ستلج کا قریب آہنی پل عبور کیا اور دھڑ دھڑاتی ہوئی پنجاب کی سرحدوں میں داخل ہوئی۔ تو نہ ہمت کے ذریعہ کو کیبلنگ جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے مدینہ کے پکٹے شعلے یکدم جنت کی فرحت بیز ہوائوں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ لیکن اسے یہ فرحت بیز ہوائیں اچھی نہ معلوم دیں۔ جب دل شعلوں میں جلتے جلتے ایک انجانی سی لذت محسوس کرنے لگے۔ اور پھر اس سے وہ لذت چھین لی جائے تو بڑی ناخوشگوار سی احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ احساس نہ تو فرحت بیز ہوائوں سے ختم ہو سکتا ہے اور نہ شاداب جھونکوں سے۔ یہ ہوائیں یہ جھونکے اس احساس کو اور زیادہ بھر پور کرتے ہیں، اور ان ہوائوں، ان جھونکوں کو ٹھکرا کر دل اپنی انہیں دوزخوں میں جلتا چاہتا ہے۔ جن کے شعلوں نے اسے وہ انجانی سی، اجنبی سی لذت بخشی تھی!

مسعود جمال، ہولڈال میں گھسائیندے گھوڑے میں جھول رہا تھا۔ نہ ہمت نے اپنا سترے رنگوں والا چہرہ سیٹ کے ساتھ والی کھڑکی سے باہر نکال کر دیکھا تو اکتوبر کے نیلے کانچے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ دودھ تک کھیتوں میں ہرے خندیں قالین بچے ہوئے تھے۔ پل عبور کرنے سے پہلے وہ جو کبھی کبھی ریت کے ٹیلوں کا دودھ تک چلا گیا سلسلہ دکھلائی پڑ جاتا تھا۔ وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ گر وہ غبار دب گیا تھا۔

قواب ریت کے ٹیلے کبھی دکھلائی نہ پڑیں گے۔ اب گر وہ غبار حیر سے پر کبھی ریت کی تینیں نہ جھائے گا۔ اب وہ صحراؤں سے اٹھنے والی آندھیوں کے



ناچتے ہوئے جگولوں کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے بے حد اس ہو کر سوچا اور پھر  
 مگر ٹکی بند کر کے مسعود جمل کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بچوں کے ایسے معصوم  
 چہرے پر غمزدگی کے پراسرار سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے خوبصورت گھونگروالے  
 بال ابھی تک گھنے تھے۔ اس کے چہرے پر ابھی تک جوانی کی چمک باقی تھی۔ اس کی  
 سنو لائٹ میں ابھی تک سرخی کی لہریں گردشیں لے رہی تھیں۔ اس کی گردن دیکھ  
 کر اب بھی خیر نور ڈامیوالی کی نازک نازک صراحیوں یاد آ جاتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ  
 اس جیسے تھا کہ اس کے پودے وجود کے خطوط اور نقوش بے حد باقاعدہ انداز میں  
 تھے۔ جیسے ان خطوط اور نقوش کی تراش خراش میں اللہ میاں نے خاص احتیاط برتی  
 ہو۔ اس کی ہلکی اور خوبصورت سیاہ آنکھیں دیکھ کر خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہوتا  
 تھا۔ جیسے وہ ایک غنائی شاعر ہے۔ جو شعر و نغمہ کے شاداب راستے سے بھٹک  
 کر ہی۔ ایس۔ پی کی بنجر دایوں میں نکل آیا ہے۔ جب نزہت کی اُس سے سنگینی ہوئی  
 تھی۔ تو وہ سی۔ ایس۔ پی کا امتحان پاس کرنے کے بعد کسی دُور افتادہ ضلع میں ٹریننگ  
 کا عرصہ گزار رہا تھا۔ لیکن جب بھی نزہت کی سہیلیاں اس کے بارے میں کچھ دریافت  
 کرتیں۔ تو وہ خیر سے یہ بتانے کی بجائے کہ اس کا منگیترا ایک سی۔ ایس۔ پی انفر  
 ہے۔ ہوئے سے سرگوشی کے انداز میں کہا کرتی۔ ”اس کی شکل تو بالکل شیکہ ایسی  
 ہے۔“ اس کے اس جواب پر اس کی کوئی چنچل سیلی جب اوبہ اگر خیلے کا کوئی شعر  
 پڑھ دیتی تو اس کے چہرے پر گلاب کی کچی پتلیوں کی رنگت پھیل جاتی۔ اور اس کا پورا  
 وجود خیلے کی کسی خواب آلود نظم میں ڈھل جاتا۔

اس کے دیکھتے دیکھتے مسعود جمل نے ہوئے سے اپنی پلکوں کے پردے

انٹھا دیئے۔ ان پردوں کے عقب میں روشن چراغ غریباں ہو گئے۔ اور اس کے ہونٹوں کو اسی گہری مسکراہٹ نے ڈھانپ لیا۔ اور اس نے خواب ناک آواز میں زہرت سے کہا۔

”منگھری ابھی کافی دوسرے ہے۔“

”ہوں۔“

”تم رات بھر جاگتی رہی ہو؟“

”ہوں۔“

”کیوں؟“ اس کی سرٹل سرٹل آنکھیں پھیل گئیں۔

”بہادر لنگر یاد آ رہا ہے۔“

”ہشت۔ اس وقت اس منحوس ضلع کا ذکر نہ کرو۔“

”کیوں۔“ کیا اس لیے کہ ”بہت جابر ہو کر ترے کو چے سے ہم نکلے؟“

”اس میں بے ابروئی کی کیا بات ہے۔ کشن بھی پاگل ہے اور لوگ بھی پاگل

ہیں۔“

زہرت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسعود جمال ہولڈال سے یاہر نکل آیا۔ گاڑی چھکاچھک اپنی منزل کی طرف

بڑھتی رہی۔ سو بج کی چمک تیز ہوتی گئی۔ دھوپ کی کرنیں کیشی ہوتی گئیں۔

”ہم دس بج کر بیس منٹ پر منگھری پہنچ جائیں گے۔ پہلے سید سے ڈی۔ سی

ہاؤس جائیں گے۔ وہاں نہائیں گے، دھوئیں گے۔ میں آفس جا کر چار بجے

لوں گا۔ اس کے بعد تمہارے اسی بات کو اہل جائیں گے اور پھر ذرا شا پیگ کے لیے ملیں گے۔ بہت عرصے کے بعد شرمین شا پیگ کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ وہ ذرا رسالہ دینا مجھے۔“

اس نے رسالہ دے دیا۔ ”تم بھی لے لو کوئی رسالہ۔“

”نہیں۔“

”تھک گئی ہو؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں۔“

”یکے پہنچنے کی خوشی ہے؟“

جواب میں ذہنت نے ایک ہلکا سا تھقہ دگایا۔ مسعود جمال نے رسالہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کتابوں اور دوسرے قسم کے اشتہارات تک پڑھ رہا تھا۔ ذہنت جان رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ اتنا کہ اپنی خوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ یہی رسلے وہ بہاول نگر میں بھی پڑھتا تھا۔ لیکن مسرت کی وہ روشنی جو خط مطالعہ کی کوکھ سے بھجھتی ہے۔ اس کے چہرے پر کبھی نہ بکھری تھی۔ بلکہ بہاول نگر کے قیام کے دوران تو وہ ایک حد تک مطالعے ہی سے گریز ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے وہ رسلے کا ایک ایک لفظ پڑھنا چاہ رہا تھا۔ اور اس کی حالت اس بچے کی مانند ہو رہی تھی جو اپنے نئے کھلونوں کی ایک ایک کل سے چند لمحوں میں ہی واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

گاڑی ملتان کے ایشیائی کو دو گھنٹے ہوئے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اب وہ منظر کشی کے گرد و فراخ میں داخل ہو رہے تھے۔ مثیال اینٹوں والے چھوٹے چھوٹے

گھر ناپتے ہوئے نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ منگمری شہر کی فراحی آبادی شروع ہو چکی تھی شہر کے کارخانوں کی اونچی اونچی چیمنیوں میں سے بل کھا کر نکلتا ہوا کشیف و دھواں اب فضا میں اٹھتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مہا بھاری ہو گئی تھی ساس میں شہر کی مختلف اقسام کی بد بوئیں گھل مل گئی تھیں۔ نہ بہت نے گھبرا کر نلک کر دھال سے ڈھانپ دیا۔ مسعود جمال نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور کڑکی میں سے سر نکال کر باہر جھانکنے لگا۔

”بس اب پانچ منٹ تک ہم پہنچ جائیں گے!“

اس نے اپنا ٹیلیٹ سر پر نکالیا۔ بیک میں سے نفس باسکٹ اور پیلوں کی ٹوکری نکال کر برقعہ پر رکھ دی۔ ہوٹل ال کو تھک کے باندھ دیا۔ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے نہ بہت کو دیکھنے لگا۔ اور اس کے متناسب ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے۔ اب شہر کے ہنگامے کی جلی جلی آوازیں بھی سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں۔ پھر سے دالوں کی آوازیں، قلیوں کے لڑنے جھگڑنے اور جھیتا جھپٹ کے مناظر، پیٹ فام پر چھجے دار ٹوپیاں پہن کر ٹہلنے والے ریوے سے غصہ مٹاشی کے جھگڑے پرل طرف تاگلوں کی قطاریں، اب سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ تھا، شور تھا، جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو، ایک جھٹکا سا لگا۔ انجن ایک طویل سسکادی سے گڑگڑا گیا۔

”منگمری۔“ مسعود جمال نے کہا اور پھر دھماکے میں اٹک کر پیٹ فام پر کھڑے ہوئے ان معززین شہر اور ضلع افسروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا، جو اس کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے، اور پیٹ فام پر ادب سے صف

باندھے کھڑے تھے۔ وہ معزز بی شہر اور ضلعی افسروں کے مہلوں میں ٹیٹیشن کی عمارت کی حدود سے باہر نکل آئے۔ مسعود جمال نے ایک لمبے کے لیے رگ کر طمانیت کا ایک گہرا سانس لیا۔

”شکر ہے“ اس نے کہا۔ نہ رست نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعاً خوفناک حد تک پُر سکون نظر آ رہا تھا۔ سامنے سڑک پر ایک پادشاہی عجمی ہوئی تھی۔ اس شہر و غوغا کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد چیرتی ہوئی ٹریفک سپاہی کی سیٹیاں نہ رست کے کانوں کے پورے پینڈے سے دے رہی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک آرام دہ کار میں بیٹھے ڈی۔ سی۔ اؤس کی طرف جا رہے تھے ”شکر ہے، اجاڑ جنگلوں سے نکل کر ایک بستی دنیا میں تو پہنچے۔ بڑے سڑے کے بعد ایک شہر کی خوشبو سونگھی ہے“ مسعود جمال نے بیڈٹ کی ٹیسٹ پر بڑے اطمینان سے سر ہلکا کر کہا۔ شام بھر ہی تھی۔ شہر کے ہنگامے جاگ رہے تھے، بازاروں میں کھوٹے سے کھوٹا چھل رہا تھا۔ دکانوں پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔

لوڑ بادی نہر کا پُل عبور کرنے کے بعد مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے وہ ڈی۔ سی۔ اؤس پہنچ گئے۔ اردلی نے ان کا سامان کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی مسعود جمال قبا تھوڑا دم میں گھس گیا اور نہ رست نے ایک آرام کرسی میں جنس کر آنکھیں میچ لیں۔ ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کے پوٹے اس قدر بھاری ہو گئے تھے کہ بول لگتا تھا، جیسے ان پر سیروں بوجھ لا دیا گیا ہو۔ اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور خیالات میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر بعد مسعود جمال نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد باقاعدہ دم سے نکل آیا۔ وہ اب پہلے سے

کیس زیادہ مطمئن معلوم ہو رہا تھا۔

”میں آفس جا رہا ہوں۔ تم یہ سامان کھول لو اور نہا دھو لو۔ تم شام کی چائے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ مجھے شاید دیر ہو جائے۔ ابھی رات کے کھانے کے بعد شاپنگ کرنے ضرور جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے!“

”سولانگ، ڈولنگ!“

اور وہ چلا گیا!

اس کے جانے کے بعد وہ آہستہ سے اٹھی۔ گھنٹی بج کر اردلی کو بلایا اور ایک ٹرمک، ایک سوٹ کیس اور دو تین ٹوکر یوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

”انہیں لے جاؤ اور باہر برآمدے میں رکھ دو۔ یہیں جاتے ہوئے لے جاؤں گی۔ اور سنو میرے کہے بغیر شام کی چائے لے آنا۔“

”بہت اچھا۔“

یہ کھلائے ہوئے اردلی نے سامان اٹھالیا۔ اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

نزدہت کی غزالہ آنکھوں سے چند آنسو ٹپکے اور بڑی خاموشی کے ساتھ سڑخ رُخساروں پر ڈھلک گئے۔ شاید یہ آنسو ایک دھار سے کی مانند پھوٹ بہتے، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ رومال سے نم آنسو دھپکوں کو خشک کیا۔ اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر پھر آرام کر سی میں دھنس گئی۔ اسے اس وقت مکمل سکون کی ضرورت تھی۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ چلا گیا تھا۔ اب سوچنے کے لیے اس کے پاس کافی وقت تھا۔ اب وہ معاملات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فکر کر سکتی تھی۔

اب اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا تھا۔ جو کئی دنوں سے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پردہ کش پڑا تھا۔ اب وہ تمام تلخ باتیں مسعود جمال کے سامنے اگل دینا چاہتی تھی۔ جو بہت دنوں سے اس کے دل و دماغ میں پس گھول رہی تھیں۔ اب اس نے ہر کی تلخی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ اس کڑواہٹ کو ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کڑواہٹ میں اپنے وجود کو گھلاتے رہنے سے جہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا پایا جائے۔ چھٹکارا جو عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔ وہ ایک عرصے سے یہ سب کچھ مسعود جمال سے کہہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ان زہر بھرے الفاظ کو آپ ہی آپ کئی بار دہرایا تھا۔ لیکن ان کو کہنے کے خیال سے اس کا دل ڈوبنے سا لگتا تھا۔ نیچے، نیچے، اتھاہ گہرائیوں میں۔ اگر یہ سب کچھ اس سے کہہ دیا گیا، تو وہ کیا کہے گا۔ وہ، جو اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اہ جب وہ محبت کے میٹھے رس میں زہر کی بوندیں چمکتے دیکھے گا تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔

”نہیں، نہیں“ وہ گرمی میں دھنسنے دھنسنے چلا اٹھی۔ وہ ایک انجانے سے خوف سے یوں کھپنے لگی، جیسے کسی جھیل کی سیال، مرقعش سطح پر چاند کا عکس لاپتہ ہو۔ اہ اس خوف کی لہروں پر بہتی ہوئی وہ بہا دل ٹکرا لے جنگلے میں چلی گئی۔ جنگلے، جس کے عشق چمپاں کی بیلوں میں پلٹے ہوئے صند و روانے کے باہر ایک سپاہی راجا تھا۔ جس کے محرابی دریاہوں پر صحرائی پھروں کی شرابی شرابی، لمبائی لمبائی بیلوں نے گھونٹ کاٹھ رکھے تھے۔ جس کے اونچے اونچے قد آدم و رازوں پر کھٹے ہوئے ہلکے گلابی پردے، صحرائی کوکھ سے صاف

کر آنے والی آہستہ خرام ہوا میں ہو لے ہو لے ہلکے رے کھایا کرتے تھے جس کے سامنے واسے لان میں ٹکاب کی کچی کھیاں دیا قی دوشیزاؤں کی طرح اٹھلایا کرتی تھیں۔ اور جس کے عقب سے گزرنے والی سڑک پر سے کوئی مسیحا شہر سوار ترنگ میں اگر کوئی گیت لاتا پتا ہوا گزرجایا کرتا تھا۔ گیت جس میں معصوم دیدت کا لڑکھ بڑھتا تھا۔ جس میں صمرا کی گھمبیرتا اور تیش ہوتی تھی۔ جس میں میٹھے پانیوں والی نروں کا ہوا ہوتا تھا۔ اور جس کے ایسے بول ایک تیش آلودہ ٹھنڈک بن کر بیٹھنے میں اتر اتر جلتے تھے۔

”پہل دکنے آئے سے رانجھنا سوار پئے جوڑی

پہل سانولے سے سے رانجھنا مان بہن توں چوڑی“

”پہل تینوں لے دیاں گائی گھدیے ....!“

اور پھر وہ جنگل کے شفاف برآمدے میں آکر مسعود جمال کی راہ ٹکنے لگتی۔ یہ

اس کے دفتر سے واپس آنے کا وقت ہوتا تھا اور وہ اس احساس طمانیت سے آنکھیں موند لیتی کہ مسعود جمال جب آئے گا، تو اپنے کو ایک پُر سکون دنیا میں پائے گا۔ اس کی نکاح اتر جائے گی۔ اس کی زبان جو مقدمات کے فیصلے اور انتظامی احکامات صادر کرتے سڑکھ چکی ہوگی۔ اس کو بیل ٹھنڈے ٹھنڈے برآمدے میں داخل ہوتے ہی اپنی نوک پر ایک خواباک پُر سکون اور میٹھی موسیقی کا ذائقہ محسوس کرے گی، اس کے کان جو فریقین کے بیانات اور شکایات سنتے سنتے پک چکے ہوں گے۔ یہاں اگر اس کی ترنم ریز باتیں سنیں گے۔ پھر وہ مسکرا اٹھے گا۔ اس کا روحانی شاعروں ایسا معصوم چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔ اس کی باہیں خود بخود پھیل جائیں گی۔



اور وہ خود بخود اس کی گرم آغوش میں سمٹ جائے گی۔ برآمدے کے پرلی طرف پھولوں پر پانی چھڑکتا ہوا بڑھا مانی دُور دیدہ نظروں سے ان کو دیکھے گا۔ اس کے سوکھے ہونے پر اسے ہونٹوں پر ایک شفیق مسکراہٹ بکھری جائے گی اور پھر وہ باہروں میں باہیں ڈالے طویل برآمدے کے تم آلود ستلے میں سے سایوں کی طرح گزرتے ہوئے گلابی پردوں والے ڈرائینگ روم میں چلے جائیں گے۔ مسعود جمال حسب معمول بند کرے گا کہ کھانا ڈرائنگ روم میں ہی کھایا جائے۔ لیکن وہ اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ڈرائینگ روم میں لے جائے گی۔ وہاں کھانا کھاتے کے وہ ادب، آرٹ اور موسیقی پر گفتگو کرے گا۔ چھٹی لے کر جنوبی فرانس کے نیلے ساحلوں کی سیر کرنے کا پروگرام بنائے گا۔ کھانا ختم کہے اس کے گندوائے ہوئے بازو پر ایک بھر پور چٹکی بھرے گا۔ ملازم یہ دیکھ کر صافے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگے گا۔ پھر وہ اس ڈرائینگ روم میں آجائیں گے۔ وہ پایا پر کسی ایسی گیت کی دھن چھیڑ دے گا۔ اور وہ اپنی متنازع جیس پر سروں کی ماہر تاجی کرین بھرائے موسیقی کے تاج محل میں کھو جائے گی۔

نہت کو اپنے گھر پر فخر تھا، غرور تھا۔ اگرچہ ایک ایک دو دو سال کے وقفے کے بعد مسعود جمال کی مختلف ضلعوں میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ انھیں ضلع در ضلع ایک اعتبار سے بھگتا پڑتا تھا۔ لیکن ہر جگہ نہت اپنے گھر کو پُر سکون، خوبصورت اور آرام دہ بنا لیتی تھی۔ گھر کی سجاوٹ کے لیے وہ نئے نئے طریقے سوچتی۔ اس نے ایک آرٹسٹ کا ذہن پایا تھا۔ اس کے گھر میں کسی کیوبک تصویر کے خطوط کی ایسی ترتیب اور شفیق رنگوں کا حسین متناسب امتزاج، سمجھتا ہی

اور سکون ہوتا تھا۔

مسعود جمال کی سانگھڑ سے ضلع بہاول نگر کی ٹرانسفر ہوئی تھی۔ تو کئی دوستوں اور ملنے والوں نے زور دیا تھا کہ ٹرانسفر کرانے کی کوشش کرو۔ لیکن نہ ہمت نے ان سب لوگوں کی زیر دست مخالفت کی تھی۔ اس کا کتنا تھا کہ سرکاری ملازم اور جگہ میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ جو اگر اپنی سیلان فطرت سے مجبور ہو کر کسی ایک جگہ ہمیشہ کے لیے ڈیرے نہیں ڈالتا۔ اور سرکاری ملازم اس لیے ہمیشہ کے لیے ایک مقام پر یقیناً نہیں رہ سکتا کہ حکومت اسے چند شرائط کے تحت ملازم رکھتی ہے اور ملک کے کسی بھی گوشے میں ٹرانسفر کرنے کی شرط ان میں سے ایک بنیادی شرط ہے۔ آج یا کل سرکاری ملازم کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کرنی ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ٹرانسفر کرانے کی کوشش حماقت ہے۔ دوستوں اور ملنے والوں کی بدائی کچھ عرصے تک مشاق گزرے گی۔ پھر نیا ماحول اور نئے لوگ اپنے میں جذب کر لیں گے۔ اور یہ وہ بہاول نگر آگئے تھے۔

بہاول نگر ایک مفدا فائدہ اور پراسرار ماضی تھا۔ اس کی سرحدیں ہندوستان کی ریاست بیکانیر سے ملتی تھیں اور یہ سلیمان کی ہیڈ وہ کس سے لے کر صحرائے مروت کے آخری گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ستلج دیہی پراجیکٹ کے تحت اگرچہ اس ضلع کا غالب حصہ زرعی کاشت کے قابل بن گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں ریت کے اونچے اونچے ٹیلے، میلوں تک پھیلے ہوئے چٹیل اور بخر میداں، سرکنڈوں کے گھنے جنگل، سرکیں بنا کر اپنا پیٹ پالنے والے خانہ بدوش، لمبی لمبی ایالوں والے گھوڑوں پر چڑھ کر

ڈاکے ڈالنے والے سب سے پہلے لیکن ریلر ڈاکو تیز رفتار ٹھاجیوں پر میلوں کا صحرائی سفر طے کرنے والے "لاٹری" اب بھی اس دور کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ جب یہ ضلع لق و لوق ریتے صحرا کا حصہ تھا۔ جنوب کی طرف اس ضلع کا آخری قصبہ فوٹ ڈاکو تھا۔ یہ قصبہ ریت کے مہیب ٹیلوں کے درمیان آباد تھا۔ اس کے چاروں طرف چار چار میل تک ریت کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کے بعد شاداب کھیتوں اور ہفتے بستے گاؤں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو ہندوستان کی سرحد پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ بہاول نگر شہر سے (جو ضلع کا صدر مقام تھا اور جس کے نام پر ضلع کا نام رکھا گیا تھا) ریل کی ایک براچ لائن فوٹ ڈاکو تک جاتی تھی۔ اس لائن پر پورے دن میں صرف دو گاڑیاں چلتی تھیں۔ جو نارنگ و لیٹرین ریلوے کے ناکارہ ترین انجنوں اور ڈرائیو پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس لائن پر چلنے والی ان گاڑیوں کی اوسط رفتار دس میل فی گھنٹہ ہوتی تھی۔ اس لائن پر بہاول نگر شہر سے تیس میل کے فاصلے پر ہارون آباد کا قصبہ آباد تھا۔ یہ قصبہ پورے ضلع کا حسین ترین اور سب سے زیادہ بارونق قصبہ تھا۔ دراصل ہارون آباد کے گرد و نواح میں گندم، کپاس اور گنے کی کاشت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی تجارتی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ یہاں کی غلہ منڈی مغربی پاکستان کی سب سے بڑی غلہ منڈی تھی۔ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے گاؤں بے حد آباد اور خوشحال تھے۔ یہاں کی خوبصورت مسجداں اور فعال میونسپل کمیٹی جس کا آدھے سے زیادہ اسٹاف خوش گو شاعروں پر مشتمل تھا لے ایک قدیم صحرائی قوم جو اب تک بہاول نگر کے ضلع میں آباد ہے۔

یہاں کے چوڑے چکلے، صاف سحرے بانار جہاں رونقیں جاگتی اور سہمے انگڑائیاں  
 لیتے تھے۔ یہاں کی سیدھی ساوی معصوم معصوم سی گھیاں جہاں مکاؤں کے  
 دریچے گداز چروں سے آباور ہتھتے تھے۔ یہاں کی وسیع وسیع چمکتی ہوئی سڑکیں  
 جو دور دراز دیہاتوں سے آئی ہوئی کسان لڑکیوں کی چوڑیوں کے چھناکوں کی امین  
 تھیں۔ یہاں کی چھوٹی سی "ہارون کلب" جہاں خوش اخلاق شہری، افسر اور  
 پڑھے لکھے زمیندار گئی شام تک گیس کے ہنڈے ہلا کر ٹیفن کھیتے اور تاش کی  
 بازیوں بدلتے تھے۔ غرضیکہ اس قصبے کی ایک ایک چیز سے نزہت کو گویا پیار  
 ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی دورے پر مسعود جیل کے ساتھ اس علاقے میں آتی تو  
 اسے تین چار دن یہاں ٹھہرنے پر ضرور مجبور کرتی۔ فور آر (4-8) سڑک پرلی  
 طرف، راؤ حنیف کے گاؤں کے قریب کھیتوں کے درمیان شیشم اور شہری کے  
 اونچے اونچے گھرے بزر اور گھنے درختوں سے گھرا ہوا ایک کینال ریٹ ہاؤس  
 تھا۔ جو بائیس ہزار جنگلے کے نام سے مشہور تھا۔ بائیس ہزار فور آر (4/8) سڑک کی  
 ایک برجی کالبر تھا۔ جو شہری سڑک کے کنارے پر ریٹ ہاؤس کے قریب ہی  
 نصب تھی۔ وہ جب بھی ہارون آباد آتے تو عموماً اسی ریٹ ہاؤس میں  
 ٹھہر کرتے تھے۔ یہاں قیام کے دوران میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام ہارون کلب  
 کے لابی میں ایک ذائقہ مشاعرہ ان کے اعزاز میں ضرور منعقد ہوتا۔ جس کی  
 صدارت مسعود جمال کرتا تھا۔ اور جس میں میونسپل کمیٹی کے تقریباً تمام ملازمین اپنا  
 کلام سنایا کرتے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے یہ شاعر ملازمین اپنی شکلوں اور اپنے  
 اشعار کے اعتبار سے بڑی عجوبہ روزگار قسم کی ہستیاں تھے۔ ان کا سرخدا ایک

ایسا شاعر تھا۔ جس کا عارفانہ کلام فن کی ناقدرہ شناسی کے سبب ابھی تک کسی اچھے رسالے میں بار و پاسکا تھا۔ اور نہ ہی اس کی آئندہ کوئی امید تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ان ”میونسپلٹی“ شاگردوں میں بڑا اہم و عزیز تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کے عارفانہ کلام کی اشاعت کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ تو اپنے شاگردوں سے چندہ اکٹھا کر کے اس نے ایک مجموعہ شائع کیا جس کے سرورق کا کاغذ غالباً کاغذ کی ان اقسام سے تعلق رکھتا تھا، جو دنیا میں پہلی بار بطور تجربہ ملک چینی میں تیار کی گئی تھیں۔ اس دھان پان سے مجموعے میں اس کے شاگردوں کی تو شاید ایک ایک دو دو چیزیں شامل تھیں اور وہ بھی چندے کے طفیل، لیکن اس کی اپنی کم و بیش چھ دو عارفانہ تخلیقات اس مجموعے کی زینت تھیں۔ اس کے بعد اس نے مشاعروں کا آنا طویل جگر چلایا تھا کہ ہارون آباد والوں کا دم محض ناک میں ہی نہیں بلکہ ناک کے آخری سروں تک آگیا تھا۔ اور وہ اپنی ناکوں کو ڈھانپے رہتے تھے کہ سانس کہیں زیادہ تنگ نہ آکر موقعہ پاتے ہی نکل نہ بھاگے۔ چنانچہ ہارون آباد کے قیام کے دوران جب کسی شام وہ شاعر مشاعرے کی اطلاع دینے اور مسعود جمال سے صدارت کی منظوری حاصل کرنے ریٹ ہاؤس آ نکلتا تو نزہت جلدی سے اندر بھاگ جاتی اور جیڑی سیل والا ریڈیو پر آواز سے لگا دیتی۔ پھر تقویری ویر بعد مسعود جمال تو جھنجھلاتا ہوا مشاعرے کی صدارت کرنے چلا جاتا اور وہ کتنی دیر تک باہر لان میں میٹھی شب کی سپاسر آئینائیوں میں شاخوں اور پتیوں کا کبھی دھیما اور کبھی تیز رقص دیکھا کرتی۔ گرم صحرائی ہوا کے جھونکے اس کے اوپر سے تیرتے

ہوئے گزرتے بہتے۔ جان، صاف، سر، سر، تم کس کی امداد ہے ہوا و صحرای  
آوارہ ہواؤں کے گرم جھونکو! ہمیں کس نے بلایا ہے؟ اس کے رگ بگل کے  
ایسے باریک ہونٹ استغفار انداز میں کھٹنے کو ہری سمیتے کہ پان، پان، پان  
اور مرثی کی ہیڈ لائٹیں اس کی آنکھوں کو چندھیادیتیں۔

”پڑا کر دیا ان لوگوں نے تو میرے ذہن کا۔ ایسے ایسے شعر سنائے ہیں  
کہ دل و دماغ کی چولیں ہلا ڈالی ہیں۔“ مسعود جمال سوڑ سے اترتے ہوئے کہتا۔  
نزدہت چڑ جاتی۔

”جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ یہ لوگ شعروں کا جھٹکا کرتے ہیں۔ پھر کیوں  
ان کے مشاعروں کی صدا دیتے ہو؟“ وہ کجھنت کھنکھن مار کر مونچھوں والا  
شاعر.....! مسعود جمال کھٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے ہوسے سے اُدھوا  
جواب دیتا۔ پھر کوئی قصہ چھیڑ دیتا۔ ادا بات ٹل جاتی۔

اسی ہارون آباد کے مغرب میں تین چار میل کے فاصلے پر ایک اور نرغی۔  
جو نرغی آر (3/R) نر کھلاتی تھی۔ دراصل ہارون آباد کا قصبہ فور آر  
(4/R) نر اور نرغی آر (3/R) نر کے درمیان واقع تھا۔ نرغی آر (3/R) نر  
پر بھی ایک ریسیٹ ہاؤس تھا۔ جو قاضی والا ریسیٹ ہاؤس کے نام سے مشہور  
تھا۔ قاضی والا ریسیٹ ہاؤس کے شرقی جانب اگر چار میل تک نر کے کن رے  
کن رے چلتے چلے جائیں تو ایک بڑا پراسرار سا گاؤں آتا تھا۔ جس کا نام ”پکا“  
تھا۔ تمام لوگ اسے ”پیروں کا پکا“ کہا کرتے تھے۔ دراصل اس گاؤں کے  
مالک گدی نشین پیر تھے۔ جو اپنے کوال رسول بتاتے تھے۔ اس گاؤں میں ان

پیروں کے تین خاندان آباد تھے۔ یہ خاندان دراصل ایک باپ کے مختلف بیٹوں کی اولاد تھے۔ ان میں سے دو خاندان تو دراصل پیروں ہی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا کام اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ مریدوں سے نذرانے جمع کرتے تھے۔ ان کی نوجوان لڑکیوں سے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر سجاتے تھے۔ قتالیاں اور منجھرے کرواتے تھے۔ چھریاں اور

ڈاکوؤں کو اپنے ہاں پناہ دیتے اور ان سے اس پاس کے گاؤں میں چھریاں کرواتے تھے، اور پھر دیں کے اجالوں میں گرہ لیں کے اونچے اونچے طرے لراتے ہوئے اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھ کر انہیں اسلام کی مختلف تعلیمات سے آگاہی بخشا کرتے تھے۔ لیکن ان پیروں کا ایک خاندان شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس خاندان کے افراد اپنی تمام تر توجہ زمینداری کے انتظام و انصرام کی طرف مبذول رکھتے تھے۔ ظاہرات تھی کہ اس صوبہ میں دوسرے دو خاندان ان لوگوں سے کیسے نباہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس خاندان کو مذکور پہنچانے کی تاک میں رہتے اور جب بھی موقع ملتا، وار کرنے سے نہ چمکتے۔ چنانچہ ”پکا“ پر پولیس والے بڑی عنایت کی نظر رکھتے تھے۔ اور ان خاندانوں کے بارہمی لڑائی جھگڑے کی وجہ سے ان کا اُگو ہمیشہ میدانِ محاربت تھا۔ وہ خاندان جو بیچارہ سید سادی و شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا، ہر اعتبار سے مظلوم تھا۔ اس کی کھڑی فصلوں میں آگ لگا دی جاتی تھی۔ ان کے ڈھور ڈوگر دن کو مار دیا جاتا تھا۔ ان کے مزدوروں کو مختلف تشدد و اذیتیں دے کر ان کا عرصہ مسیبت تلگ کر دیا جاتا تھا۔ افرادِ خاندان پر قاتلانہ حملے کئے جاتے تھے۔ غرضیکہ ان کا مینا و منجھر کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بیچارے خوش رہتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اسیان کی طرف سے اب تک کوئی انتقامی کاروائی نہیں ہوئی تھی۔

اسی مظلوم خاندان کا سربراہ ایک تیس پینتیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کا نام صاحبزادہ احمد شاہ تھا۔ یہ مسعود جمال کا بڑا گرا دوست تھا۔ لیکن اس کی دوستی غرض مندی اور مطلب پرستی سے کہیں بالاتھی۔ اس نے مسعود جمال سے بحیثیت ڈپٹی کمشنر کے اپنا یا دوسرے کا کبھی کوئی کام نہ نکلوایا تھا۔ وہ کبھی اس کے پاس کوئی سفارش نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنے رشتے دار و خاندانوں کے مقابلے کے لیے یا ان کو رک پیچانے کے لیے کبھی مسعود جمال سے مدد نہ چاہی تھی۔ غرضیکہ وہ بس دوست ہی تھا۔ اور ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے اپنے ان دوستانہ تعلقات سے اس نے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ جب بھی بہاول نگر آتا تھا مسعود جمال کے ہاں ہی ٹھہرتا تھا۔ وہ صرف مسعود جمال کا دوست ہی نہیں، بلکہ نہرست بھی اسے پسند کرتی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سُرخ نماں تھا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ بھیگا بھیگا سا رہتا تھا، جیسے ابھی تک تھکا کر آیا ہو۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور گہرے سیاہ تھے۔ وہ قطعی اُن پڑھ تھا۔ لیکن بے مدغوش مزاج اور زندہ دل۔ اس کے سوتے سوتے ہونٹ ہز کے مسکراتے رہتے تھے۔ اور چھوٹی پیرٹی، بٹن نما آنکھوں کے عقب میں ہر وقت جیسے موم تیاں سی فروزاں رہتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ہونٹ بسکیوں سے ناآشنا ہیں۔ اور آنکھیں، ان آنکھوں نے تو غالباً دنیا کی ہر ہی نہ تھا۔ وہ مسعود جمال کا بچانے کیلئے دوست بن گیا تھا۔ حالانکہ مسعود جمال اپنے ضلع میں قطعی ہر دلعزیز اور مقبول نہ تھا۔ ضلع کے لوگ نہ صرف اس سے خوف کھاتے تھے، بلکہ ایک حد تک اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ اس کی بددعا غی اور بد عنوانیوں کے بارے میں پورے ضلع میں عجیب و غریب قسم کی افواہیں گشت



کی کرتی تھیں۔ اس بارے میں ایک دوبار ڈویژنل کمشنر نے بھی اپنی گفتگو میں سرسری اشارے کیے تھے۔ لیکن مسعود جمال کا خیال تھا کہ کمشنر بہت تنگ نظر شخص ہے۔ اور ذہنی اعتبار سے بھی اس سے کہیں کمتر ہے۔ اس نے ایک بار تو کمشنر سے ملان صاف کر دیا تھا کہ جناب میں نے آپ سے کہیں زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ میں تو کٹ کر بھی آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ضلع کے ان پڑھ تنگ خیال اور جاہل عوام مجھے اچھا نہیں سمجھتے تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری قابلیت پر شبہ کریں۔ ” اور کمشنر اپنا سامنے کر رہ گیا تھا۔ یہ بات نزہت کے سامنے ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے بھی اس کو محسوس کیا تھا۔ اور کھانے پر مسعود جمال کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے جواب دیا۔ ”ذہنی طور پر میں ان منب لوگوں سے اونچا ہوں۔ اس لیے یہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں محض ان لوگوں کے لیے اپنے ذہن کو ان کی سطح پر نہیں لاسکتا۔“

ان تمام باتوں کے پیش نظر نزہت حیران تھی، کہ صاحبزادہ احمد شاہ جو قطعی جاہل تھا۔ مسعود جمال کا دوست کیسے بن گیا۔ پورے ضلع میں صرف ایک وہی شخص تھا جو دل سے مسعود جمال کی تعریف کرتا تھا اور اسے پسند کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

”اگر بہ دماغی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی مسعود صاحب میں ہے۔ تو افسوس شخص کو بہ دماغ بناوے۔“ یہ خورشاد قمر ہرگز نہیں تھی۔ چونکہ نزہت جانتی تھی کہ احمد شاہ کو اگر خورشاد کہنا ہی مقصود ہوتی۔ تو وہ اس سے بہتر طریقے استعمال کر سکتا تھا جو کہ اس نے کبھی استعمال نہیں کئے تھے۔ اس کی یہی بے لوث دوستی تھی کہ اس وقت تک

نزدہت کے ذہن میں اپنے شوہر کی طرف سے کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر ہوئی بھی تھی تو یقین کے سبب تک نہ پہنچنے پائی تھی۔ لیکن اب وہ مر گیا تھا۔ صاحبزادہ احمد شاہ مر گیا تھا۔

اور تب انگلری کے اس ڈی۔ سی۔ ہاؤس کے نیم خنک کمرے کی بدھم تاریکی میں نزدہت نے خوف کے مارے چرنک کر ادھر ادھر دیکھا۔ باہر شریر شام کے فرشتوں کا نزول ہو رہا تھا۔ لیکن کمرے میں ابھی سے رات کا سماں تھا اور صاحبزادہ احمد شاہ کی موت کے خیال نے اس کے جسم کو کپکپا دیا تھا۔ اس نے گہر کر دھن دھن دھن سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر آنکھیں میچ لیں — بند آنکھوں کے سامنے بھی خوف کے بھوتوں کا رقص جاری رہا۔ اور اسے ہارون آباد کے باسٹھ ہزار ریسٹ ہاؤس میں پناہ لینا پڑی۔

وہ دودھ کے دوسے پر ہارون آباد آئے ہوئے تھے۔ ہارون آباد کے گرد و فواح میں جرائم بہت بڑھ گئے تھے۔ قتل کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں۔ چنانچہ باسٹھ ہزار ٹنگے کے لاق میں، مسعود جمال ہارون آباد کے ایس۔ ایچ۔ او سے تندرہ دھنچ لہجے میں گفتگو کرتا رہتا تھا۔ چونکہ جرائم کی زیادتی کی وجہ سے اخبارات اس پر بڑی نئے دے کر رہتے تھے۔ اور اس کا ضلع بدنام ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کہتی مار کہ موٹھوں والا شاعر بھی دانت نکوستا ہوا آجاتا تھا۔ اور موت دھنچنے پر اپنا کوئی نہ کوئی شعر سناتے سے نہ چڑکتا تھا۔ مسعود جمال کے دھنچے کا پر وگرام تو دودھ کا تھا۔ لیکن علاقے کی غیر معمولی صورت حال کی وجہ سے اس نے ہارون آباد میں اپنے قیام کی مدت بڑھا دی۔ دو ایک بار وہ تھا بیدار اور پولیس کے کچے

سپاہیوں کے ہمراہ چند بدنام گاؤں کے محلّے کے لیے بھی گیا۔ تاکہ صورتِ حال کا اندازہ لگا سکے۔ ایک شام وہ محلّے سے لوٹ کر آیا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ اگلے دن اس نے مکمل آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور سلیپنگ گاڑی پہن کر پٹنگ پر دروازہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چیرا اسی آیا۔

”ہر نائب! پچھتے سے صاحبزادہ صاحب آئے ہیں۔“  
”جلا لاؤ۔“

تھوڑی دیر بعد صاحبزادہ احمد شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ ہلکی کا ایسا پیلا ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں جو ہمیشہ مسکایا کرتی تھیں، خوف کی سیاہ دھری کر وٹھیں لے رہی تھیں۔

”آئیے صاحبزادہ صاحب۔ کیسے طبیعت کیسی ہے؟“ مسعود جمال نے پوچھا۔

”بس جی دعا ہے، آپ کی؟“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اور کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں نزہت بھی آگئی۔ احمد شاہ کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک لمحّے کے لیے دروازے میں رُکی۔ اور پھر آگے بڑھ آئی۔ احمد شاہ اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیسے بھائی صاحب طبیعت کچھ نامناسب ہے کیا۔ بیٹھے نا آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟“ نزہت نے جلدی سے کہا۔

”بس جی دعا ہے آپ کی۔“

”پھر میں بات کیا ہے۔ آج آپ بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں جی بات کیا ہوتی تھی۔ آپ جانتی ہیں خاندانی جھگڑے جب سے بڑھ جائیں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“  
 ”کیوں خیر تھیں؟“

”آہو جی۔ یوں تو خیر ہی ہے۔ لیکن آج کل میرے دونوں بھائی دنیا زیادہ جھگڑے ہوئے ہیں۔ میں بھی جی آخر بندہ بشر ہوں تا۔ بھائیوں سے لڑائی وغیرہ سے طبیعت ذرا ڈھیل ہو گئی ہے۔“

مسعود جمال اور نزہت کو معاملات کا تو پہلے سے ہی علم تھا۔ لیکن آج سے قبل احمد شاہ نے کبھی ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کے تایا اور چچا زاد بھائی اس سے برسرِ پیکار ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اس کے ہاتھ پر کبھی ایک شکن لگنے نہ دیکھی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ کبھی اس نہ دکھلائی دیا تھا۔ لیکن آج احمد شاہ جیسے ٹوٹ سا گیا تھا۔ مسعود جمال اور نزہت دونوں نے اپنی اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس بار صاحبزادہ احمد شاہ غیر معمولی حالات سے دوچار ہے۔

”آپ کی بیوی کہاں ہیں صاحبزادہ صاحب؟“ ایک انجانے اندیشے کے تحت نزہت نے دریافت کیا۔

”یہیں گاؤں میں ہی ہے۔“ احمد شاہ نے جواب دیا۔

”اللہ نہ کرے۔“ نزہت ہولے سے بڑبڑائی۔

”جی مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟“ احمد شاہ نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ میں تو یہ نہیں بھانے کیا کہہ رہی تھی۔“ نزہت بولا گئی۔

اس کے بعد احمد شاہ کچھ کے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے اٹھنے اور جانے کے انداز سے کچھ ایسے اضطراب کا اظہار ہوا تھا کہ مسعود جمال اور نزہت میں سے کوئی بھی اسے ٹھہرنے یا رکھنے کے لیے نہ کہہ سکا۔

کچھ دیر وہ دونوں بے جان پتھروں کی مانند خاموش بیٹھے رہے۔ چند اذیت رساں لمحے ایک انجانی سی تکلیف وہ سرسراہٹ کے ساتھ ان کے اوپر سے تیرتے ہوئے گزر گئے۔

”میرے خیال میں احمد شاہ کے معاملات بے حد خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اب اس کے اپنے بس میں کچھ نہیں رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ آج اس کے چہرے پر میں نے موت کی زردی کھنڈی دیکھی تھی۔ اللہ اپنا رحم کرے۔“ نزہت نے معاً چوتکتے ہوئے گڑبڑا کر مسعود جمال سے کہا۔

”ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ احمد شاہ بہت عقلمند اور ولی آدمی ہے۔ وہ ان تمام خطرناک حالات سے بخوبی خود ضبط لے گا۔ باقی رہا یہ اندیشہ کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔ تو یہ اندیشہ بھی بے بنیاد ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ احمد شاہ میرا دوست ہے۔ وہ اکیلا نہیں۔ اسے حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ اس کی جان لینے کی جرأت نہیں کر سکتے۔“ مسعود جمال مسکرایا۔ ”احمد شاہ تو ہے کے ہاتھوں کی حفاظت میں ہے۔“

باہر شام کے مٹیالے سائے سات کی گہری ہوتی ہوئی سیاہیوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ مسعود جمال کچھ دیر ریٹھاؤس کے باہر لان میں ٹھہرا رہا۔ اور پھر رات کا کھانا کھا کر سونے کے لیے چلا گیا۔ اگلے دن اسے بہت کام کرنا تھا۔

علی الصبح اٹھ کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے سول ہسپتال اور تھانے کا معاشرہ کرنا تھا۔ کئی درخواستوں پر فیصلے دینا تھے۔ پھر کچھ گاؤں اور سرحدی علاقے کا ہنگامی دورہ کرنا تھا۔ عزیقہ کام کا اتنا بھرم تھا کہ کل گئی رات تک ختم ہونے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ آج جلدی ہی سو گیا تھا۔

اگلے دن وہ سوریہ ہی بیدار ہو گیا۔ شیو وغیرہ بنا کر وہ نہ ہت کے ہمراہ ناشتے کی میز پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ باہر ایک شور برپا ہو گیا۔ پھر بیماری ہونے کی دھمک اور کچھ لوگوں کے رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔

”کی مصیبت ہے؟“ مسعود جمال جلدی سے کرسی سے اٹھا۔ اور برآمدے میں آگیا۔ نہ ہت بھی اس کے پیچھے چل آئی۔ پرلے لائن کے قریب کئی کسان جمع تھے۔ جو اپنی میلی گڑیوں کے پلوؤں سے بار بار اپنی آنکھیں خشک کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے قریب پولیس کے چھ سات سپاہیوں کا جھگڑا تھا۔ یہ سپاہی تعداد میں پانچ سے زیادہ نہیں تھے۔ اسی سپاہیوں کے عقب میں ہارون آباد کے سول ہسپتال کا نوجوان میڈیکل آفیسر کھڑا تھا۔ اس نے سفید قمیض اور خاکے پتلون پہنی ہوئی تھی۔ وہ رہ رہ کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ سوائے اس میڈیکل آفیسر کے سب لوگ شور مچا رہے تھے۔ جبکہ کسانوں میں سے کچھ آدمی تو عورتوں کی طرح بھی کر رہے تھے۔

”اے اے، توں تے ساٹھا مائی باپ ہی۔ توں سانوں چھڈ کے کدھر چلا گیا۔“

”کیا بات ہے۔ اوئے کی گل اسے؟“ مسعود جمال نے چلا کر پوچھا۔

دو تین کسانوں نے بیک وقت چلا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ جسے مسعود جمال نہ سمجھ سکا۔

”مجھے نہیں سمجھ آئی، ایک آدمی جواب دے۔“ مسعود جمال ایک بار پھر حلق کا پورا زور صرف کر کے چلا یا۔ اس پر میڈیکل افسر نے چونک کر اس کی اُور دیکھا اور ہجوم کو چیرتا ہوا مختلف لوگوں کو ایک طرف دھکیلتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ پولیس کے سپاہی بھی اب چوکتے ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے کسانوں کے ہجوم کو ایک طرف ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ جب یہ لوگ ادھر ادھر ہو گئے تو مسعود جمال کی نظر سامنے والے لائن پر پڑی۔ وہ بے اختیار اُن لائن کی طرف بھاگا۔ اور وہاں پہنچ کر ایک لحظے کے لیے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ اور ہونٹ جو خشک ہو چکے تھے، کپکپانے لگے۔ اس کے سامنے بان کی ایک کھڑی چارپائی پر خون آلود چادر میں لپٹا ہوا صاحبزادہ احمد شاہ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کا بایاں حقہ خون سے لقمقڑا ہوا تھا۔ فیض بھی سرخ سرخ لہو سے بھیگ گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے جسم کو خون کے دریا میں غوطے دیئے گئے ہوں۔ لیکن مسعود جمال کی حیوانی کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اس نے میڈیکل افسر کو کہتے سنا۔

”سائیں! ابھی چل رہی ہیں۔“

اور اس کی انگلیاں جلدی سے احمد شاہ کی نبضوں کو ٹٹولنے لگیں، جو بڑے بے معلوم انداز میں چل رہی تھیں۔ اور لحظہ بہ لحظہ ڈوبتی جا رہی تھیں۔ کسانوں کا ہجوم ان کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ لاش میں ایک غیر محسوس سی حرکت پیدا ہوئی۔

اور موت آسا یہ ہوشی کے عالم میں یہ الفاظ اس کے لبوں میں لت پت ہو گئے تھے۔

”میرے..... بیوی..... بچے..... بچاؤ..... اور ساتھ ہی وہ باریک سا پردہ بھی ہمیشہ کے لیے پھوٹ گیا۔ جواب تک احمد شاہ کی زندگی اور موت کے مابین حائل تھا۔ کسانوں کے جھوم سے یکبارگی کلر شہادت کا ٹوٹا ہوئی صدا اٹھی اور پھر ان کے یہی شدت اختیار کر گئے۔

”اے کچھ چلیا اس، سانوں چھڑ کے اے پیراوتیاں دلیا۔“  
”مسعود جمال نے آنسوؤں کو دھال میں جذب کر لیا۔ نہ بہت جبراً اُسے میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی۔ یہ ہونک منظر نہ برداشت کر سکی اور بڑی طرح روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ریسٹ ہاؤس کے ڈائٹنگ روم میں میڈیکل آفیسر مسعود جمال کو بتا رہا تھا۔

”جب یہ لوگ احمد شاہ کو ہسپتال میں لائے تو خدیہ چوٹوں کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اسے کورائیں اور گلوکوس کے تین چار انجکشن دیئے۔ اس سے اس کی حالت اور سنبھل گئی۔ لیکن میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کا ایک گھنٹے سے زیادہ زندہ رہنا محال ہے۔ اور یہ بات غالباً وہ خود بھی جانتا رہا تھا۔ چنانچہ اسی کے بار بار کہنے پر اسی حالت میں اسے یہاں آپ کے پاس لانا پڑا۔ وہ آخری بار آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“

یہ سن کر نہ بہت کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان پھوٹ رہا۔ اس کی



لگا ہوں گے سامنے صاحبزادہ احمد شاہ کی بیوی کی تصویر گھوم رہی تھی۔ وہ بھولی بھالی سی دیہاتی لڑکی جو دو پیار سے پیارے بچوں کی ماں تھی۔ جس نے زیر لب کوئی دیہاتی گیت لگاتے ہوئے اس کے لیے مٹی کی روٹیاں پکائی تھیں۔ شرما کر اپنے شوہر احمد شاہ کی باتیں کی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ حالانکہ شادی کو چار سال گزر چکے ہیں، لیکن احمد شاہ اس سے بے حد لاڈ کرتا ہے۔ ہر چھوٹے چھوٹے تہوار پر اسے رنگ برنگی چڑیاں لاکر دیتا ہے۔ اور عید، بقر عید پر تو خاص طور پر اس کی گوری گوری کلاٹھیوں کا ”میچا“ لے کر بہاؤ لنگر جاتا ہے۔ اور اس کے لیے سونے کے کنگی بنوا کر لاتا ہے۔ ہائے! ان درد مندوں نے۔ اس بیچارہ کی کیا حشر ہو گا۔ کیا اس کے ان پیارے پیارے معصوم بچوں کو لالٹھیوں سے مارتے ہوئے ان کا دل نہ کانپا ہو گا۔ اُف! جب ان بے گناہ جانوں پر لالٹھیاں برسی ہوں گی۔ تو انہوں نے کس حسرت سے اپنے باپ کو پکارا ہو گا۔ اس بھولی بھالی دیہاتی لڑکی نے کس درد سے اپنے سہاگ کو آواز دی ہو گی۔ باپ سہاگ، جہاں کے پکارنے اور آواز دینے سے پہلے ہی لہو کے دریا میں ڈوب چکا ہے۔ نہ ہمت روتے روتے بڑی طرح کانپ گئی اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں مسعود جمال سے کہا۔

”جلدی کرو۔“ نبھانے احمد شاہ کی بیوی اور بچوں پر کیا گندہ رہی ہو گی جلدی کچھ کرو۔ خود جاؤ۔ اگر یہ ہو گئی تو اس بے گناہ لڑکی اور بچوں کا خون بہا دے سر ہو گا۔“

مسعود جمال تو بولایا ہوا تھا۔ اس کی عقل جواب دے رہی تھی۔ جو کچھ

بھی ہوا تھا۔ اس کے فم سے بالا تھا۔ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ لیکن نہ ہت کی ٹوٹی ہوئی آواز نے اس کو گویا نئی زندگی دے دی۔ خون جو رگوں میں جم چکا تھا، تپش پا کر پھر محرک و متحرک ہو گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باہر برآمدے میں آگیا۔ میڈیکل آفیسر اور نہ ہت بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ لابی میں چار پائی کے ارد گرد جھپٹے ہوئے غمزہ کسان بار بار خون آلودہ چادر ہٹا کر احمد شاہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ارد پاٹنگوں کی طرح روتے ہوئے بدستور بین کرنے میں مصروف تھے۔

”اوئے کتے چلیا اس سافن چھڑکے۔ اوئے پیراموتیاں والیا!“  
مسعود جمال کو دیکھ کر باہم چہ میگوئیاں کرتے ہوئے پولیس کے سپاہیوں نے اٹینشن ہو کر سیڑیٹ کیا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد مسعود جمال میڈیکل آفیسر سے کہہ رہا تھا۔

”آپ لاش کو لپسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال لے جائیے۔“  
پھر اس نے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔  
”آپ لوگ لاش کے ساتھ جائیے۔ اور تھا نیدار صاحب سے کہیے کہ وہ خدا ایک جیب اختتام مسلح سپاہیوں کو لے کر جلدی سے یہاں پہنچ جائیں۔ چلیے، جلیے، جلیے۔ ورنہ نہیں ہونی چاہیے۔“

پھر وہ اور نہ ہت ویر تک برآمدے میں کھڑے سپاہیوں، روتے ہوئے کسانوں، میڈیکل آفیسر اور احمد شاہ کی لاش کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیز رہے تھے۔ ارد و خاموش تھے۔ ہوئے ہوئے ملتی ہوئی

صحرائی جوانے درختوں کی ٹہنیوں اور شاخوں میں لہجہ کر ایک المیہ راگ چھیڑ دیا تھا۔

”گھر، گھر، گھر، گھوں، گھوں، گھر، گھر۔“  
 ”جیب آرہی ہے غالباً۔“ نزہت نے بے تاب ہوا کر کہا۔  
 ”ہوں۔“

اور چند منٹ بعد جیب جو پولیس کے مسلح سپاہیوں سے لدی ہوئی تھی۔ ریٹ ہاؤس کا بڑا گیٹ عبور کر کے کپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ تھانیدار اُچھل کر جیب سے اُترا اور سیلوٹ کرنے کے بعد مسعود جمال کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”ایلمینیشن پورا ہے۔“ مسعود جمال نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں۔“

”سپاہی کتنے ہیں؟“

”جی میں سپاہی ہیں۔ میں بموجب حکم تھانے کے تمام سپاہیوں کو لے آیا ہوں۔“

”ہم ”پتے“ کتنے عرصہ تک پہنچ جائیں گے؟“  
 ”زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ لگے گا جناب۔“

اور مسعود جمال جیب میں سوار ہونے ہی کو تھا کہ بڑے گیٹ سے دو سائیکل سوار ریٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوتے دکھائی دیئے۔ وہ جلدی جلدی پیڈل گھما رہے تھے۔ جیب کے قریب پہنچ کر وہ سائیکلوں سے

اتر گئے۔ اور پسینہ خشک کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نہایت خرقہ کی قسم کا آدمی تھا۔ اس نے قمری رنگ کی ایک دھوٹی باندھی ہوئی تھی۔ جس کے لیے لچے لڑ زمین پر جھاڑوسی دے رہے تھے۔ اس کی گپڑی کا ادبچا طرہ ہوا میں جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک مارا اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھاری چہرے کے نقوش، ترشی ہوئی لیکر گھنی مارٹھی میں چھپے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ بڑے بد وضع اور بڑے مسٹے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برنٹوں کی چمک گوشت کے بھاری ٹوٹے لٹکا دیئے گئے ہیں۔ اور دوسرا شخص ..... نہایت کو یہ دیکھ کر آگ ہی ترنگ گئی کہ دوسرا شخص وہی تھی مارکہ مونچھوں والا شاعر تھا۔ جس کی اول جدول شکل کو معرفت اور شعریت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

”اگر یہ کجھت اس وقت نہ آتا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی؟“ نہایت مل کر زیر لب بڑبڑائی۔

”حضو! ایک تازہ قطعہ عرض ہے۔“ تھی مارکہ مونچھوں والے شاعر نے مسعود جمال سے مخاطب ہو کر آداب بجالاتے ہوئے کہا۔

”عزیزی صاحب اس وقت میں مصروف ہوں۔“ مسعود جمال نے بڑھی ملائیت سے جواب دیا۔

”حضو! یہ تازہ قطعہ اسی مصروفیت کے بارے میں ہے۔“ اس نے دانت نکوسن دیئے۔

مسعود جمال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تو پھر سنا ڈالیئے“

”جی نہیں حضور وہ قطعہ اکیلے میں سنانے کے قابل ہے۔ چونکہ وہ صرف آپ کے لیے ہے۔“ کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر نے ایک بار پھر اپنے لیے دانت غریباں کرتے ہوئے کہا۔

اس پر مسعود جمال نے رک کر ایک لمٹنے کے لیے کچھ سوچا۔ اور پھر نہت کی حیرانی اور غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ جیسے جائید کے تار سے سے بندھا، کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر کی طرف کھینچتا چلا گیا۔ وہ اسے ذرا پرے لے گیا۔ وہ قریباً بیس منٹ تک آپس میں گھس گھس کرتے رہے۔ اس عرصے میں وہ خوفناک قسم کا شخص جو کتنی مارکہ مونچھوں والے شاعر کے ہمراہ آیا تھا۔ تھانیدار کو ایک طرف لے جا کر اس سے سرگوشیوں کے انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ نہت نے سمجھا کر ایک بار پھر مسعود جمال کی جانب دیکھا۔ وہ مسلسل نکاحیں سر لہا تھا۔ کتنی مارکہ مونچھوں والا شاوڑے مرتبانہ انداز میں اسے کچھ بھابھاتا۔ آخر مسعود جمال نے جیسے قائل ہو کر ہفتی میں سر لہا دیا۔ کتنی مارکہ مونچھوں والا شاوڑے خوش ہو کر اپنے بے حکم دانت غریباں کر دیئے۔

پھر وہ دفن اپنے اپنے سائیکلوں پر سوار ہو کر بدھ سے آئے تھے اور صبر ہی چلے گئے۔ مسعود جمال نہت کے قریب آگیا۔

”انسو ہی ہے کہ آج ہم“ پکتے ”پر چھاپہ نہیں بارہ سکتے۔ مسعود جمال نے نہت کی نظروں سے کتراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ لوگ پوری طرح مسلح ہیں۔ اور انہوں نے

کہا ہے۔

”اگر پولیس ہمارے گاؤں کے قریب بھی پھینکی تو ہم بھون کر رکھ دیں گے۔“  
 ”اور تم اس دھمکی سے ڈر گئے۔ تم جو اس ضلع میں حکومت کی نمائندگی کر رہے ہو؟“

”ڈرنے کی تو خیر کوئی بات نہیں، دراصل اس وقت ہماری پولیس فوجیں تعداد میں بہت کم ہے۔ ہمارے آباد کے تھانے میں کل بیس سپاہی ہیں۔“  
 ”پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت جتنے سپاہی ہیں، ان سے کام چلایا جاسکتا ہے۔“

”پاگل نہ بنو نہ رست! بھلا پولیس کے بیس سپاہی ایک پورے مسلح گاؤں سے کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں؟“  
 ”اگر یہ سپاہی ہنگامی حالات سے ٹٹنے کے قابل نہیں تو کیا ان کو نمائش کے لیے تھانے میں رکھا ہے؟“

”لیکن میں جذبات میں آکر اپنی جان اور بیس سپاہیوں کی زندگی کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں۔“

”لیکن احمد شاہ کے بچے اور بیوی؟“

”انہیں وہ لوگ کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”یہی بات تم نے کل احمد شاہ کے متعلق کہی تھی۔ خدا کے لیے مجھے تسخیر سے کام مت لو، یہ معصوم زندگیوں کا سوال ہے جنہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا، اگر تم اس وقت ان کی امداد کے لیے نہ پہنچے تو احمد شاہ کی روح تمہیں کبھی معاف نہیں

کرے گی۔ احمد شاہ تمہارا سب سے مخلص، سب سے پیارا دوست تھا اس نے کبھی تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہا تھا۔ لیکن مرتے مرتے اس نے تمہیں .... ”

اور نزہت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ شدت جذبات سے اس کا گلہ زندہ ہو گیا تھا۔

”سنو، نزہت! میں نے تم سے آج تک کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کی۔ لیکن اس وقت مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر نہیں ہوں، تم نہیں یہاں کے حالات کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس وقت میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ کچھ کر رہا ہوں۔ وہ لوگ اس وقت خون کے نشے میں بہکے ہوئے ہیں، انہیں تارے سے زیادہ گاؤں کی حمایت حاصل ہے۔ ان کی مدد کرنے والوں میں صرف ان کے بنگلے ہوئے مرید ہی نہیں بلکہ وہ ٹاکو بھی شامل ہیں، جن کو وہ پناہ دیتے ہیں، وہ تم کے تمام مسلح ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ احمد شاہ میرا دوست تھا، اس وقت ان کے سامنے نہ قانون ہے اور نہ عدالتیں، ان کے سروں میں خون سمایا ہوا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہمو کے ویزر پر دسے ہیں۔ وہ اس کے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سوچ سکتے ہیں۔ ان حالات میں اگر میں خود کو اور ہمدرد آباد کے لیے سے بچانے کہ ان کے مقابلے میں محبوز تک دوں تو جانی نقصان کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

”تو پیراب کیا کر دے گا۔ خدا کے لیے کچھ نہ کچھ کر دو۔ وہ مجھے بھالے بیگناہ بچتے اور ان کی بے تصوراتی تمہیں دھمیں دے گی۔ احمد شاہ کی روح تو پیراب ہی ہوگی۔ بخدا اس کے بیوی بچے زندہ ہیں یا .... نہیں۔ بھٹی جلدی کر دو۔“

”دیکھو نزہت! تم پھر جذباتی ہو رہی ہو۔ اس وقت میں وقت اور حالات

کے سامنے بے بس ہوں۔ میں اب تھکنے جاؤں گا۔ وہاں سے ہواؤں مگر تاروں کا  
کہ مزید پولیس فردس بھیجی جائے۔ اس کے بعد ہم کل رات افشاۃ اللہ کے پرچھاپے  
میں گئے۔“

یہ کہہ کر مسعود جمال پولیس کی جھپ کی طرف بڑھا۔

”ایک منٹ کے لیے، میری ایک بات اور میں جاؤں۔“

مسعود جمال رُک گیا۔

”بھئی نہیں تو میں کتنی ہوں، کتنی ہی وقت چکنے پرچھاپے مارنا چاہیے۔ اگر  
تم پولیس کے ساتھ ہو گئے، تو وہ لوگ قطعی مقابلہ کر سکیں گے۔ وہ ڈیڑی کیشنز کی  
آمد کا شش کہ ہی ڈجائیں گے، دیک جائیں گے اور ایسا نہ بھی ہو تو ایک مخلص  
دوست کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کو بچانے کے لیے ایک ذرا سا خطر  
مول لینے میں آخر ہرج ہی کیل ہے؟“

”تمہیں بار بار میری قوت کی بات دہرانے میں لطف کیا آتا ہے؟“ مسعود

جمال نے غصے سے کہا۔ اس نے کبھی زہمت سے غصے میں نہ بات کی تھی۔  
وہ جھنجھلا کر پھر جھپ کی طرف جانے لگا۔ لیکن زہمت نے اسے روکنے کے  
لیے اس کا بازو تھام لیا۔

”کچھ تو خیال کرو بھئی۔“ وہ اچانک معصوم چانوں کو جو اس کے تھارے

ایک مخلص ترین دوست کی امانت ہیں، مار ڈالیں گے۔ وہ مرتے مرتے چاہنے

بے جا جان جسم کو اٹھ کر تھارے پاس آیا تھا۔ چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ تھارے علاوہ

اور کوئی نہیں جسے وہ اپنی امانت سونپ سکے۔ خدا کے لیے اس امانت کی



حفاظت کرو۔ لوگ تو اپنے دوستوں کے لیے بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“

”احمد شاہ کے بیوی بچوں کے بارے میں اس وقت کچھ معلوم نہیں، کہ زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے۔ کیا پتہ انہیں احمد شاہ سے پہلے ہی مار دیا گیا ہو؟“  
 ”اُٹ! ایسا نہ کرو۔ بہر حال اگر انہیں بچایا جاسکتا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ انہیں بچاؤ۔“

”میرا فرض یہ ہے کہ میں ہر کام سوچ سمجھ کر کروں۔ ہر قدم جذبات میں بہک کر نہیں بلکہ ناپ تول کر اٹھائوں۔ میں اپنی اور اپنے سپاہیوں کی زندگی ایک ایسی عورت اور اس کے ان بچوں کے لیے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں جن کو ان کے اپنے قریبی رشتہ دار جن کا ان سے خون اور گوشت کا تعلق ہے، زندہ چھوڑنے کے بعد امارت ہوں۔“  
 ”وہ تمہیں بڑی کاٹھن دیں گے۔“

”کون؟“

”ضلع کے تمام لوگ۔“

وہ بڑے طنز سے مسکرایا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس ضلع کے لوگوں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہوں۔ اب میرا مزید وقت ضائع نہ کرو۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے بالکل درست کیا ہے۔“

نوبت نے اسے ایک بھر پور نظر سے دیکھا۔ مسعود جمال اور اس کی شادی کو

چھ برس گزر چکے تھے۔ اور وہ اس کے ہرے کے ہر تاثر سے واقف تھی۔ اس کے ہر خیال سے اسے آشنا تھی۔ اس نے مسعود جمال کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور اس سے اسے وہ آنکھیں ان کھڑکیوں ایسی دکھلائی پڑیں جو تاریک خلاؤں کی مانند منہ پھاڑے رہتی ہیں۔ نرہمت کے شاداب چہرے کا رنگ معاذرہ ہو گیا۔ جیسے کسی ہرے بھرے پتے پر چانک بھلی گری ہو، اور وہ پیلا پڑ گیا ہو۔ اس نے مسعود جمال کا بازو چھوڑ دیا اور ایک لفظ کے بغیر واپس باغ سے میں لگئی۔ مسعود جمال جیب تھانے سے واپس آیا تو نرہمت نے دیکھا کہ وہ کھن مارکہ سو نچھوں والا شاعر اس کے ہمراہ تھا۔ وہ دونوں گئی رات تک لان میں بیٹھے باہم چراسر سرگوشیاں کرتے رہے۔ اور نرہمت ریسٹ ہاؤس کے اندر منی صحن میں میٹھی جلیقی رہی۔

جب مسعود جمال، کھن مارکہ سو نچھوں والے شاعر سے فارغ ہو کر اندر آیا تو نرہمت نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔  
 ”کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا۔ احمد شاہ کے بیوی اور بچے بھی قتل کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے بہادر نگر حکم بھیج دیا ہے کہ مزید پولیس فورس بھیج دی جائے۔“  
 ”اب پولیس فورس منگوانے کا فائدہ؟“

”ہاں یہی نہیں سوچ رہا ہوں۔ چونکہ قاتلوں کو گرفتار کرنا اب پولیس کا کام ہے۔ ہمیں کل صبح بہادر نگر چلنا چاہیئے۔ مجھے اطلاع ملے ہے کہ کل شام کشن آباد ہے۔“  
 ”بیوی بچوں کو کب قتل کیا گیا؟“

” احمد شاہ کے قتل کے تین گھنٹے کے بعد “

” اندھیر سے ناز بہت چلا اٹھی “ اگر تم اس وقت میرے کہنے کے مطابق

چلے جاتے تو شاید وہ لوگ بچ جاتے “

” اس وقت اگر میں چلا جاتا تو میری جاب بھی خطرے میں تھی “

نزدہت نے کوئی جواب نہ دیا، اور ساری رات آنسوؤں سے تکیے کو

بھگرتی رہی ۔

اگلے دن وہ صبح بھاول نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی سے

پہلے مساندھیر سے ہی کتھی مارکہ مونچھوں والا شاعر پھر ریڈ ہاؤس آدھ کا تھا۔

مسعود جمال اسے کار سے دور لے جا کر بڑے پروردہ انداز میں کچھ تعلقین کرتا رہا۔

اور وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ چلتے وقت اس نے مسعود جمال کو اپنے لیے

بے شک و انت نکال کر الوداع کہا۔

جب کار ریڈ ہاؤس کے صدر دروازے سے نکلی تو نزدہت بہت پر ایک

عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اسے رہ رہ کر احمد شاہ کی مظلوم بیوی ہر بیگناہ

بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ جنہیں خاندانی مناقشات اور بے بنیاد ٹھمنیوں کے سنگدل

دین نا کے پتھر یے چرنوں میں اپنے لہو کی قربانی دینا پڑی۔ نزدہت کے ذہن میں ایک

اجنبی سے سوال نے سر اٹھایا یہ کیا اس کے بعد ہار دل آباد آتا نصیب ہو گا کسی

نکلی سی آواز نے پکار کر کہا۔

” وہ نہیں۔ “

اُن ایہ تو احمد شاہ کے مقتول بچے کی آواز تھی ۔

اور جب یہ لوگ بہا مل گئے پیچھے، تو معلوم ہوا کہ کشر آج شام یہاں پہنچے وہاں سے۔ مسعود جمال تو کچھری چلا گیا اور نزہت ڈرائیگ روم میں دھنسی رہتی رہی۔ آنسوؤں کا خزانہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔

شام کے وقت مسعود جمال دفتر سے آکر بیٹھ رہی تھا کہ کشر کی کارپوں پڑیں کرتی بنگے میں داخل ہوئی۔

مسعود جمال جلدی سے باہر نکلا اور نزہت منہ دھوئے غسل خانے میں بیباگ گئی۔ جب وہ اپنی حالت ٹھیک کر کے واپس ڈرائیگ روم میں آئی تو دیکھا کہ وہاں کشر اور مسعود جمال موجود تھے۔ کشر نے بڑے اخلاق سے آٹھ کر نزہت کا استقبال کیا۔ ”ہیلو مسز مسعود! ہاؤ۔ آر۔ یو؟“  
اتنے میں چپٹے بھی آگئی۔

کھٹاک۔

دردِ مازہ کھلا۔ نزہت نے چونک کر دیکھا، اردل چپے لارہا تھا۔

”اوہ“ نزہت نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تو وہ منظر کی میں ڈی سی ہاؤس کے ایک تاریک کمرے میں بیٹھی تھی۔

”بگیم سب!“ بلب تو ملایا ہوتا۔ اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہیں؟ اردل نے حیرانی سے کہا۔

”بھئی تم ہی جلاؤ، میری طبیعت خراب ہے۔“

”ہٹ“ اور پورا کمرہ بلب کی روشنی میں نہا گیا۔

اردنی چائے رکھ کر چلا گیا۔ نزہت نے بڑی آہستگی سے پیالی میں چائے انڈیلی۔ اردنی چینی گھولنے گھولتے پھر سہاول نگر واسے بنگلے کے ڈرائینگ روم میں چلی گئی۔ وہ کشر کی پیالی میں چینی گھول رہی تھی۔ اور وہ دھیمے انداز میں مسعود جمال سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہوئے کہ کل جب ”پکا“ میں تین قتل ہوئے تو آپ ہردن آباد میں ہی موجود تھے؟“

”جی ہاں۔“

”اور مقتولین، آپ کے ملنے والوں میں سے تھے؟“

”جی ہاں۔“

”پھر تو لازماً آپ نے قاتلوں کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا ہوگا؟“

”جی نہیں۔“

”کیوں؟“ کشر نے حیرانی سے پوچھا۔ لیکن نزہت جان رہی تھی کہ

کشر کی حیرانی مصنوعی ہے۔ اداسے تمام واقعات کا علم ہو چکا ہے۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ مسعود جمال نے سگریٹ سڈگلتے ہوئے کہا۔

”تو پھر صبر پائی کر کے یہ پوری کہانی سنا ہی ڈالیے۔“

اور مسعود جمال نے بڑے مختصر لفظوں میں تمام واقعات کشر کے سامنے

بیان کر دیئے۔ اس نے دنیا کے بہترین ناول، اور افسانے پڑھے ہوئے تھے۔

اور آج وہ یہ واقعات سناتے ہوئے ہی تمام ناولوں اور افسانوں کی تکنیک کے

نچوڑ کو کام میں لا رہا تھا۔

”آپ کی قوتِ بیان کی دلدور دینی ہی پڑتی ہے۔“ کیشنر نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کے پاس پولیس کے بیس سپاہی مروجہ  
 تھے۔ جو ہر طرح سے مسلح تھے۔ پھر آپ چھاپہ مارنے کے لیے بہاول نگر کی پولیس  
 فورس کا انتظار کیوں کرتے رہے؟“

”میں نے عرض کیا تھا قاتل مقتول کے کزنز ہیں، اور گندی نشیں پیر ہیں۔ اور نہ  
 صرف پتے کے گاؤں پر بلکہ اس پاس کے کئی دیہاتوں پر ان کا بے انتہا اثر ہے۔  
 ان کے پاس خطرناک قسم کے ڈاکو بھی رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں  
 خون اترا ہوا تھا۔ اگر میں بیس سپاہیوں کے ہمراہ پتے پر چھاپہ مارتا تو میں ممکن  
 تھا کہ وہ لوگ بھی مقابلے پر اتر آتے۔ اس صورت میں نہ صرف بیس سپاہیوں  
 بلکہ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا جو کہ میں کسی صورت بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔  
 اور اگر میں ایسا کر بھی بیٹھتا تو یہ ایک قطعی غیر دانشمندانہ اقدام ہوتا۔“

”اگر آپ کو اپنی جان کا خطرہ تھا تو چھاپہ مارنے کے لیے آپ کا پولیس کے  
 ساتھ ہونا ضروری نہ تھا۔ آپ پولیس کو تو چھاپہ مارنے کا حکم دے سکتے تھے  
 جبکہ میری اطلاع کے مطابق آپ نے پولیس کو بھی یہ قدم اٹھانے سے روک رکھا۔  
 اس صورت میں بیس سپاہیوں کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔“

”اگر پولیس کے بارے میں بھی اس طرح سے سوچا جائے کہ فلاں معاملے  
 میں پولیس کو جان کا خطرہ ہے۔ اس لیے اسے چُپ چاپ تھانے میں بیٹھے رہنا  
 چاہیئے، تو پھر پولیس کے ٹھکے کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اس کی ضرورت ہی کیا  
 رہ جاتی ہے؟“

اس پر مسعود جہاں کندھے جھٹکا کر خاموش ہو گیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔

”دیکھیے مسعود صاحب!“ کشن نے پھر کہنا شروع کیا۔ اس دفعہ اس کا لہجہ قدے درخشنگی آمیز تھا۔ ”آپ کو یاد ہے، آپ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ کہ ”میں نے آپ سے کہیں زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ میں آرٹ کو بھی آپ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ضلع کے اُن پڑھ اور تنگ خیال عوام مجھ سے بھی نہیں سمجھتے تو آپ کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری قابلیت پر شبہ کریں۔“ یاد ہے آپ کو یہی کہا تھا تا آپ نے؟ آج آپ کی قوتِ بیان دیکھ کر میں یہ ماننے پر مجبور ہوں کہ واقعی آپ نے مجھ سے زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ کشن نے ایک لمحے کے لیے رک کر ڈرائیونگ روم میں چاندوں طرف نظریں دوڑائیں، اور پھر کہنے لگا۔ ”اُداس ڈرائیونگ روم میں تنگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر میں یہ بھی مانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے افسوس ہے مسعود صاحب! کہ میں آپ کی اہلیت پر شک کر رہا ہوں۔“

”شکریہ۔ لیکن مجھے اب بھی اصرار ہے کہ میں نے جو کچھ کیا حالات کے مطابق بالکل ٹھیک کیا۔“ مسعود جہاں نے کہا۔

”خیر یہ کہہ کر آپ نہ مجھے مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ اپنے ضمیر کو بہر حال پابچے تو یہ تھا کہ میں آپ کو استغفیٰ دینے کا مشورہ دیتا لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ اپنی ٹرانسفر کے لیے درخواست دے دیں۔ تو میں اس پر سفارش کر کے اگے بھجوا دوں۔“ یہ کہہ کر کشن بہاول نگر کے کینال ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ جہاں

اسے ٹھہرنا تھا۔

ادب اب نہ بہت منگھڑی کے ڈی۔ سی۔ ہاؤس میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اپنے اس لہادے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے۔ جو کئی دنوں سے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پردہ پوش پارہا تھا۔ اب وہ تمام تلخ باتیں مسعود جمال کے سامنے اُگل دینا چاہتی تھی۔ جو بہت دنوں سے اس کے دل و دماغ میں پس گھول رہی تھیں۔ اب وہ اس زہر کی تلخی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ اس کڑواہٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کڑواہٹ میں اپنے وجود کو گھلاتے رہنے سے بہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا پایا جائے۔ چھٹکارا جو عارضی نہیں بلکہ دائمی ہو۔

ٹیک۔ ٹیک۔ ٹیک۔ وہ چونکی تو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ اور مسعود جمال مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

”اے، تم سنائی بھی نہیں۔ کپڑے بھی نہیں بدلے؟“

”نہیں۔“

”کیوں آخر؟“

”میں نہیں سناؤں گی۔ میں کپڑے بھی نہیں بدلوں گی۔ میں تمہارے ساتھ

رہنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟“

”ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم خود مجھے طلاق دے دو، ورنہ میں عدالت



میں جا کر طلاق لے لیں گی۔ اب میں برواشت نہیں کر سکتی۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب مجھ میں ہمت نہیں رہی کہ میں تمہارے ساتھ چل سکوں۔“ مسعود جمال کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔“

”خدا شاہد ہے کہ میں تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ چھ برس تک میں نے وہاں وہاں بجدے کیے ہیں جہاں جہاں تمہارے قدموں کے دھندلے سے بھی فضا ہی دیکھے ہیں۔ میں تم پر اسی طرح ایمان رکھتی تھی جیسے خدا پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے تمہیں دل کے سنگھاس پر دیوتا بنا کر بٹھایا۔ اور وہ رات تمہاری عبادت کی، لیکن اب یطیس ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے اب جانے دو۔ میں اب چلی جاؤں گی۔“

مسعود جمال نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ یکایک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر پڑیں اور پھر وہ بڑی طرح رونے لگا۔ اس کی سسکیاں کمرے کی فضا میں پھیل گئیں۔

”نزد ہست یا اتنی سنگدل نہ بنو۔ مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ میں تمہارے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ مجھے مت چھوڑو نزد ہست یا نزد ہست .... نزد ہست۔۔۔“

”نہیں۔ نہیں۔ اپنی سسکیوں سے میرا سترہ زرد کو۔ میں اب تمہارے ساتھ کسی صورت نہیں چل سکتی۔ مجھے اپنی راہ پر جانے دو۔ مجھے ضرور جانا

چاہیے۔ ضرور۔ میں اب کس طرح تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ ایک عودت کا  
 سب سے بڑا غرور اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر یہ غرور ٹوٹ جائے، تو پھر.....  
 تو پھر..... اب مجھے جانے دو۔“

مسعود جمال نے نزہت کے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جلدی  
 سے کرے سے یہ کہتی ہوئی نکل گئی۔

”میں تیس شے سمجھتی تھی۔ لیکن تم تو ڈیڑھ کشنر نکلتے۔“

(ماہنامہ ادب، لطیف، لاہور)

## ادھوری تصویر

تصویر مکمل ہو گئی تھی۔

انل نے سگریٹ سلگایا اور ایزل سے خدا ناکارے پر بھوری ملائم پٹیوں پر لیٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح لیٹنا اچھا لگتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اندر اور باہر بڑا سکون اور شانتی محسوس کرتا۔ اس نے اپنے اعضاء ڈھیلے چھوڑ دیئے اور آنکھیں موند لیں۔ پھر وہ سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، سامنے نیلی ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔  
”ہیلو انل، سو گئے تھے؟“

وہ مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

تم سوتے میں ہیٹکے کی کسی کہانی کے کڑے کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ بھی کھلے میں اس طرح بنے ہوئے ہیں۔ وہ مسکرائی :-

“LIKE IT THIS WAY”

انل سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ اسے لاجواب یاد آگئی۔ وہ جب بھی نیکی کے ساتھ ہوتا اسے لاجواب یاد آ جاتی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتی لڑکی جس نے کس تک نہیں دیکھی

حق۔ لاجو کا خیال اس کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح آتا جیسے علی ہلکی دھندلے سے چھوکر اڑ رہی ہو۔ ایک نرمی اور خوشگوار ٹنڈوں اور تنازگی کا احساس ہوتا ہے۔ سننے لگتا ہے کہ میٹ ختم کی۔ اس دوران نیلی ایزل پر مٹی تصویر دیکھتی رہی۔ اس کی میٹھ اقل کی طرف تھی۔ پھنسی پھنسی جینیز اور شرٹ میں ایسی لگ رہی تھی جیسے ایک ایک الگ الگ الگ الگ بچوں سے کک گیا ہو۔

”یہ تمہارے لیے ہے۔“

”مجھے لینڈ سکیپ پسند نہیں ہے“ وہ پلٹ کر بولی۔ ”یہ درخت، سیٹ اور ٹین کی چھتیں، چمنیوں سے نکلتا دھواں، دو چوٹیوں پر چمکتی برف جھرنے، آبشاریں تو میں بیس سال سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ مجھے یہ سب بے معنی اور ٹھہرا ٹھہرا سا لگتا ہے۔ کوئی ایسی چیز نا کہ دوچھ دیکھ کر سو رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگے۔“

اقل نے اسے غور سے دیکھا اور سوچا۔ اس لڑکی کو اس کے تمام تر خیالات، جذبات اور احساسات کے ساتھ کیمنوس پر ابھارنے کے لیے کوئی سے رنگ دیکار ہوں گے۔ اور لاجو کے لیے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وسیع۔ شفاف۔ نیلا۔

”تمہیں شکار کا شوق ہے“

”مجھے گھوڑوں سے واسطہ نہیں رہا۔“ اقل اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ وہ ہتھیلے لے کر اس پتھر تک گئی جہاں سے سڑک دکھائی دیتی تھی اور نیچے اُس کو ٹھکی کی ٹہنی کی ہری چھت بھی، جس میں وہ ابی دنوں رہ رہا تھا۔ کوٹھی

کے دُکُش سے دُصوٰں نکل رہا تھا۔

”رام سنگھ نے کام شروع کر دیا ہے۔“

”ہاں، نیلی اس کے قریب آ گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ اس کے جسم کی آبخ محسوس کر سکتا تھا۔ ٹھست لباس میں ٹھاٹھیں مارتے جسم کو سن سکتا تھا۔ میں اسے پانی گرم کرنے کے لیے کہہ آئی ہوں۔“

اقی نے چپڑے کی جیکٹ پہنی اور ایزل اٹھالیا۔ تھیلانی نے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ نیلی نے اس کا بازو تھام رکھا اور اپنا بوجھ تقریباً اس پر ڈال کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اقی اس کی گرم سانس کی اپنی گردن اور گالوں کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی ایک سہیلی کے بارے میں بتا رہی تھی، جو اس کے بھائی کو چاہتی تھی، لیکن وہ کینیڈا چلا گیا جہاں اس نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی، اور جب وہ ادا اس رہنے لگی تو نیلی نے اسے کھایا کہ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، عورت کو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کتنا کماتا ہے۔ آج کل اس کی وہ سہیلی ایک آئی ایس اے افسر کے چکر میں ہے۔ پھر وہ ایک لڑکے کے بارے میں بتانے لگی جو تھا تو تعلیم یافتہ لیکن جسے بندوق کی طرح درختوں پر چڑھنے، اُچھل کود کرنے اور جنگلوں اور پہاڑیوں پر بھٹکنے میں مزا آتا تھا۔ وہ سخت وحشی تھا۔

اقی سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا، خاموش چل رہا تھا۔ لاجو نے اسے اپنے بھائی کے بارے میں بتایا تھا جو صبح سے شام تک کھیت پر کام کرتا تھا، اس نے

ایک دیر تا کا ذکر کیا تھا جو سامنے والے کالے پہاڑ کی چوٹی پر رہتا تھا۔ اور ان کے گاؤں کو ہر مصیبت سے بچاتا تھا اور ان کی فصلوں اور ڈھیر ڈھیروں کی رکھوالی کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لاچوڑھیلا ڈھالا لباس پہنتی تھی اور ہنستی رہتی تھی۔

”اے۔“ نیلی نے اس کی کلائی میں ناخن چھبویا۔ ”اگر میں تم سے شادی کروں تو بار بار تمہیں یاد کرانا پڑے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔“ وہ ہنسی مسٹر آرٹسٹ جب کسی لڑکی کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس طرح خود میں نہیں تربطتے۔ باہر نکل کر رہا کرو۔“

”سوری“

”آج تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آج تمہارا کوئی پروگرام یا APPOINTMENT ہو تو کنسل کر دو۔ آج ہم کہیں ٹور چلیں گے۔ ذرا اڈوینچر ہے گا۔“

”تم تھکی نہیں۔؟“

”تم میرے اندر کہیں جیسے پٹکے چل رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں ابھی تمہیں جس لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھی، سب سے پہلے اُسی نے تجھ سے میری ملاقات کر لی تھی۔ عجیب آدمی تھا۔ ایک دفعہ چوڑی لگی تو زخم پر کوئی دوا تک نہیں لگائی۔ سب نے اسے سمجھایا لیکن وہ بضد رہا کہ اسے ایسے ہی اچھا لگتا تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ چلا گیا ہے تو اکثر یاد آتا ہے۔“ HE WAS ALIVE TO THE BONE پھر وہ کچھ

سوچ کر بولی۔ اُٹل۔ تم بھی تو کوئی بات کر دو۔  
”تم کرو، میں سُک رہا ہوں۔“

”تم بڑے چالاک ہو۔ اس طرح تم میرے اندر جھانک لو گے اور تمہاری شخصیت مجھ سے چھپی رہے گی۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کسی لڑکی کے ساتھ تمہیں آٹا CUNNING نہیں ہونا چاہیئے۔“  
”میں CUNNING نہیں ہوں۔“

”تم ہو۔ نہیں تو جوتے کیوں نہیں۔ ہر وقت مجھے ہی بولنا پڑتا ہے۔  
مجھے اپنے بارے میں، اپنے سفروں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے لوگوں سے ان کے تجربات اور ایڈوینچرز کی کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے۔“  
”میرے تجربات میری تصویروں میں ڈھل جاتے ہیں۔“  
”تم نے سارا ہندوستان گھوما ہے۔ مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں سے ملے ہو۔ ان کے بارے میں کیوں نہیں بتاتے تم۔“  
وہ خاموش رہا۔

وہ ڈیڈی کے ایک ریٹائرڈ کرمل دوست ہیں۔ وہ اکثر رات کو ہمارے ہاں آ جاتے ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کرائی۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر وہ جب دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں سناتے ہیں تو مزہ آ جاتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپاتے۔ کون سے ملک میں انہیں کس کس قسم کی عہدوں میں۔ کس سودے پر کیا ہوا۔ ان کے پاس اتنے میڈل نہیں جتنی مختلف دلیوں کی عہدوں کی تصویریں ہیں۔ ڈیڈی شکار کے قصبے سناتے ہیں۔ ڈیڈی نے شیر

چیتے، بھالو، جنگلی سور ہر جانور کا شکار کیا ہے۔ کئی بار زخمی ہوئے ہیں۔ آج کل وہ اندر کر نکل نکل پھر شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ ڈیڈی بڑے HATER OF FACT قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں صرف دو چیزوں سے نفرت ہے۔ اپنی بندوق اور شکار کیے جانوروں کی کھانوں سے لٹی رتنی میں ڈوبا رہتی ہیں۔ کسی نہ کسی کو ڈھونڈ لاتی ہیں۔ میں گھر میں ہوں تو مجھے کڑی بیٹھتی ہیں۔ مجھے یہ ان ڈور لائف پسند نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے افریقہ کے جنگلوں میں گھومتی پھروں۔ وسیع سمندوں میں دور دراز جزیرے تلاش کروں اور ان کے بارے میں لکھوں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ مجھے یہاں پیدا ہی نہیں ہرنا چاہیے تھا۔ YOU KNOW I DID NOT CHOOSE IT اچھا تم اپنے سفروں کے بارے میں لکھ کیوں نہیں ڈالتے۔ میرے دل میں اکثر بال اشتا ہے۔ تب میں چاہتی ہوں کہ لکھتی چلی جاؤں۔ دو چار مرتبہ کوشش بھی کی لیکن خیریت پنجبرے میں بند چڑیوں کی طرح اڑنے اور چھننے لگتے ہیں۔ تب مجھے سخت کوفت اور وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں باہر کو بٹھاتی ہوں۔ تم لکھو، میں تمہاری سبکتا میں خریدوں گی۔“

”میں تمہیں کتابیں PRESENT کروں گا۔“

”SO NICE OF YOU“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تم چار سال ہوئے ایک کتابی شاعر نے مجھے اپنی کتاب دی۔ غلامی اور نیک خواہشات کے ساتھ۔“ وہ ہنسی۔ ”پڑھنے بیٹھ تو بھر ہو گئی۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی عشق میں مرے جلنے اور قبر کے بولنے والے عاشق کے یہودہ اور بے معنی جذبات۔ سب اگلی ہوئی باتیں۔ جتنے کتاب آتش وانی میں پھینک دی اور راکھ لفظ نے میں ڈال کر ان حضرت کو بند لیا۔ جڑی



واپس بھیج دی۔ میرا خیل ہے انہوں نے شاعری ترک کر دی ہوگی۔  
”تم خاصی خطرناک ہو۔“

”آرٹسٹ کو ہمیشہ نئی بات کہنی چاہیئے۔“

اب وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ اقل نے ہنسنا چلا گیا اور وہ دھوپ میں بیٹھ کر ایک میگزین میں تصویریں دیکھنے لگی۔ لہجہ اونچے درخت اور صراحتی بھری کوشیاں۔ چینیوں سے اٹھتا دھواں۔ کسی کسی دیکھے میں کوئی چہرہ، دھوپ میں سوکتے کپڑے اور سب سے پرے کالی پہاڑیوں کا سلسلہ۔ وہ بوجھ ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ اقل اتنی اتنی دیکھا جیسا یہ سب کیسے دیکھتا رہتا ہے۔ ان وہائیاں چیزوں کو دیکھے جانے میں کیا لگ ہے۔ کتنا ہے دور پہاڑیوں کو دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے کیا مسخورت ہے۔ کوئی پروگرام نہ ہو تو آدمی فلم ہی دیکھ آئے۔ وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

”اے اقل جلدی کر دے میں بوجھ ہو رہی ہوں۔“

”کچھ پڑھو، اندریک میں کت میں رکھی ہیں۔“

”میں وی کے وقت نہیں پڑھ سکتی، اور پھر مجھے تمہارا چیخوف اور پریم چند پسند

نہیں۔ تمہارے پاس ہیمنگ وے یا ڈولہ ہے؟“

”دلی ناراں تجھے ہوا کیا ہے۔“ وہ گانے لگا۔

”اقل جب تمہاری آواز اچھی نہیں تو کیوں گاتے ہو؟“

”آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟“

”ٹھنڈا پانی۔“ وہ تقریباً یانچنی۔ ”نکلے ہو باہر کہ تمہاری چیزیں سرک پر

پھینکوں۔“

اگلے جلدی سے باہر آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ نیل کا نرم منہ ابھی تھا ایک سانف کا کام کرنے لگتے ہیں۔ جتنی دیر وہ تیار ہو تا مہل نیل اس کے ساتھ رہی اور ہینکٹوے کے گٹے لگاتی رہی۔

”ہمارے ہاں اس کی فکر کا ایک بھی ادیب نہیں۔ حاصل کسی کو زندگی کا اتنا قری اور گرا شاہدہ اور تجربہ ہی نہیں۔ یہاں تو ڈرائیگ دوم میں بیٹھ کر ترقی پسند کہانیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرے تو اسے گالیاں اور مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ بے چارے عوام کے غم میں گھلے ہمارے ہیں۔“

مام سنگھ ناشتہ لے آیا اور وہ ادھر متوجہ ہو گئی۔ وہ بڑے گھر پر انداز میں بیٹھ کر اگل کے لیے توس پر کھنوں اور جم لگانے لگی۔ پھر اس نے اگل کے لیے انڈے پھیلے اور کوئی بنائی اگل ٹھوٹیت کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ کھرکی سے آتی دھوپ نیل کے بالوں اور گردن سے لپٹ کر بے حد پیاری اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں دھوپ میں نیل کے بدن کی حرارت تھی یا نیل دھوپ کی ٹکلی لگتی سے تپ رہی تھی، اگل کو کمرے میں ایک نشہ آور آہنچ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ میز پر جھکی چائی میں چمچہ بلا رہی تھی اور بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ خواہ مخواہ اس سے ڈرتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کا لباس دیکھ کر مسکرایا۔ جیسے مڑکی بھری بھری سی پھل۔ اُسے لاجو یا دا آگئی۔ وہ خاوند کے گھر جا کر اسی طرح کام کرتی رہے گی۔ روٹیاں پکا کر کھیت پر لے جائے گی اور کپڑے دھوئے گی۔ کپتے فرش پر گر کر برکی لپائی کرے گی۔ ڈھور ڈھنگوں کی دیکھ بھال کرے گی اور پھر

اپنا آپ اپنے خاوند کے حوالے کر کے یوں نشیمن ہو جائے گی جیسے منزل پر پہنچ گئی ہو۔ وہ شاید کبھی بس نہیں دیکھے گی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ ٹیزل کا دھواں اور انجنوں کی گڑگڑاہٹ اس کی آتما کی شانہی اور شکوکہ کو مجروح نہیں کر سکے گی۔ وہ سورج کے ساتھ جاگے گی اور اسی کے ساتھ سو جائے گی۔ اسے وہ شام یاد آگئی جب وہ لاجو کے باپ کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچا تھا۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے جا رہا تھا، سائے پھیل رہے تھے اور سامنے کالا جنگل پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ لاجو اپنے گھر کے باہر بیٹھی رات کے کھانے کے لیے چٹنی میں مری تھی۔ سورج کی گلابی کرنیں لاجو اور میب کے شکوفوں پر پڑ رہی تھیں اور جب وہ اٹھی تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس لڑکی کی تصویر بن جائے گا۔

”کونئی ہینو“ نیلی بولی۔

وہ خوابوں کے جزیرے سے نکل آیا اور کوئی سب کرنے لگا۔ نیلی اس وقت خاموش تھی۔ اٹل کو یہ خاموشی بڑی عجیب اور پر اسرار معلوم ہو رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھی نیلی کا جسم کسی خوبصورت، مضبوط عمارت کے اس مینار کی طرح لگ رہا تھا جو درختوں کے اوپر سے جھانک رہا ہو۔ اٹل کے دل میں بار بار آتا تھا کہ وہ اٹل کے نیلی کو اپنی باتوں میں بکھرے اس لئے سوچا یہ جسم مر کی قربت سے نا آشنا بھی نہیں ہو سکتا۔

”کی سوچ رہے ہو؟“

اُسے لگا جیسے وہ چوری کرنا پکڑا گیا ہو۔ اس نے آنکھیں نیلی کے چہرے سے ہٹالیں اور کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا بولا۔

”کچھ نہیں۔ چلو کہیں چلیں۔“ دراصل وہ جینز اور شرٹ میں بھری بارہ دے  
ٹھگیا تھا۔

وہ باہر آگئے اور لان میں ٹہلنے لگے۔ جب وہ تین چکر لگا چکے تو نیلی نے  
رک کر کہا۔

”اٹل کرنی بات کرو۔ ورنہ میں اس ہو جاؤں گی۔“  
اٹل نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔  
”میں نے تمہیں بتایا تھا تاکہ میں ایک لڑکی کی تصویر بنا چاہتا ہوں جو شملہ  
کی پہاڑیوں میں جیل سے کچھ دُور ایک گاؤں میں رہتی ہے۔“

”NUDE!“

”نہیں بھئی۔“ وہ قہقہے جھنجھلا گیا۔

مینیل بیکسٹرک پر سے گزرتی ایک لڑکی نے نیلی کو آواز دے لی۔ وہ اٹل سے  
معافی مانگتی ہوئی ادھر چلی گئی۔ اٹل انہیں گیٹ پر کھڑے ہاتھیں کرتے دیکھتا رہا۔  
چند منٹ بعد وہ خوش خوش آگئی۔

”اٹل جانتے ہو یہ کون تھی۔ شملہ کی اسے وَلَن SKATER ہے آج

دنک میں رونق ہوگی۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔“

دنک پہنچ کر نیلی SKATES باندھ کر فلوور پر چلی گئی۔ اٹل ایک کونے  
میں بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ نیلی ایک نوجوان کا بازو تھامے رقص کر رہی تھی۔ وہ  
نہایت پھرتی اور خوبصورتی سے پہیوں پر گھوم گھوم جاتی۔ بار بار وہ نوجوان اس کی  
کمر میں ہاتھ ڈال کر خطرناک حد تک اس پر جھبک جاتا۔ وہ ایک ٹانگہ ہوا میں اچھل

کہ ایک پاؤں پر دوڑ نکاس فوجواں کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی۔ اتل نے سگریٹ  
سُنگایا اور سوچا۔ اس کے لاجو شاید باؤلی پر کپڑے دھو رہی ہوگی اور تھل کے  
احساس سے بچنے کے لیے کوئی گیت گنگن رہی ہوگی۔ اسے وہ سنانی صبح یاد  
آگئی جب وہ سوکراٹھا تھا۔ گھر کے تینوں افراد جاگ کر جا چکے تھے۔ اسے اپنے  
دیر سے جاگنے پر شرم کا احساس ہوا۔ وہ پچھلے برآمدے میں چلا گیا اور وہاں کے  
زم اجاڑے کو گاؤں پر پھیلنے دیکھنے لگا۔ جس کمرہ میں وہ سوئے تھے اس کے  
نیچے گایوں اور بکریوں کا بارہ تھا اور وہاں سے لاجو کی آواز آ رہی تھی وہ شاید  
جانوروں کو چارہ ڈالتے ہوئے انہیں ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں  
اور انداز گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب معصوم سی خواہش  
پیدا ہوئی کہ وہ چھپ کر لاجو کو ڈھور ڈنگوں سے باتیں کرتے دیکھے کہ ایسے  
میں وہ کیسی لگتی ہے۔ وہ ایک بچڑے کو رستی سے کھینچتی ہوئی باہر آگئی اصال کو  
دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر نستے کی۔ پھر اندر بھاگ گئی۔

اتل بے ساختہ ہنس دیا۔

وہ بھی ہنس دی اور جا کر پھر پڑے کہ کھینچ لائی۔

بد باورچی چار بنا دول۔ ۴۰

”نہیں لاجو، یہ پھر بھاگ جائے گا۔“ اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا تھا۔ یہ  
دیکھنے کے لیے کہ وہ اس کا کیا اثر لیتی ہے۔ لیکن وہ بچڑے سے کھینچتا ہی نہ تھی۔  
اس نے رستی ایک درخت سے باندھ دی اور ہاتھ بھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔  
”میری بڑی بہن اس طرح کھینچ کھا پنچ کر مجھے سکول بھیجا کرتی تھی۔“

”بابو جی تم نے چورہ جماعتیں پاس کی ہیں۔؟“

”سوال۔؟“

”ہمارے گاؤں میں کوئی سکول نہیں؟ پھر وہ جیسے کچھ سمجھ کر بولی۔ ”ننانے کے لیے پانی گرم کر دوں۔“

”نہیں میں نیچے کھڑ پر نہاؤں گا۔“

”بابو اور دیر بھی وہیں نہاتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”لیکن دوسرے۔ وہاں۔“

اس نے نیچے اشارہ کیا اور وہاں، ”کو قدرے لمبا کر دیا۔“ درختوں کے پیچھے۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں، کپڑے دھونے۔

”بڑا کام کرتی ہو تم۔“

”تم نہیں کرتے۔؟“

”میں بھی چلتا ہوں، سناٹے لےاؤں۔“

وہ نہانے کا سامان پتیلے میں ڈال کر باہر آگیا۔ لاجو نے گائیں اور بکریاں باہر نکال دی تھیں اور اب وہ نیچے جانے کے لیے تیار تھیں۔ اسے دیکھ کر لاجو اندر گئی اور سیٹے کپڑوں کی گھٹڑی سر پر اٹھائے آگئی۔

”چلو۔“ اس نے جانور نیچے جانے والی گھٹڑی پر ہانک دیئے تھو کے پیچھے خود اترنے لگی۔

”نہالا نہیں لگاؤ گی۔؟“

”یہاں چوری نہیں ہوتی۔ ویلوتا سب کی آتما میں رہتا ہے۔“

”اغل کو نہ جانے کیوں مجرم کا سا احساس ہوا۔ رات وہ بستر پر لیٹا دیر تک

اس کو نے کی طرف دیکھا۔ جہاں لاجو فرش پر سو رہی تھی۔ لائیں کی ہلکی سی روشنی میں لاجو کا چہرہ نیند میں اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ اقل کو اپنے اندر کسی بھوکے بھڑیٹے کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے سونے کی کوشش میں دیر تک جاگتا رہا تھا۔ لائیں بچھانے کے بعد دیر تک اس بھڑیٹے سے اندھے میں روتا رہا تھا۔

”اے اقل کہاں ہو؟“

وہ چرخا۔ نیلی پنگ پر ٹھکی مسکرا رہی تھی۔

”بھئی کمال آدمی ہو۔ جھٹ کھو جاتے ہو۔ میں شملہ کے ٹاپ SHAKER

کے ساتھ غلوں پر تھی۔ تم نے دیکھا؟ وہ بے حد ENCOURAGING ہے۔“

”ANIL! DONT YOU FEEL JEALOUS?“

”بالکل نہیں۔“

”BUT YOU SHOULD“ وہ کھل کر ہنسی، پھر بولی۔ ایک لٹکے بعد ہم

چلیں گے۔ YOU WONT MIND!۔“

اقل نے مگر ہٹ ملگایا اور سوچا۔ نیلی مردے سب کچھ چاہتی ہے۔ اس کی تمام تر توجہ ابدی لے میں وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ وہ ایک لمحہ بھی نہیں جس میں وہ یہ محسوس کر سکے کہ اُسے نیلی یہ لڑکی مکمل طور پر مل گئی ہے۔ نیلی مدد جو کہ خود غرض ہے۔ اور لاجو جہاں لڑکیوں میں سے ہے جو قربانی کو عین عبادت سمجھتی ہیں جو اپنا سب کچھ اپنی کر دینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اس میں اپنی جیت سمجھتی ہیں

ادھر بے میں کچھ نہیں چاہتیں، کچھ نہیں مانگتیں۔ اور دونوں ہی لڑکیاں ہیں اس دھرتی کی عورتیں۔

نیل اس فوجیوں کی بانہوں میں بھول رہی تھی اور وہ لاجو کو سامنے لیے بیٹھا تھا۔ لاجو جو بڑی سادگی اور معصومیت سے سنس رہی تھی اور اپنی کال بکری کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی بات کر رہی تھی جب بادل کئی دن مسلسل برستے رہے تھے۔ دیوتاؤں سے ناراض ہو گیا تھا۔ ان سے نہیں گاؤں کی ایک کنواری سے جو ایک ڈرائیڈ کے ساتھ گاؤں سے چلی گئی تھی اور اس کا منگیتر سامنے والے پہاڑ پر دیوتا کے پاس شکایت لے کر گیا تھا وہ تو واپس نہیں آیا بلکہ گاؤں میں جل بھٹل ہو گیا تھا۔

لاجو گاؤں، بکریوں کو راستے پر رہنے کی طعین کرتی چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اقل سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ اقل کو بتا رہی تھی کہ براس کے پھولوں کی چٹنی بہت لذیذ ہوتی ہے اور کہ مات کے کھانے پر وہ اس کے لیے یہ چٹنی تیار کرے گی۔ پھر اس نے اسے بتایا کہ کس طرح پچھلے سال بکری کا بچہ مرنے پر وہ کئی دن تک اداس رہی تھی۔

اس طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے وہ کھڑ پر پہنچ گئے۔ تازہ شفاف پانی پتھروں میں بہہ رہا تھا اور صبح کی ٹلکی ٹلکی دھوپ میں پتھر پتھروں کی طرح چمک رہے تھے۔ لاجو نے کپڑوں کی گھٹری ایک طرف رکھ دی اور ایک چوڑے سے پتھر پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اقل نے جو تے اتار دیے اور ننگے پاؤں پتھروں پر چلتا ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں وہ اطمینان سے نہا سکے۔



”بابو جی آگے نہ جانا، دھار ایتز ہے۔“  
 ”اتل نے پلٹ کر لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ اس بڑے اونچے پتھر پر کھڑی  
 کوئی آسمانی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ بکریاں اور گائیں اور اصرادھڑو صلوانوں پر  
 چڑھ گئی تھیں۔ دونوں طرف پہاڑیاں تھیں اور اوپر نیلا وسیع آسمان اور خاموشی۔  
 ”لاجو۔ تم روتیساں اکیل آتی ہو۔؟“

”یہ سب جو میرے ساتھ ہوتی ہیں۔“ اس نے گائیں بکریوں کی طرف  
 اشارہ کیا۔

”ڈر نہیں لگتا۔“

وہ ہنس دی۔

”تم ڈرتے ہو۔؟“

وہ بھی مسکرا دیا اور زنا غاصلے پر ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چلا گیا۔  
 اب وہ نہانے کے لیے تیار تھا۔ اپنے کپڑے ایک طرف رکھ کر وہ پانی میں  
 اتر گیا۔ لاجو اب کپڑے دھونے لگی تھی۔ وہ پانی میں چلتا ہوا لاجو کے قریب  
 پہنچ گیا۔ اور پانی میں بیٹھ کر اسے شہروں کے بارے میں بتانے لگا۔ لاجو  
 کو معلوم نہیں تھا کہ شرکیے ہوتے ہیں، وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہاں کے آدمی  
 کیسے جوتے ہیں۔ نہ اسے دیت نام کے بارے میں کچھ پتہ تھا اور نہ وہ یہ  
 جانتی تھی کہ کلکتہ اور چند ی گڑھ میں کیا ہوا ہے۔ وہ بہت سکھتی تھی۔

پھر نیلی آگئی اور مگڑی کے فرش پر لوہے کے پتوں کی آواز اور ہال کا  
 شور اور فلمی ریکارڈ۔ وہ مفلوں باہر آگئے۔ شرک پر اخبار بیچنے والے پکار

پکار کر مدد اس سرکار کے نئے حکم کا اعلان کر رہے تھے۔ وہاں ہندی بالکل ختم کر دی گئی تھی۔ گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی تھی اور بھٹی میں بھوسینا جرابی کارروائی پر اتر آئی تھی اور نیلی اسے SKATING کے مقابلوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور ان انعامات کا ذکر کر رہی تھی جو اس نے حاصل کیے تھے اور ان فلمی ایکٹروں کے بارے میں بتا رہی تھی جن کے ساتھ اس نے شملہ میں ٹور کھینچوائے تھے۔ پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

”اے تم لاجو کے بارے میں بتا رہے تھے“

”وہ بے مد معصوم تھی“

”پھر اس کا لہجہ تسخیر کرتا تھا۔“

اتنی خاموش رہا۔ وہ ایک دیرانی راستے پر نیچے اتر رہے تھے اور ان کے دونوں طرف گھٹا جھلک تھا جو رات کی طرح گہرا اور خاموش تھا۔ وہ اسے بتانے لگا کہ کیسے جنرل الیکشن کے دوران وہ اپنی پارٹی کی طرف سے کام کرنے کنڈا گھاٹ گیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات لاجو کے باپ سے ہوئی تھی۔ وہ اتنی کو اپنے گاؤں لے گیا پھر اس نے نیلی کو لاجو کے باپ بھائیوں، ماں اور گائروں، بکریوں کے بارے میں بتایا اور اس دیوتا کے بارے میں بھی جو گاؤں کی کنواریاں اور کھیتوں کی دیکھا کرتا تھا۔

”مجھے لاجو، ایک جھڑا، سیب کا ایک پیڑ لگی تھی۔“ اتنی نے دھڑکنے والی دیکھتے ہوئے کہا ”اس سے باتیں کر کے اس کے پاس بیٹھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی مندر میں آ بیٹھا ہوں۔“

”تم آرٹسٹوں سے خدا بچائے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”عزیزت تمہیں عزت ہی نہیں، اور سب کچھ معلوم ہوتی ہے۔“

”وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔“ اس نے خلوص سے کہا۔

”میں ایسی ویسی کی بات نہیں کر رہی لڑکی تھی کہ نہیں؟“ وہ مسکرائی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ ”خیر تم اس کے ساتھ سیر کرنے گئے۔“

اغل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

”لا جو تمہاری ہر بات پر کھلکھلا کر ہنستی تھی، میں نا۔“ بھٹی نے کہا۔ ”تم نے اس کی تصویریں لیں اسے پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے میں مدد دیتے ہوئے اس کا ہاتھ تقام لیا۔ اس کے جوڑے میں پھول دلائے۔ اسے سینا، نمائش اور ہوشوں کے بارے میں بتایا۔“ وہ ہنسی۔ ”دیکھو میں نے تمہیں دیکھا نہیں پھر بھی میں سب جانتی ہوں۔ میں کٹیوں سے یہ کہانیاں سن چکی ہوں۔“

”میں نے کہا نا وہ بہت بھولی بھالی اور سیدھی سی لڑکی تھی۔“

”وہ دیکھو گرگٹ۔“ وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”گرگٹ

کئی رنگ بدلتا ہے۔“

اب وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں پانی کئی شاخوں میں بٹ کر بہ رہا تھا اور آس پاس اونچے، گھنے درخت تھے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ خلی جیسے اس مقام کے چتے چتے سے واقف تھی۔ وہ اغل کا ہاتھ پکڑ کر ایک درختوں کے جھنڈ میں لے گئی، وہاں خالی اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں پڑی تھیں۔ اخبار کے کاغذ اور لٹاؤ بکھرے تھے اور قریب پانی لگنا تا بہر رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ اقل نے جیکٹ اتار دی اور سگریٹ سلگا کر لیٹ گیا۔ ٹیکسی وہاں سے آسمان نظر نہیں آ رہا تھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قید کر دیا گیا ہو۔  
 ”یہاں تو گھٹس کا سا احساس ہوتا ہے۔“

نیل نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ اقل نے کنکیدیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے لگانیلی کا لباس چڑھا کر پھٹ جائے گا۔ وہ اٹھنے لگا تو نیل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”لاجو خوبصورت تھی۔؟“

وہ چپ رہا۔

”تم نہاتے رہے اور وہ کپڑے دھو رہی تھی۔“

”ہوں۔“

”پھر تم اس کے قریب جا بیٹھے۔“

”ہاں۔؟ وہ آنکھیں موندے تھا اور نیل اس کی چھائی کو ہرے ہرے سلا رہی تھی اور اس نے اپنا سراگل کے شانے پر رکھ دیا تھا۔  
 ”اور تم باتیں کرتے رہے۔“

”ہاں۔“

”بس۔!“

وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور نیل کی طرف دیکھا۔ نیل کی آنکھیں سکرا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”تمہیں یقین نہیں آ رہا۔“

”تم آخری بات چھپا رہے ہو۔“ وہ لیٹے لیٹے بولی۔ ”میں نے بہت سی ناولیں پڑھی ہیں، غلیں دیکھی ہیں۔ تم جو چھپا رہے ہو۔ میں پہلے سے جانتی ہوں۔“ وہ ہنس دی۔ ”لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں انی لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو اس بات سے منہ پھلا لیتی ہیں، میں جانتی ہوں مرد۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ جلدی سے ٹھنڈ میں سے باہر نکل آیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ آسمان اب بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اوپر جانے والے راستے پر ہویا۔  
 (”اوقات“ لاہور)

## سیفو ۱۹۶۸

میرا شنناز سے تعارف ہوا تو میں اسے دیکھتے ہی دل بند سے بیٹھا اس کی سیدھی سی وجہ یہ تھی کہ اس میں دل لے لینے والی کوئی انوکھی ادا نہ تھی۔ نیکیں رنگ کا تو میں بھی قدر دانی ہوں مگر کالے رنگ کا نہیں۔ بحیثیت ایک دہنیہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت بڑی بڑی اور موٹی موٹی آنکھیں یا پرکشش لب زتھے جگہ ذہانت تھی یقیناً وہ بلا کی ذہین تھی۔ ذہین کیا ہیں تو اسے غیر مشروط طور پر انٹیکپول بھی ماننے کو تیار ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ لڑکی کی... ذہانت کے بارے میں میری کوئی ایسی اچھی رائے نہیں ہے۔ میں تو انہیں جذبات کی پوٹ سمجھتا ہوں اور اس لیے ان سے صرف جذباتی تسکین ہی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شنناز ذہانت میں بیٹے سے بیٹے مرد کا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن تھی عموماً فاقات اس لیے نری عموماً ہی ثابت ہوئی اور جذبات کے معاملہ میں اندھی ہو گئی انٹیکپول ہونے کے باوجود وہ میرے آپرل نہ دیکھ سکی اور نفسیات کی طالبہ ہونے کے باوجود وہ میرے ”کرداری محرکات“ کا تجزیہ نہ کر سکی۔

پہلی ملاقات میں اس نے مجھے انگڑو کے تین اندازہ نفسیاتی طرز استدلال پر پھیل اصطلاحات اور غیر مانوس ناموں سے خوب ہی مرعوب کیا۔ خیر وہ مجھے کیا مرعوب کرتی میں تو خود ہی مرعوب ہونے پر تیار بیٹھا تھا۔ وہ اس لیے کہ میں اس کی سیلی گشتی سے

تعارف کے لیے اسے وسیلہ بنانا چاہتا تھا۔ آج وہ اتفاق سے اس کے ساتھ نہ تھی ورنہ وہ دونوں تو ہمیشہ ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں بلکہ اس حد تک ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں کہ ان کی جھڑپی خصوصی شہرت حاصل کر چکی تھی۔

دوسری ملاقات لائبریری میں ہوئی۔ وہ کتا جس واپس کرنے آئی تھی لیکن چند دنوں کی تاخیر کی وجہ سے جرمانہ ادا نہ کرنے کے لیے وہ کاؤنٹر کلرک سے مدد کی بحث کر رہی تھی۔ مگر کیرا واقف تھا چنانچہ میں نے جرمانہ معاف کر دیا اس نے چار اور سوٹی سوٹی کتا ہیں ہیں اور میرے ساتھ ہی باہر آگئی۔ ہم خاموشی سے چلتے رہے وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہوگی اور بینک کی موجودگی میں آنکھوں کی عبادت کا پڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے باقی میری دلچسپیاں اور گفتگو کے محور غیر نصائی سرگرمیاں تھیں مثلاً میں ہالی وڈ کے تازہ ترین اسکیٹرز یا مشہور ایکٹریسوں کے حیاتی اعداد پر خوب رمانی سے بول سکتا ہوں۔ لیکن بغل میں چار سوٹی سوٹی کتا ہیں دو بانے والی لڑکی سے ان سوٹی سوٹی کتا بوں ایسی سوٹی سوٹی باتیں کرتا آسان کام نہیں۔

”میں گیسٹ پر ہم رک گئے۔“ اب کہ صرا“

”میں تو صدمہ ہوں“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”تو چلے جی جائے؟“

”NO HARM!“

میں نے اخلاقیات کہا ”لایئے اکتا ہیں میں اٹھارتی۔“

”نہیں نہیں!“ IT IS ALL RIGHT

میں اسے ایک اچھے دست بردار میں لے آیا۔ اس نے بڑی لاپرواہی سے میٹھر بڑھ

لوگوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور بغل میں چادروں کا جیس دیاٹے اور دوسرے بازو میں  
پرس نکلائے جھپتی گئی۔

”پائے یا کافی؟“ ویٹر کے آنے پر میں نے پوچھا۔

”COFFEE“

اب تک میں موضوع تلاش کر چکا تھا چنانچہ میں نے نفسیات کے بارے میں  
ایک سوال کر دیا۔ اور وہ شروع ہو گئی۔

اس نے کافی کے تین کپ پئے اور وہ بھی دودھ یا کریم کے بغیر!  
ہم باہر نکلے تو مجھے احساس ہوا کہ میری بجائے وہ مجھ سے مرعوب ہو چکی ہے  
کہاں ہے! میں نے نہ تو اس کے حسن کی تعریف کی (حسن تو اسی نہیں) نہ غرض  
کی کوشش (ہمت ہی نہ پڑی) اور نہ اسے پسپا ہی کیا (ذہنی طور کی خوشامد طیرا سی  
کھیر ہے) شاید وہ اس لیے ”میری“ ذہانت سے مرعوب ہو گئی ہو کہ میں نے اسے  
جی بھر کر بولنے کا موقع دیا اور خود کسی علائقی شاگرد کی طرح ”جیرت“ سے منہ کھولنے  
استانی جی کے ہلتے لبوں کو، جس پر باتوں کی ٹکیر ضرورت سے زیادہ ہی گہری تھی مسلسل  
نکل رہا تھا یقیناً اسے میری یہی ادا بھا گئی۔

”چرک نہیں گی۔“ میں نے بس اسٹاپ پر پوچھا۔

اس نے جھجک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ذہانت کا حسن تھا جس  
نے ان پکھٹی نظروں کے سامنے پناہ سکڑتے محسوس کیا۔ میں نے فراموش کیا۔

”آج کا گفتگو بہت دلچسپ۔ اید۔ اید۔ اور INSTRUCTIVE رہی۔ اس نے  
کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر میں نے اسے بولنے نہ دیا۔“ میں۔ میں بھی اس مسئلہ پر اور



مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے۔ اسی ؟

اس نے ہنس کر بات کاٹی۔ ”آپ کو پتہ ہے اگر گلشن آج ساتھ ہوتی تو اتنی بات بھی نہ ہو سکتی“ (آہ ! ذکر اُس پر ہی دھن کا !)  
 ”کیوں ؟“ میں خوش ہوا کہ خود ہی گلشن کا ذکر آگیا۔

”وہ بہت بور ہے۔ اُن سوئل !“

”Why“ اس لفظ کے ساتھ میرا تمام چہرہ سوالیہ خضہ کا نشان بن گیا۔  
 ”اب دیکھیے نا۔“ اس نے بولنے کو نہ کھولا مگر اس کی نگاہیں مجھ سے

ہٹ کر سڑک پر جا پہنچی تھیں۔ ”My Bus !“

”بس ؟“ میں نے سڑک دیکھا۔ ”کہاں ؟“

”وہ دیکھیں تو ۱۳ نمبر آرہی ہے۔“

”کہاں ؟“ بس نظر تو آرہی تھی مگر میں ہی اندھا بن رہا تھا۔

”یہ دیکھیں تو۔“

”یہ۔ یہ تو ۱۳ نمبر ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”تیرہ ؟“

”ہاں ! ہاں !! - Boy God“

”اس نے پہلی مرتبہ مجھے اور طرح کی نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے الجھ کر  
 نظریں جھکا لیں۔ اس نے بس امثال کی طرف سے پیٹھ موڑ لی۔“ اچھا تو پھر  
 ۱۳ نمبر ہی ہوگی۔“

میں مطمئن تھا ! مسرور تھا ! ! شاداب تھا ! ! !

”WHAT ARE YOU DOING“ جب میں نے اسے بانڈوں میں لیا تو وہ گجرا کر بولی

” - You Doing“

” کچھ نہیں! میں نے چہرے پر بچپن کی تمام معصومیت لاکر کہا۔

” ہائے! “ وہ جھرجھری لے کر بولی۔ ” کوئی آجائے گا۔ You -

” - Silly Boy“

” تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ سب گھروا لے باہر ہیں۔

اس کی پھولی سانسوں میں سے الفاظ جیسے لڑکے۔

”BUT THAT DOESN'T MEAN THAT YOU SHOULD START

THAT“

لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ وہ اخلافا کہہ رہی ہے۔

وہ کہہ رہی لڑ رہی تھیں۔ باہر وہ کھڑا تھا۔

” وہ تمہیں خواب کر رہا ہے۔ گلشن کہہ رہی تھی۔

” So What “

کہنے میں خاموشی ہو گئی وہ دونوں تہیوں کی طرح ایک دوسری کو آنکھیں

نکلانے گھور رہی ہوں گی۔ شہناز کی آنکھیں ٹھٹھے کی وجہ سے بینک کے اندر

اور بھی سکڑی سکڑی ہوں گی اور غالباً گلشن کی خفی سی ناک سرخ ہو رہی ہوگی

کہہ رہی ہوں!

کہہ رہی ہوں!

”اب رومنے کا کیا فائدہ؟“ شہناز کہہ رہی تھی۔

گلشن نے جواب نہ دیا۔ شہناز بھی خاموش ہے (دروٹی گلشن کو دیکھ کر شہناز کی بے زاری محسوس کی جاسکتی تھی)

”شہناز!“ بالآخر گلشن بولی۔ ”تمہیں یاد ہے ہماری دوستی کتنی پرانی

ہے“

”ہاں“ شہناز نے یقیناً گال پھلا کر کہا ہوگا

”کتنی؟“

”کئی سال“ وہ اکتا کر بولی ”بھئی اب میں کلینڈر لے کر تو بیٹھی نہیں“

”میں تمہیں بتاتی ہوں“ گلشن کے لہجے میں ماضی کے تذکرے سے کھٹک

پیدا ہو رہی تھی۔

”ہم فرسٹ ایر سے اکٹھی رہی ہیں“

”ہاں۔ ہم فرسٹ ایر سے اکٹھی رہی ہیں۔“ (وہ گویا سبق دہرا رہی تھی)

”اگر لڑکیاں ہماری دوستی سے جلتی تھیں“

”ہاں! لڑکیاں ہماری دوستی سے جلتی تھیں“ (الفاظ گریا ٹیپ ریکارڈز

پر دہرائے جا رہے تھے)

”پروفیسر ہماری دوستی کی مثال دیتی تھیں“

”ہاں! پروفیسر ہماری دوستی کی مثال دیتی تھیں“ (باز گشت! باز گشت!)

”اور۔ اور ہم۔ ہم کتنا پیار کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے“ (انبساط!)

(انبساط!)

.....

”برو شہناز! جان برو“ (کیا وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ رہی ہے؟) ”برو۔“

..... ”کیا شہناز سر جھکائے بیٹھی ہے؟“

”کتنی لڑکیوں نے ہماری دوستی خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ (فخرانہز!!)

.....“ (کیا شہناز اسے دیکھ رہی ہے؟ مگر کن نظروں سے؟)

.....“ (وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی ہیں کیا؟)

.....“ (مگر میں کیا ہو رہا ہے)

کیا ہو رہا ہے۔ مگر میں؟؟

ہو رہا ہے کیا۔ مگر میں؟؟؟

— اور باہر وہ اندر گئے پردہ کی طرح ساکت تھا!

”مجھے چھوڑ دو!“ شہناز کی گٹھی گٹھی آواز انگری۔

”اوہ!“ (دھکے سے گرنے کی کراہ؟ یا دل سے نکل آہ؟)

(سانسیں! سانسیں!!)

سانسیں —؟؟؟

گلش غٹے سے بولی ”اُس نے تمہارے دل میں نفرت بھر دی۔“

”نہیں! نہیں!!“

”پھر۔؟ پھر۔؟ یہ سب کیسے؟“

”دیکھو گلش!“ وہ ایسے بولی گویا کسی بچے کو چپکار رہی ہو ”تم نے کبھی سوچا

کہ تم کس راستے پر جا رہی ہو؟“

”نہیں! اور نہ میں سوچنا چاہتی ہوں۔ میں تو کہیں چاہتی ہوں؟“

“OH! DON'T BE ABSURD”

(خاموشی! خاموشی!!)

”تم عودت ہو۔“

”پھر؟“

”اب۔ اب میں کیسے تمہیں سمجھاؤں۔ ان گشتی“

TRY TO UNDERSTAND

”میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتی۔“ وہ بیچ کر بولی۔ ”میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔“

”ہاں!“ شہناز کے لہجے میں گریا سیسا ملا تھا۔ ”ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔“

”اور۔ اور اب ہماری چھ سال کی محبت کو ایک مرد نے۔ ایک ذلیل گتے نے ختم کر دیا۔“ (اس نے خود کو قصائی کی دوکان پر لٹکی رانوں کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھتے محسوس کیا)

“DONT ABUSE” وہ پھر کر بولی۔

وہ بھی جواب میں بھری ”DONT ABUSE“ میں تو اسے جان سے مار دوں گا۔ (اس نے مردہ غلے میں زہر سے اپنی نیلی لاش ادا خباہت میں دوکالی خیر دیکھی)

”دیکھو گلشن! شہناز نے پھر کسی ٹھنڈے مزاج والی استانی کے بچے میں کہا۔ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرے جذبات تبدیل نہیں ہوئے۔“

”تو پھر۔؟ تو پھر۔؟“

”بات دکاڑ۔ وہ چڑکربول۔ تم بہت جذباتی ہو۔ مگر میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا ہے۔ تمہاری اور میری محبت کا کیا انجام ہو سکتا ہے آخر یہ راستہ ہمیں کہاں لے جائے گا۔“

”.....“ (گلشن سوچ رہی ہے یا دوسری ہے؟)

”تم نے یہ سب کچھ سوچا بھی۔؟“

”تم جانتی ہو مجھے مردوں سے نفرت ہے، میں جب اس لحاظ سے اپنا اور مرد کا تصور کرتی ہوں تو مجھے لگس آتی ہے۔ مثل ہوتی ہے۔“

شہناز بولی۔ ”ہمارا یہ یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی۔ کسی ریکس کے پتے تو بندھو گی۔“

”میں شادی نہ کروں گی۔ وہ بیچ کر بولی۔ ”ہرگز نہیں“ وہ ہنسیاں

بھینچے جوش میں کھڑی ہو گئی)

”پگل! شادی نہ کرو گی تو کیا کرو گی؟“

”تم سے محبت!“

”DON'T BE SILLY“

”میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے تمہارا دل میری طرف سے پھیر دیا ہے۔“

”WRONG“ وہ تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔“

”ہاں!“ وہ حقارت سے بولی ”میری تعریف۔ تم تو گدھی ہو۔ وہ تو  
نچھ میں دلچسپی لیتا ہے“ (اس کا سانس رکا ہے، کان کھڑے ہیں)۔

”WHAT“ (سناسن اب تک رکا ہے)۔

”میں آج اسے لفٹ دوں تو وہ تئیں چھوڑ دے۔“

”تم حسب معمول جل رہی ہو“ (جی رکھ! شیر دی بچی!!)

”نہیں میں جل نہیں رہی۔ لیکن میں نگاہیں تو پہچان سکتی ہوں۔“

”تم نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا؟“

”بھوک۔“ (زادہ اکتا!!)

”WRONG“

”میں اسے سمجھتی ہوں۔“

”سمجھتی ہو۔“

”اندھی ہو۔“

”میں نے تو سوچا تھا کہ ہم تمام عمر اسی طرح رہیں گے تم مجھے پیار کرتی رہو گی

تم مجھے۔۔۔“

”BUT HOW؟ ہم سوسائٹی میں رہتے ہیں، ہمارے گھر والے زندہ ہیں۔“

”میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے تمہیں اندھا کر

دیا ہے۔“

”ہر سہ!“ (وہ شہناز کے لبوں کے کونوں کو تھامت سے اپراٹھتے دیکھ سکتا تھا)

”میں خود کسی میں دلچسپی نہ لوں لیکن دوسرے مجھ میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔“

”کیا بے تنگی ہانک رہی ہو۔“

”تمہیں یاد ہے تارہ پر دھیرا۔“

”THAT SILLY BRUTE“

”ہاں۔ کیسے کتابیں لے میرے پچھے پچھے پھرتا تھا۔“

”مگر تم کتاب کیا چاہتی ہو۔“

”میں تم سے زیادہ خوبصورت ہوں۔“

”SO?“

”تم سے زیادہ سیکسی بھی ہوں۔“

”SO WHAT“

”میں تمہیں پھاؤں گی۔ ہر قیمت پر۔“

دو دن بعد گلشنی مجھے علی توپولی ”آپ کہاں رہے اتنے دن۔؟“ میں خاموش

اسے دیکھتا رہا۔۔۔

”چلیے پائے پنے چلیں!“ وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

(”سیپ“ کراچی)



## رحم مادر سے نکلنا تھا عبت

اب یہ اس کی بدداشت سے باہر تھا کہ وہ مزید نصف لمحہ بھی اندر وہاں ٹھہرتا اور نہ  
 کی کیلیں جڑے نوکیلے فانتوں والی اس عبت کی لٹائی بھٹیافوں کے سے الغاء، سر جھٹکے  
 جیسے دم کوٹا نگوں میں دبائے۔ ایک کونے میں کھڑا، ہنستا ہی چلا جاتا۔ وہ اس  
 کا دغا دلاکتا نہیں تھا۔ تب پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے سر اٹھایا اور اپنی ٹانگیں  
 گریز پر سے فرج کراٹھائیں، نلاسک کو بغل میں دبا اور بے حد جھیلے بچوں کے سے انداز  
 میں اپنے پاؤں نمود نمود سے زمین پر سے دے دے مادتا ایک زناٹے میں مکر سے سے باہر  
 نکل گیا۔ لوہے کے بڑے پھانک سے ننھی کے ساتھ نکلتے ہوئے اسے ٹھوکر لگی اور ٹھوکر  
 بغل میں سے نکل کر پکی اینٹوں کی مڑک پر جا گئی۔ ایک دھماکے کے ساتھ اس کے دھنک دھنک  
 گرے اور کچیلوں کی سکھین کی کاسرٹ پر چھڑکا دیا ہو گیا۔ ایک لمبے کو وہ جھجک کر کھڑا ہوا۔  
 پھر اپنے فرجیوں کے سے مضبوط جوتوں کی ٹوک سے نلاسک کو ٹھوکر دیکر نالی میں پھینک  
 کر سر کو دونوں کندھوں پر بے مداو نچا اٹھائے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا تیز تر چلتا وہ  
 ٹھل میں سے نکل گیا تب ہی وہ تیز زادی بھی جو پاؤں نیگے اس کے پیچھے بھاگتی لوہے کے  
 گیٹ سے باہر نکل آئی تھی، تناسرٹ کو دیکھ کر ٹھک گئی۔ لگی کے آخری سرے پر کانٹوں بھری  
 دھوپ میں لہڑتا اس کا سایہ پل بھر کا سے نظر گر غائب ہو گیا۔ لال بھیبو کا رنگ لیے

لندن ہونٹوں کو داغوں سے کاٹتے، اس نے گیلی سڑک پر پھیل کر چریں اندر والی میں پڑی مٹا سک کر  
 نظر بھر کر دیکھا، پھر آہستہ سے سڑک والی اندر چلی گئی پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے جاتے  
 کے لیے اس کا دیرپا پھاٹک سے ابھرے ہوئے کیل میں پھنس گیا۔ جھٹکے کو محسوس کر کے وہ یکدم  
 دو قدم پیچھے ہٹ آئی، مگر دیرپا یہاں سے وہاں تک دو ہاتھ پھٹ چکا تھا، ایک جھٹکا دے  
 کر اس نے دوپٹے کھینچا اور اگلے چل پھٹا اور اوپر زمین پر گھسٹا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔  
 ”اچھی سازش تھی۔“ اپنی چیزیں بیٹھتے ہوئے سیدہ ذبیحہ آفتاب بڑی پچان سے سکرائی۔  
 جیسا اندر پر سکون سمجھ کر جیسے اس نے یہ بات کر رہی تھی سلسلہ، مابعد اور خیر سے نہ کسی  
 ہر خود کو کوئی بہت ہی پُر لطف واقعہ یاد دلایا ہوگا۔ آج ہر حال آخری دن ہی تھا، مگر تم  
 سبوں نے بل کر اسے ماضی آخری ہی بنا ڈالا۔ برقعہ کے ٹپ لگاتے لگاتے وہ اٹھ خنوں کی  
 طرف دیکھ کر پھر سکرائی ”چھوٹے چھوٹے پیارے اچھوٹے چھوٹے معصوم خوشیاں، مگر ہر سر شخص  
 موافقوں کی سختی مٹی خنوں پر یکدم بنا بیٹھا ہے۔ اس نے جھک کر برقعہ کا سب سے نیچا  
 ٹپ بند کیا، چنگ پر دھنوں کی تینوں گھنٹوں کے گرد ہاتھ پیٹے، ایک ہی انداز میں گھنٹوں پر  
 ٹھوڑیاں جھپٹے تصویر بنی بھی تھیں۔ لا تعلق سی، صوف تزیینتی جواپنے ہنسی سے پھر کتے  
 ہونٹوں کو داغوں میں دبائے، بڑے مسخرانہ انداز سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر میری گردن  
 پر پید کرتے ہوئے اسے آج تہدی ماں نے دیکھ لیا ہے تو اس میں اس قدر کچڑیوں والی دھو  
 دکھانے کا کیا جواز تھا، مگر مجھے کیا پروا ہے یہ؟ یہ تو اپنے اپنے اعتماد کی بات ہے، کہ کسی  
 کس کو کتنا چاہتا ہے۔ ہر کس نگ میں چاہتا ہے۔ وہ دم بھر کوڑی اور سڑھا کر ان تینوں کی  
 طرف دیکھا، ”مگر میں جیڑاں ہوئی ہوں کہ بندھنوں کی جھریوں سے اس دن تہدی مل کیوں جاسکی  
 نہیں کہہ رہی تھی۔ جس دن تم نے اس کی ٹائلیوں میں خط لکھا تھا یا جس دن تم نے بیز کے نیچے

اس کے پاؤں پر پنا پاؤں لکھ دیا تھا یا جس دلی تم نے اس کو اس کے شانے پر کاٹا تھا۔ یا۔“  
 ”پناہ بخدا۔“ سکر نے بے حد خوفزدہ ہو کر زیر لب کہا اور گھٹنوں کو ارد بھی زند سے اپنے سینے سے  
 پیچھ لیا پھر اس نے نقاب برابر کیے۔ ”اچھا دوستو خدا حافظ۔“ اس نے بڑی خوش دلی سے  
 سب کو مخاطب کیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نکلنے ہی  
 تقریباً اس قہقہے کی جس کو وہ بڑی دیر سے اپنے گلے میں پال رہی تھی، اُگل دیا۔ بلند اور تیز  
 اور طویل! اور ہر کے بڑے پھیلاؤ تک اس قہقہے نے اس کا تعاقب کیا، مگر وہ ویسے خوب آواز  
 دھیمی دھیمی قدموں سے چلتی مدھم مدھم سکراہٹ لبوں پر بیٹے، لہو بھر کر بھیڑ کے رنگ  
 کر کچھے دیکھے بغیر چپ چاپ، اُگل میں نکل آئی۔

تب ہی وہ بھی جو خدائی اور غصیلے بچوں کی طرح زمیں پر پیڑھارتا، اس کمرے میں سے نکلا تھا۔  
 اور کئی ایٹھوں کی پوری گلی پار کرنے وقت اور فاصلے کا خیال کیے بغیر سر اٹھیا اٹھائے، ننگ کی مریچ  
 میں دیکھا، آخر کو گھر جا پہنچا آخر آگست کی دم گھونٹنے والی دھپلا دھلا لکھ رہندہ عازنوں کے  
 پیچھے سیما جوا جی ایک دم اٹک سے رہ گیا۔ ایسا تھا!! ایسی خاموشی!! اور میں تنہا؟؟؟؟ اور  
 تنہا میں؟؟؟ خفت اور تنہائی اور اکیلے پی، اور اس کیلے پی میں اپنی ذات، اپنے وجود کی طرف سے  
 ایک خوفزدہ کرنے والی مدد ساتھ کا احساس!!۔ اپنے آپ کے ساتھ تنہا ہونے کا خوف اس کا  
 جی چاہا، وہ دھوپ بھرے صحن میں نکل کر خود ہی اونچے اونچے بولن شروع کر دے، چپاٹیاں  
 گیسے ٹینڈہ دھاندوں کے کواڑ کھٹکھٹائے، صحن میں گنگے نل سے بالٹیاں بھر بھر کر صحن میں پھیر کھاؤ  
 کرے، کراتر قشام کے دھوکے میں، بند کواڑوں کے پیچھے سوئی ٹری زندگانی اور چل پھل اور سر  
 صحن میں نکل آئے۔ مگر وہ صرف اپنے کمرے کے وسط میں بھفل میں فائلیس دبا کے چپ چاپ  
 کھڑا رہا۔ اپنی دھوکے کی آواز کے احساس سے خوفزدہ!! اس نے فائلیس کو کندھے سے ہیز نہ لپیٹا۔

مگر بکے سے شور کے بعد کا ستانا اس کو مادہ بھی خوفزدہ کر لگید ڈرتے ڈرتے وہ بستر کے طرف گیا چنگ  
 کی پٹی پر میٹھ بیٹھ کر پھر پھسل کر لیٹ گیا، ادا نکھیں بند کر لیں، تنہائی اور خوف اور ستانے میں اپنے  
 دھڑکنے و جھکا کا احساس اس کے غصے کو چاروں طرف سے لپیٹ چکا تھا، لگتا اس لمحہ جب اس نے  
 ٹڈتے ڈرتے آنکھیں بند کیں اس لمحہ تختانا ہوا غصہ، تنہائی اور خوف کے خلی کو چیرنا نکل آیا۔  
 ادا سے شام کا لانا و شعلہ ہو گیا، پھر گروہ بستر سے اٹھا اور پلک کر کونے کے کمرے کی پٹی تھپی کر  
 اٹھ آیا۔ پھر اس کی دھڑا زلزلے کی خاطر اس نے اپنے ہاتھوں پاؤں کے میں ناخن کاٹے، پھر  
 شیشے کے میسروریت، جس پر وہ سات دنوں کی خیر کے بعد آنکھیں دھونے اپنا بیڈ تیز کر رہا تھا،  
 پر اس نے تھپی کی جھلکوں کو تیز کر کے اپنے حرکت کرتے بازوؤں کی پھسکنی ٹھپیوں کو آئیٹھنے میں  
 دیکھتا ہوا وہ احساس سے مسکرایا، پھر پھینکے سے جسم کو چپکتی ہوئی خیال کو اتارتے ہوئے اس نے  
 سوچا کہ اس نے پتلون کا بوتھ بھی کیوں اٹھایا ہوا ہے۔ اور کھڑکی اور دروازے کے پر دے برابر  
 کونے کے بعد اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ خیال کا گولہ بنا کر چنگ کی نیچے پھینکا پتلون کو کھنٹی  
 کے ساتھ ٹانگا اور خود چنگ کی نیچے کھانچا، پھر اس کی انگوٹھوں کے کنارے فرش سے لپٹ کر  
 سگید کر پیٹ کے نیچے حق میں وہ جواک جلیں میں بوجھ بنی بیٹھ گئی، اس نے جلیں سے سونے میں ذیل  
 شام ہوئی تو اس نے ساتھ کر کر اٹھ کھڑا اور غسل خانے کی سمت چلا گیا۔ دیر تک جلیں سے وہ چپ  
 چاپ ایک کونے میں، خوفزدہ کھڑا رہا، مگر تنہائی کی دھڑ پ نظر میں جملے، وہ دیر تک کھڑا  
 رہا۔ پھر کڑے پسینے، منہ پر پانی کے دو تین چھینٹے ملے سے ادا ہر کل گیا۔ بند رہا لگھڑا گھر  
 کے سائے میں کھڑے ہو کر اس نے کچھ دیر گزشتہ زندگی کی سماجی اور دلیل میں کا نظارہ کیا۔ دائیں  
 ہاتھ کھڑے طالب علموں کی ٹوٹیوں کو شر کی لٹکیوں کے بارے میں گیارم قسم کی گفتگو کرتے سنا  
 اور پھر دائرہ کا شاہدادہ انا کی کو چلا بٹکے جاسن اور گلابی اور نیلے اور سرخ اور سفید رنگوں

میں اس نے کہنے ہی دیشی دیشی رہی خیر ہے۔ اور دھیمی دھیمی، نرم اور شرمیل مسکراہٹ لبوں پر سجائے، نیچی نگاہوں سے اس نے دو بریزیر کا سودا بھی کیا اور خریداری کا الفاظ بغل میں دبا کر وہ خاموشی سے وہاں کا تھڑا اتر گیا۔ دھیمی نرم، دھیمی شرمیل مسکراہٹ اور گیلی گیلی ناخفیس، اپنی خریداری کا الفاظ بغل میں دبائے وہ رات گری ہونے تک شہر میں گھومتا رہا، مرگ و پے میں جب اُسے زہر غم پھیر دیکھنے کی ہو، کی مگر اور کتا وہ جب گھر میں داخل ہوا تو سوائے بی بی کے سب لوگ چھت پر سونے جا چکے تھے۔ سب لوگ، جو صرف اس کا باپ تھا۔

اگلیا نامراد، خدائی خدار، زندہ کو مبین نذات کو تمام مدد اسے دیکھتے ہی دلی دلی آواز میں بیچھی، کہ دوستی تھی اور پچھت پر بڑھ چاہے کی غیند سے دست و گریباں، خاموشی نہ پائے، غضب خدا کا تم کو کر کیا ہوئے لوگ تم تو بالکل ہی کپتہ سے ہو گئے، مجال کیا جو میں باپ کا شرم لے گا، اکھ میں مدد ہو۔ ہمارے جیسے ہی تو یہ خدا ہیں نہ ہو سکے گا۔ سید سے سید سے سر شام گھر آیا کہ وہ نہ کہتی ہوں تمہارے باپ سے۔ شناتم نے ۱۱۔

”جی۔“ وہ نیچی نظروں سے مسکراتا رہا۔ ”سحاب کھا بھی، میں کیا سدی رات تیرے لیے بیٹھی ہوں گی؟“ اس کی آواز میں باب مات کی نرمی اور گرمی تھی۔ وہ چپ چاپ کھانے پر جھک گیا اور دھیمی دھیمی، ”بے دے بے لچے میں اس نے بی بی کے سامنے سوال کا جہاب دیا۔ کہہ دی بھرا اس نے کیا کیا۔ کہاں کہاں گیا، کن لوگوں سے ملا، کیا کھایا، کس نے کھلایا، کس کو کھلایا اور کیوں پر جیسے ضائع کیے۔ اور یہ سب ٹھوٹ تھا۔ اور ایک بار نوالہ بتاتے بتاتے اس نے نظر اٹھا کر سفید مد پٹے میں لپٹے ہوئے اس سانولے چہرہ کو دیکھا، جس کے چہرہ پر جیسے بھریوں کے جال میں اس کی عمر بھر کی داستان تلم تلم تھی، ماحذب ہی اس کے گلے میں کچھ موٹا موٹا سا پھندا۔ اس نے ٹھٹھنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔“ اور۔ بی بی بی بی جانے کیوں جی اتنا بھاری بھاری سا

رہنے لگا۔ جیسے میں کسی نے پتھر کی بل دکھ دی ہو جیسے ۔ اس نے پورا پنہ گئے میں چھپا ہوا ہوتا تھا  
 تھے کہ نکلنے کی کوشش کی ۔ اس کی بی تم نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا تقدیر میں نے کب کسی بات کہی ہے ضد  
 کی تھی ۔ مجھے قریب نہیں ۔ یہ کیسی جلا وطنی میں تم نے مجھے ڈالا ہے ۔ کیسے کوئی شگہ نہیں کہیں  
 کوئی اپنا نہیں ۔ فناختہ نے جھاڑیوں میں دواڑے دیئے تھے ۔ کتنے دنوں سے سنے ہوئی تھی ،  
 آج انہیں کتا پا گیا ۔ دیکھا تم نے بی بی ۔ کیسے بھی تو کوئی شگہ نہیں ۔ مدد سے بلگے میں ۔ آؤ  
 بی بی تم تو میری بنو ، تم تو میری ہو ۔ چلو آؤ اب تم اور میں یہاں سے کیسے امد میں ۔ جہاں  
 شکم کی شگہ ہوں ۔ اور فناختہ کو کوئی گڑا ٹنگ نہ کہے ، اور وہ جھاڑیوں کے نیچے ، آرام سے  
 بیٹھا اپنے دونوں اہل سے بیٹھ رہے ۔ چلو بی بی تم اور میں لہناں میں ۔ آہ میری آمد و میرا خواب ،  
 میری سوزیں ، میں وہاں بستی ہستی ، قرۂ قرۂ گھوم گھوم کر خوش کے گیت گاؤں گا۔ اداں کی  
 خوبصورت کی مدد کہوں گا ۔ سیاہ آنکھوں کو چوم کر سیاہ بالوں کی گٹھا کے سائے میں آنکھیں  
 بند کر لوں گا ۔ اور جب شام ڈھلے میں ، میلوں کی مسافتوں اور حسن اور خوبصورتی اور میں کے  
 نقشہ میں چید گھڑا کہوں گا تو تم دونوں سے پرسکاتیں ، اس اور شاننی کا نشان مجھے ہلکے روگی ۔  
 میں کہوں گا بی بی اس دنیا میں تم جویا پھر نہیں ۔ اور سب جھوٹ ہے ۔ سراسر ہے ۔ ایک  
 حقیقت تم ہر ایک حقیقت میں ۔ اور تم کی میری نفس میں ہے ۔ اور مجھے تھک کر ڈالو ۔  
 تو تم بی بی مجھے گود میں لے کر میری آنکھوں میں زندہ کا جادو پھونک دیا کہنا اور میں چپ چاپ  
 اور سکون اور طمانیت سے تنہا رہی گود میں سوتا رہوں اور تم ویسے ہی احتیاط سے اور پائنت  
 سے مجھے لیے بیٹھ رہنا جیسے تم نے فرماہ مجھے پیٹ میں رکھا ۔ اور ضیا میں کہیں کچھ نہیں سنا  
 ان فریمنوں کے ۔ آؤ بی بی ۔ آؤ تان تم اور میں لہناں میں ۔ یا انفریقہ کے گرم ساحلوں کو  
 چلیں یا ۔ یا ۔ اور بی بی گھٹنوں پر ٹھوٹی رکھے ، اس کی طرف دیکھتی رہی ، مگر آج کا خواب

اُدھو را رہا کہ اچانک ہی آج کے گزردے دن میں اپنا چلتا پھرتا وجود اس نے پھر سے دیکھ لیا تھا۔ نواز بنا کر منہ کی طرف لے جلتے ہوئے اس نے اپنی ٹھکی آنکھوں کو اٹھا کر بی بی کی طرف دیکھا تو چہرے میں جتنی لڑکیوں کی ہنستی تھی اس نے بی بی کی چٹکی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھی۔ اچانک۔ ٹائلیں بغل میں بدلتے، لوہے کے بڑے پھانک سے نکلنے، ٹوٹی فلاسک کو پاؤں کی ٹھوکر سے نالی میں گراتے اور پھر کئی اینٹوں کی گلی پر زبرد سے پاؤں مارنے، ناک کی سیدھ میں دیکھتے، وقت اور فاصلے کا احساس کیے بغیر چلتے ہوئے، اور سونے کی کیلیں بڑے نوکیلے مانتوں والی اس صورت کی تیز آواز اور کھینچے لیجے میں اونچی اونچی باتیں اور چاروں طرف گم سم چپ چاپ کھڑی چار لڑکیاں، اور گردن جھکاٹے دم کوٹا لگوں میں بدلتے مسکین اور نادار کتوں کی صورت اس کا پانچ فٹ اور گیدہ اونچ کے قدمیں کھڑا وجود کہ آج اس نے سیدہ رفیعہ آفتاب کی گدنی پر چمکتے ہوئے بلی کو رسل کے شب خوابی کے کمرے میں تھالی کے بھرے میں آکر چوم لیا تھا۔ تب، جب وہ تینوں کی تینوں لڑکیاں اچانک ہی کسی کلم سے باہر نکل گئی تھیں۔ اور اب وہی ایک لمحہ کہ جب اس تیز نوکیلے سونے کی کیلیں جڑے مانتوں والی اس چڑیل نے اسے ان چاروں لڑکیوں کے سامنے برہنہ کر دیا تھا۔ برہنہ ہو کر اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کا نواز سنا سننے پڑی سارن کی پلیٹ میں گرایا اور خاموشی سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بی بی نے جب چپ چاپ، اپنی ٹیکوں پر آئے آنسو سیٹھے اور پھر رتن۔ میرا بچہ۔ اس نے گہرا سانس بھرا، کہ جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو۔ سمجھتی ہو۔ اور وہ کہ باورچی خانے میں بی بی سے اپنی خواہشوں کے ذکر کے دوران، اس کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھ کر اٹھ آیا تھا اور وہ کچھ پاس پر خن کر دم بھر کو دک گیا۔ پلیٹ کے نیچے جتنے کی جتنے کا راجہ پھر جاگ اٹھا تھا اور دھڑکیاں





کی خریداری کا خاکی اور خالی، شور کرتا ہوا الفا ذرا اٹھاتے ہوئے اس نے جانا کہ ایک اور دن طلوع ہو چکا ہے۔ گرم، چمکتا ہوا، پیسنے کی چھپا ہٹ، صبح ہی صبح اس اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھی۔ پھر لیشی کتر فوں کے عبداللہ بریزید کے بے ربط ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے اس نے طلوع ہونے والے دن کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں!!“ ہر دن رات کی آمد میں جلتا اور شب صبح کی آہٹوں کی طرف کان لگاتا!!“ پھر اس نے وہ لفافہ بند کیا۔ بستر سے اتر، بنگ کے نیچے سے اپنا کس کھینچا، اسے کھولا، اس لفافے کو کس کی سب سے نچلی تہ میں رکھا۔ کس بند کیا، تالا لگایا۔ پھر کس کو بنگ کے نیچے دھکیلا۔ قہقہے کو میز پر رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

(”ادب لطیف“ لاہور)

# ٹھنڈی لڑکی

کار سے اتر کر وہ بھیجی۔

ہسپتال میں داخل ہونے کے لیے ابھی آسے پانچ سات سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔  
اس کی محنت جواب دینے لگی۔ لیکن پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

”آخر میں یہاں ایک نیک مقصد کے لیے آئی ہوں۔“

وہ ایک ایک میٹر چھ پوک رک کر چڑھی۔ ”دوانے کواہستہ سے دھکیلا اور اندر  
داخل ہو گئی۔ سامنے ایک بڑے ڈیسک کے پیچھے ایک نرس بیٹھی ہوئی تھی۔

”فوائے۔“ نرس نے نظروں ہی نظروں میں اس کے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے سانس درست نہ کر پائی تھی کہ نرس پھر بولی۔

”میٹر ٹی وارڈ میں داخلہ لینا ہے آپ کو؟“

”نہیں، نہیں۔“ وہ گھبراہٹ سے گئی۔ ”مجھے ایک رخصت سے ملنا ہے مگر فریڈ نام ہے۔“

”مگر وہ کون ہے؟“

”۱۰۵۔“

نرس نے سامنے رکھے ہوئے چارٹ کو دیکھا۔ ”وہ تو میری منزل ہے۔“ چارٹ دیکھ کر وہ  
بغٹ خراب ہے، آپ اس حالت میں اتنی سیڑھیاں نہ چڑھ سکیں گی۔“ نرس کے لہجے میں ایسی

ہمدردی کی جھلک تھی جو ایک محنت ہی دوسری محنت کے لیے محسوس کر سکتی ہے۔

”پھر ایسا کیجئے کہ ڈاکٹر خان کو بلا دیجئے۔ مجھے انہی نے بلایا تھا۔“

”میں انہیں فون پر بلائے دیتی ہوں۔ آپ بیٹھیے۔“

کسی پر میٹھ کر اس نے ارد گرد نظر دوڑائی اور آخر میں اس کی نظر میٹر صیوں پر جم

گئی۔ ”نہ جانے اس وقت فریڈ کی حالت کیسی ہوگی۔“ اس نے سوچا۔

”مگر۔ ڈاکٹر صاحب۔ وہ اس وقت اس حالت میں نہیں ہیں کہ اوپر آسکیں۔“

نئی فون پر ڈاکٹر کو سمجھا رہی تھی۔

شیا نے فون کے ہاتھ سے ریسپونڈ لے لیا۔ ”ڈاکٹر صاحب میں مسز جمال بول رہی ہوں۔“

”اے ہو۔ آپ ہیں مسز جمال۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر آپ کو بلا دیا۔ فریڈ

صاحب تھوڑی دیر پہلے چل بسے۔ صبح جب میں تپا آپ کو فون کیا تھا تو اس کے تھوڑی

دیر بعد بے ہوش ہو گئے تھے۔ اور پھر ہوش میں نہ آئے۔ اگر آپ انہیں دیکھنا چاہیں تو میں

انتظام کر سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں میں نہیں دیکھنا چاہتی، شکریہ! آؤں فی جلدی سے کھا اور ریسپونڈ رکھ دیا۔“

کسی سے اللہ کہ کدھ کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے دل پر ہلکا سا اوجھ محسوس کیا۔ ”یہ پورا

فریڈ اس کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ مگر اس میں میری کیا خطا ہے۔ مجھے اس نے بتلایا ہی

کیوں؟ میں اس کی کون ہوں؟ میں جو اس سے اتنی نفرت کرتی تھی۔“

ساتھ بھر وہ ان ہی خیالوں میں ڈوب رہی۔ گھر والے سوچ کر وہ لائن میں دیر تک کھڑی

رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اپنے ملازم سے کہا کہ ”بلگم صاحبہ

کھا نا کھا لیجئے، دوسرا کھائے ہیں۔“

”کھانا اٹھا کر رکھ دو مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

غلام نے تمام کرسیوں کو دھوپ میں ڈال دی۔ اور وہ اس پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا  
نہی پھر نکلنے لگا۔ ”میں اس کا منہ ہی دیکھ لیتی۔ نہ جانے اب وہ کیسا لگتا ہو گا۔ بیداری کی  
جو ہے بہت کمزور ہو گا۔ پچھلے چار سال میں کتنی تبدیلیاں ہو گئیں۔“

فریادیں۔ اسے میں اس کا ہم جماعت تھا۔ لبا تر لگا، لچیم خچیم۔ پونہ پونہ کے طلباء  
میں عام طور سے اسے بد تنزیب، بد قیتر سمجھا جاتا تھا۔ سنجیدہ اور سنب لڑکے اس سے بہت  
کرنے سے گریز کرتے۔ صوفی چند لڑکیں کا گروہ تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ جب وہ  
ان کے دھیان کھڑے ہو کر غصے لگاتا یا آواز سے کستا تو اس پاس بیٹھی جھولی لڑکیاں اپنی  
کتابیں سمیٹ کر دور جا بیٹھتیں۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کئی سال  
ہی اسے میں نفل ہونے کے بعد وہ جانے کیسے پاس ہو گیا تھا اس بات پر اسے خود بھی حیرت تھی۔  
ایم۔ اے میں داخلہ اس نے بقیہ خود تفریح اور وقت گزری کے لیے لیا تھا۔ وہ اپنے  
نئے نئے سوئٹل، بھڑکیل ٹائیوں اور دستوں میں مگن رہتا۔ اس کا باپ جاگیردار تھا جس نے  
فریاد کو ایک لمبی شینڈل دے رکھی تھی اور جو اسے ہر مہینے اتنا روپیہ بھیج دیتا تھا کہ  
اس کی احساس کے دستوں کی ہر قسم کی تفریح کے لیے کافی ہوتا۔

ثریا سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ جب وہ جماعت کے بعد اوپر لائبریری میں پڑھنے  
جاتی تو فریاد احساس کے دوست میٹر جیوں میں کھڑے ہو جاتے اور ثریا ان لوگوں سے کہتی  
بچاتی بڑی مشکل سے جاو پر جاتی۔ اس نے بہت کوشش کی، ثریا اس کی طرف متوجہ ہو کر اس نے  
فریاد کو کئی لفٹ زدہ۔ آخر تک اگر اس نے ثریا کا نام ”ٹھنڈی لڑکی“ رکھ دیا۔ اور  
چند ہی دنوں میں یہ خطاب ہر لڑکے کی زبان پر تھا۔

ثریا کو اپنا خطاب یاد آیا تو وہ بے ساختہ مسکادی۔ کیسے عجیب دن تھے وہ بھی۔ وہ خطاب شاید ٹھیک ہی تھا۔ پدچرچ وہ ایک ”ٹھنڈی لڑکی“ تھی ہمیشہ سے خاموش اور پُر سکون زندگی کی عادی۔ روحان اور عاشق کے لیے اس کی زندگی میں گنجائش ہی نہ تھی۔ امیر گھرانے کی تھی اور ساتھ ہی خوبصورت بھی۔ اس لیے بہت سی نظروں نے اس کی نظر میں جگہ ڈھونڈھنے کی کوشش کی مگر وہ ان باتوں سے بے نیاز تھی۔ اپنی کلاں کے لڑکوں سے بہت کم بات کرتی۔ لڑکیوں میں سے بھی صرف چند سے ہی اس کی دوستی تھی، مدد اس کا زیادہ وقت اپنی کتابوں میں ہی صرف ہوتا۔ ٹھنڈی اور بے جاں کتابیں ہی اس کی دوست تھیں۔ اداس نے کبھی اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی تھی کہ ان کتابوں سے باہر ایک رنگ بھری ہنستی کھیلتی دنیا آباد ہے۔

پھر وہ ایک دن خالی پیرٹ میں لان میں بیٹھی تھی کہ فرید آپنچا۔  
 ”بس تریا! میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟“

وہ خاموش رہی اور اپنی نظریں کتاب پر جمادی۔

”آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ میں آپ کے جتنے قریب آنا چاہتا ہوں آپ

مجھ سے اتنی ہی دود بھاگتی ہیں۔“ وہ تھپڑ لیکل انداز میں بولے پلا جا رہا تھا۔

ثریا کھڑی ہو گئی۔ غصے کے مارے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور لڑکیوں کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس دن کے بعد سے اسے فرید سے اور نفرت ہو گئی۔

استخان سے کوئی ہینڈ بھر پیسہ تیار نہ ہو سکا جانا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے فرید کو کبھی نہیں دیکھا۔ ثریا نے ایم۔ اے کیا تو اس کے باجی کے مصمت کے خاموش اور شرمیلے



”آج دن بھر کیا کرتی رہیں ڈارلنگ؟“ جمال نے پوچھا۔

”میں اسپتال گئی تھی۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپی تھی۔

”دیکھو؟“ وہ تقریباً بیخ پڑا۔ ”منو! میں نے تمہیں ایک مرتبہ فریڈ کے

متعلق بتایا تھا نا۔ وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا اور مجھے بڑا پریشان کرتا تھا۔ وہ آج

اسپتال میں مر گیا۔ وہ کئی عرصے سے بیمار تھا۔ زیادہ خراب پینے سے اس کے پھیپھڑے

گل گئے تھے۔ آج صبح ڈاکٹر نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہے اور مجھ سے

ملنا چاہتا ہے، میں وہاں پہنچی مگر وہ میرے جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔“

”ڈارلنگ تمہیں اس حالت میں وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔“

”وہ مجھ کو ہاتھ سے لے کر آیا تھا۔“ شریا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ابا! میں! تمہیں اس بچے کا خیال کرنا چاہیئے تھا جو چند ہی روز میں اپنے والد

ہے۔“ جمال پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”آخر مرنے والوں کا بھی خیال ہونا چاہیئے۔“

”اور تم تو اس سے نفرت کرتی تھیں۔“

”ہاں! شاید اب بھی کرتی ہوں۔ مگر یہ تو دیکھو کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔“

شریہ نے کہا اور جمال کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(”سروج“ وہی)

# مطبوعات میری لائبریری

## \* نفسیات

۱۰۰۰۰	جینے کی اہمیت
۵۰۵۰	میٹھے بول میں جادو ہے
۵۰۵۰	پریشان ہوا چھوڑا نہیں
۳۰۰۰	گفتگو اور تقریر کا فن
۳۰۰۰	مائیں تہ ماہیں
۳۰۰۰	جنس کا نفسیاتی پہلو
۳۰۰۰	جنس کا جسمانی پہلو
۲۰۰۰	زندگی کے موڑ پر
۲۰۰۰	شادی اور کامیابی
۲۰۰۰	روزمرہ نفسیات
۲۰۰۰	نفسیات اور عمل
۲۰۰۰	زندگی اور عمل
۲۰۰۰	نفسیات کی روشنی
۲۰۰۰	ترقی کی راہیں
۱۰۲۰	ہماری عادتیں، ہمارے جذبات
۲۰۰۰	دولت نامہ
۱۰۰۰	بچے اور لائق تعلیم و تربیت

## \* تاریخ و سوانح

۷۰۰۰	ابو بکر صدیق اکبر رض
۱۲۰۰۰	عمر، فاروق اعظم رض
۵۰۰۰	دس بڑے مسلمان
۲۰۰۰	خالد، سیف اللہ رض
۲۰۲۰	الہ ارہون
۲۰۰۰	ابوذر غفاری رض
۱۰۰۰	سلطان محمد الفتح رض
۲۰۰۰	الحسین رض
۱۰۰۰	رابعہ بصریہ رض
۱۰۰۰	امیر معاویہ رض
۱۰۰۰	عمر بن عبدالعزیز رض
۱۰۰۰	امام زین العابدین رض
۱۰۰۰	شیخ عبدالقادر جیلانی رض
۱۰۰۰	ایک مفسر قرآن
۱۰۲۰	الزہرا رض
۳۰۰۰	تذکرہ
۳۰۰۰	قلو بطورہ
۳۰۰۰	روپ منی
۲۰۰۰	سلطان محمد اور ک

## تنقید، ادب، ناول، لاول، السالو

۱۰۰۰۰	بہترین انشائی ادب
۲۰۰۰	ادب کا تنقیدی مطالعہ
۱۰۰۰	ادب اور تعصب
۱۰۰۰	ولیم فاکنر
۱۰۰۰	اوتسٹ ہیٹکوکے
۱۰۰۰	مارک ٹوین
۱۰۰۰	والٹ وٹھمن
۳۰۰۰	تنقیدی مضامین
۳۰۰۰	مخبر خاطر
۱۰۰۰۰	دیوان غالب (فارسی)
۰۰۰۰	انتخاب غالب
۳۰۰۰	پنجابی ادب کی تاریخ
۲۰۲۰	دیوان ولی
۳۰۰۰	دیوان مصحفی
۱۰۰۰	دیوان آتش
۳۰۰۰	دیوان جرات
۱۰۰۰	ولی، تنقیدی مطالعہ
۳۰۰۰	منازع ادب
۳۰۰۰	ناول نگاری
۳۰۰۰	میرزا ادیب، بہترین افسانے
۳۰۰۰	احمد ندیم، بہترین افسانے
۲۰۲۰	زاد راہ معہ تنقیدی مقدمہ
۲۰۰۰	فانسلے
۵۰۰۰	میرے بھی صنم خائے
۳۰۰۰	پتھر کا دیس
۱۰۰۰	سہرے کے پھول
۳۰۰۰	آہٹیں
۳۰۰۰	منزل منزل دل بھٹکے کا
۳۰۰۰	ادب، کھانا امرود
۳۰۰۰	حویف آدم
۱۰۰۰	دغا باز (گراہہ)
۱۰۰۰	لفنگی کی ڈائری
۲۰۰۰	63 کے منتخب افسانے
۳۰۰۰	64 کے منتخب افسانے
۳۰۰۰	65 کے منتخب افسانے
۵۰۰۰	میدان عمل معہ تنقیدی مقدمہ
۵۰۰۰	تنگی دھری
۳۰۰۰	لحون کے بھنور
۵۰۰۰	کرن کرن الدھیرا
۳۰۰۰	افق ہے افق تک
۳۰۰۰	ڈوب ڈوب کر ابھری ناز
۲۰۰۰	جیاب
۲۰۰۰	انسان





☆ ناصر زیدی (مرتب)

۸ اپریل ۱۹۳۳ء کو مظفر نگر (پو۔ پی) کے ایک سید خانوادے میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں ہلے، بڑھے، بڑھے اور جوان ہوئے۔ اسے شہر ”زندہ دلاں“ میں شاعری اور ادب و صحافت کا چسکا پڑا متعدد رسالوں کے مدیر رہ چکے ہیں۔

گزشتہ تین برس سے ماہنامہ ”ادب لطیف“ لاہور کے اردو کے انسانی ادب کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے پہلے ”۱۹۹۷ء کے منتخب افسانے“ مرتب کر چکے۔ غزل کے شاعر ہیں اور بقول ذکا الرحمان: —  
”طبیعت میں بھی غزل کا گداز اور نزاکت ہے“  
غزلوں کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

## غالب کی صد سالہ برسی پر میری لائبریری کے تحفے

- \* دیوان غالب، ارادو، مروج متن مع انتخاب حسرت موہانی  
عرشی رام پوری کے اعراب و تلفظ کے مطابق
- انسٹ طباعت میری لائبریری: 2.25 جلد 5.00
- \* انتخاب غالب، عکسی طباعت مع خود نوشت حالات و مواقع 0.50
- \* مفہوم غالب، غالب کے کلام کی شرح، الفاظ و اشارات  
غالب کے مطابق۔ از صاحبزادہ احسن علی خان
- میری لائبریری میں: 9.00 سفید کاغذ جلد: 15.00
- \* کلیات غالب (فارسی غزل) سید وزیر الحسن عابدی کی  
تاریخی تدوین، تعلیقات و تحقیقات۔ میری لائبریری 10.00
- جلد 20.00

مکتبہ میری لائبریری، لاہور-۲